



# من کے دریچے

عابدہ سلیم

# من کے درپے

عابدہ سبین

نوٹ:-

اس ناول کے جملہ حقوق بنام علم و عرفان پبلشرز، لاہور محفوظ ہیں۔ لہذا اس تحریر کی کسی بھی رسالے، ڈائجسٹ، میگزین، ویب سائٹ، سیل فون ایپ یا انٹرنیٹ پر کسی بھی شکل میں کاپی کرنا خلاف قانون ہے۔ خلاف ورزی کرنے والے کو قانونی کارروائی کا سامنا اور بھاری جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔

## جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

کتاب کا نام	:	من کے در پیچے
مصنف	:	عابدہ بین
ناشر	:	علم و عرفان پبلشرز
مطبع	:	روشن پرنٹر، لاہور
کمپوزنگ	:	دلدار حسین
سن اشاعت	:	فروری 2017ء
تعداد	:	500
قیمت	:	500/- روپے

..... ملنے کے چے .....

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اردو بازار، لاہور

کتاب گھر

اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی

جناح سپر مارکیٹ F-7 مرکز، اسلام آباد

ویکم بک پورٹ، اردو بازار، کراچی

رشید نیوز ایجنسی، اخبار مارکیٹ، اردو بازار، کراچی

فریڈ پبلشرز، اردو بازار، کراچی

اشرف بک ایجنسی

اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی

خزینہ علم و ادب، انکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

بیکن بکس، گلگشت کالونی، ملتان

کشمیر بک ڈپو، تلہ گنگ روڈ، چکوال

ادارہ کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو ازراہ کرم مطلع فرمادیں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائیگا۔ (ناشر)

انتساب!

(میرے پیارے ابو جان کے نام  
جن سے میں نے ایثار و قربانی کا درس سیکھا)

دعا ہے رب العزت سے کہ ان کے درجات بلند فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ  
مقام عطا کرے۔ (آمین!)



## پیش لفظ

آنکھ سے خواب تک بیچ سے کلی اور خار سے گلاب تک من کے در پہچے میں بھی رنگ نظر آئیں گے۔ یہ احساس جذبوں کی کہانی ہے۔ جس کا ہر کردار خاموش اور اُداس آنکھوں سے زندگی کے تجربے، مشاہدے اور تمنائیاں اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اور جب شکر فی لبوں پر مسکراہٹ بکھیرتے ہیں تو یہ روتے تڑپتے کردار قوس قزح کے رنگوں کی طرح خوشیاں بانٹنے لگتے ہیں۔

بہت کم عمری میں ہی میرا ذہن کہانیاں بناتا تھا اور کردار میرے گرد پھول پتلی کی طرح منڈلانے لگتے تھے تو قلم صفحہ قرطاس پر لفظ اپنا رنگ جماتے چلے جاتے۔ اور من کے در پہچے میں ہر طرف بہار کا موسم رقص کرتا نظر آتا ہے۔ پھول رنگ خوش جگنو ہمارا زہیلیوں کی طرح ہاتھ پکڑ کر پھولوں کی روش پر چل پڑتے ہیں۔

”من کے در پہچے“ میری پہلی کتاب ہے۔ اس میں میرے چار مکمل ناولز شامل ہیں۔

1- محبت رُوٹھ جائے تو

2- تمہاری یاد کے جگنو

3- تیری خوشبو نہیں ملتی

4- اور من کے در پہچے

جو آئینہ دو شیزہ اور ردا ڈائجسٹ میں شائع ہوئے اور بہت پسند کیے گئے۔ مجھے یقین ہے کہ میری یہ پہلی کتاب آپ لوگوں کو بہت پسند آئے گی اور آپ اسے شرف قبولیت بخشیں گے۔

والسلام  
محبتوں کے ساتھ

عابدہ سلیم

## ”خوشبو“

عابدہ سبین اور میرے درمیان محض فنی تعلق ہی نہیں ہے بلکہ وہ میری بہت عزیز دوست بھی ہے۔ ہماری یہ مختصر عرصے کی دوستی سالوں پر محیط لگتی ہے۔

عابدہ سبین سے اس دوستی کی وجہ اس کی شخصیت کی سادگی، سچائی اور کھرا پن ہے۔ عابدہ سبین کی اسی خوبی نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا۔ وہ ہر غرض سے بالاتر ہو کر صرف انسان سے محبت کرنے والی لڑکی ہے۔ وہ زندگی کی کڑی آزمائشوں کو خندہ پیشانی سے سہہ جانے والی باہمت لڑکی ہے، جو کبھی بھی اپنے لبوں پر شکوہ نہیں آنے دیتی اور بہت ہی عمدگی اور خوبصورتی کے ساتھ زندگی سے نباہ کر رہی ہے۔ اپنے گھر اور بچوں کو اس سے متاثر نہیں ہونے دیتی۔ اس کی تحریروں میں زندگی کی ساری رنگینیاں نظر آتی ہیں۔ کہانیوں میں تخیل کے ساتھ زندگی کا گہرا تلخ سچ بھی ہے۔ وہ عورت ہونے کے ناطے عورت کے دکھ کو خوب سمجھتی ہے۔ اس کے نسوانی کردار بہت پُر عزم اور مضبوط نظر آتے ہیں۔

وہ اپنی تحریروں کی پختگی، روانی اور تسلسل کے ساتھ خود کو منوانے کی جدوجہد میں کامیاب نظر آتی ہے۔ عابدہ سبین کا اپنا ایک اسلوب ہے۔ وہ اپنی کہانیوں / تحریروں میں بے ساختگی، دلکشی اور شائستگی استعمال کرتی ہے۔ اس کی تحریروں میں دریا جیسی روانی ہے، بہاؤ ہے۔ وہ ہر کردار کو واضح طور پر سامنے لاتی ہے۔ کرداروں پر اس کا یہ فطری پن قاری کو اپنے حصار میں قید کر لیتا ہے۔ یہ خوبی اسے دوسری مصنفین سے منفرد کرتی ہے۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ کسی بھی مصنف کی یہ خوبی اور کامیابی ہے کہ قاری خود کو کرداروں کے ساتھ محسوس کرے۔

غزالہ جلیل راؤ

## محبت رُوٹھ جائے تو...

سورج کی تیز کرن چہرے سے ٹکرائی تو اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ درید عباس حسب معمول ونڈو سے پردہ ہٹا کر گیا تھا تا کہ سورج کی تیز شعائیں جیسے ہی ونڈو سے اندر داخل ہوں تو وہ فوراً ہی جاگ جائے۔ یہ واحد طریقہ تھا اس کو جگانے کا..... کسمندی سے اس نے خود پر سے کھل ہٹایا تھا اور ذہنی طور پر خود کو بستر چھوڑنے کے لیے تیار کیا۔ بمشکل نیند چھوڑ کر انگڑائیاں لیتا وہ کھڑکی تک آیا تھا۔

روشن صبح مسکرا کر اسے ویلکم کہہ رہی تھی۔ مگر سویرے ہی دھوپ کی شدت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ آج سورج کا موڈ صبح سے ہی خاصا خراب ہے۔ مگر اس کے باوجود سڑک پر ہر طرف گہما گہمی تھی۔ معمول کی زندگی روز کی طرح شروع ہو چکی تھی۔ کھڑکی کے پردے برابر کرتا وہ واش روم میں گھس گیا۔

باتھ لے کر اس کی ساری سستی ہوا ہو گئی تھی اور وہ بہت فریش موڈ میں کمرے سے باہر نکلا۔ مگر یہاں صرف سناٹا تھا۔ ویران پڑا ڈائننگ ٹیبل اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

تقریباً گھنٹہ پہلے یہاں کس قدر دھماچو کڑی مچی ہوگی، یہ سوچ کر خود بخود دھیمی سی مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔ گھر میں جب وہ سارے ہوں تو زندگی کتنی خوشگوار لگتی ہے۔ عبدال اور نہال ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ، بلال کا انہیں سمجھانا اور کبھی سخت جھنجھلا کر انہیں پیننا۔ درید عباس کی ناشتے کے لیے بھاگ دوڑ، اور ٹیبل سجا کر اپنے مخصوص اسٹائل میں سب کو بریک فاسٹ کے لیے بلانا..... وہ چاروں صبح میں جلدی میں ہوتے تھے۔ نہال اور طلال کو کالج کی اور درید کو اپنی جاب کی، بس وہ کاہلی مارا تھا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا آفس لیٹ ہی تھا۔ لیکن اگر وہ کبھی بکھار جلدی جاگ جاتا (غلطی سے) یا فجر کے بعد سوتا ہی نہیں تھا تو ان چاروں کی نظریں ہی اسے گاڑ دیتیں۔ حیرت سے مربعوں میں پھیلی آنکھیں دیکھ کر وہ خود پر ہزار بار لعنت بھیجتا کہ وہ جلدی اٹھ کر آیا ہی کیوں تھا۔ ناشتے کے نام پر چائے کی طلب نے اسے کچن کی طرف رخ کرنے پر مجبور کیا تھا مگر پہلا قدم کچن میں رکھتے ہی اس کا دل گھبرانے لگا۔

”اُف تو یہ آج درید پر کون سا جنون سوار تھا۔“

کچن کی ابتر حالت دیکھ کر اس کی نفاست پسند طبیعت بو جھل ہونے لگی۔ برتن یوں سارے کچن میں پھیلے ہوئے تھے گویا ان میں جنگ عظیم ہوئی ہو۔ چائے بنانے والا ساس پین چولہے پر یونہی کھلا پڑا تھا۔ مکھیوں کو خوب عیاشی کا موقع ملا تھا۔ یا انہیں یہ گولڈن چانس خود

فراہم کیا گیا تھا۔ جو بھی ہو مگر اس کے لیے وہاں رکنا ناممکن ہو گیا تو وہ لاؤنج میں آ کر دیکھنے لگا پھر کچھ دیر بعد اماں بی آ گئیں (کام والی ماسی) تو اسے چائے پینے کی کچھ امید نظر آئی تھی۔

”السلام وعلیکم اماں بی۔“

ان کی عمر کے باعث وہ سب انہیں احترام سے پکارتے تھے۔

”وعلیکم السلام پتر۔“

انہوں نے خوش دلی سے جواب دیا پھر بغور اس کا جائزہ لیا۔

”کی گل..... تھکا تھکا لگ رہا ہے۔“

”نہیں بس آج صبح کی چائے نہیں پی۔“

”میں بناداں پتر۔“

”اماں بی چائے تو میں بنالوں گا مگر پلیز آپ کچن سمیٹ دیں۔“

”اچھا..... فیئر چائے بناداں۔“

”ہوں۔“

اس نے مختصر سا جواب دیا۔ ایک تو وہ کم گو تھا دوسرا اماں بی بولنے کی شوقین تھیں۔ اماں بی نے اس کی توجہ اخبار پر دیکھی تو وہاں سے ہٹ گئیں۔

”ہو گئی تیری سویر۔“

درید عباس کی آواز پر وہ بے طرح چونکا۔ اخبار چھوڑ کر اسے دیکھا جو قطعی رف حلیے میں اس کے سامنے سنگل صوفے پر آ کر گرما گیا تھا۔

”تو گھر پر ہے۔“

اس کی آواز میں تازگی نہ تھی نہ چہرے پر روز والا فریش لگ۔ بکھرے الجھے بے ترتیب سیاہ گھنے بال، ہلکا ہلکا سرخ ہوتا چہرہ، آنکھوں میں سرخی ہی جھلک رہی تھی۔ سیلوولیس ٹی شرٹ اور ٹراؤزر میں وہ بالکل ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔

”آریو اوکے۔“

”ہاں بس رات سے ٹمپر پچر ہے۔ صبح بچا رہے بلال کو بھی اکیلے ہی سب ہینڈل کرنا پڑا ہوگا۔ اسے اپنے بخار سے زیادہ فکر بلال کے ڈبل مشقت کی تھی اور بنا کسی رشتے کے وہ ایک محبت ہی تو اسے اثریکٹ کرتی تھی..... بنا کسی تعلق کسی رشتے کے وہ ایک دوسرے سے اتنی محبت کرتے تھے اتنا خیال رکھتے تھے۔ اب تو وہ بھی ان میں شامل ہونے لگا تھا۔“

”میڈیسن لی تو نے۔“

”رات لایا تو تھا، مگر ابھی تک خاص اثر نہ ہوا۔“

”میں اماں بی سے تمہارے لیے ناشتے کا کہہ آؤں۔“

وہ اٹھ کر کچن میں گیا اور انہیں ناشتے کا کہہ کر آیا تو درید کے نقاہت بھرے چہرے پر نظر ڈالی تھی۔

”درید عباس موسم چھینچ ہو رہا ہے۔ اس میں لا پرواہی یوں ہی مہنگی پڑتی ہے۔“

مانا کہ سردی نہیں رہی مگر گرمی بھی نہیں آئی کہ تم کپڑوں سے باہر ہو جاؤ۔“ اس نے درید کی ڈریسنگ پر تنقید کی۔ درید مسکرایا۔

”بخار کی حد اتنی زیادہ ہے کہ مجھے گرمی محسوس ہو رہی ہے۔“

”ہونے دو۔“ تم بریک فاسٹ کے بعد میڈیسن لو اور حلیہ درست کرو اپنا۔ درید اسکی نفاست پسند نیچر سے واقف تھا۔

”تیرے آنے سے کنوار پن کا احساس کم ہو گیا ہے۔“

بخار کے باوجود وہ باز نہ آیا اس پر حملہ کرنے سے، جواباً اس نے گھورا تھا۔

”شٹ آپ.....“

اس نے آنکھیں دکھائیں تو دل تھام کر تڑپنے کی بھرپور یکٹنگ کرنے لگا۔

”جان من کیوں قتل کرنے کی ٹھانی ہے، ہم تو ایسے ہی مرٹے ہیں ان سنہری کانچ سی آنکھوں پر۔“

اس نے دہائی دی تھی مگر وہ جانے کیوں لب بھینچ گیا۔ ”سنہری کانچ سی آنکھیں۔“ یہ بات اس کے کتنے ہی زخم ہرے کر گیا۔



فلک تک چل ساتھ میرے

فلک تک چل ساتھ چل

یہ بادل کی چادر، یہ تاروں کے آنچل میں

چھپ جائیں ہم پل دو پل.....!!

فلک تک.....

”او کے یار..... چل جہاں لے جانا ہے لے چل ورنہ تو یونہی میرا سر کھائے گا۔“

نہال اٹھ کر پاؤں میں یوں چپل ڈالنے لگا جیسے واقعی طلال اس سے مخاطب ہو۔

”پر پہلے یہ تو بتا فلک کون ہے؟ تیری کوئی نئی غلط فرینڈ!! تو نہیں۔“

سارے جہاں کی معصومیت اپنے چہرے پر سجائے وہ طلال کے فیورٹ ساٹنگ اور اس کے اچھے موڈ کا بیڑا غرق کر چکا تھا۔ جبکہ



لیپ ٹاپ پر انگلیاں چلاتے درید نے بمشکل اپنے انڈے والے تھقبے کو روکا تھا۔ بلال تو ناکام ہو کر منہ پھاڑ بیٹھا تھا۔

”واہ اب کیسے دانت دکھا رہے ہیں۔ جیسے کولکٹ والوں نے آپ کو پیسے دے کر فرمائش کی ہو۔ اور اگر میں اسے کچھ کہہ دیتا تو آپ اپنا برسوں پرانا نو نمبر کا جوتالے کر میرے پیچھے پڑ جاتے۔“

طلال نے بنالحاظ رکھے لگی لپٹی رکھے بنا بلال کو پکڑا تھا۔

”یار وہ نا سمجھ ہے، چھوٹا ہے تجھ سے۔“

”نا سمجھ صرف آپ کی نظر میں ہے یہ، میرا تو یہ دشمن بن بیٹھا ہے۔ مجال ہے جو کسی بھی لڑکی کو میری طرف متوجہ ہونے دے۔“

”معصوم اور پیارا جو وہ اتنا ہے۔“

”جانے کیوں جھوٹ بولنے والوں پر اللہ کا عذاب اسی وقت نازل نہیں ہوتا۔“ تلال تڑپ کر بولا تھا۔

”پیارا دیا را نہیں ہے یہ، لڑکیاں دیکھ کر اکٹھے کمار کی طرح چھچھور پن پر اتر جاتا ہے۔“

”اور تو جیسے بہن جی بنا کر انہیں گھمانے لے جاتا ہے۔“

اس بار نہال نے خود جواب دیا تھا۔

”تو میرے منہ نہ لگ۔“

طلال نے اسے دھمکی دی۔

”میرا مرنے کا کوئی ارادہ ایسا ہے بھی نہیں کہ تیرے منہ لگوں، جس پر دنیا کا ہر ماؤ تھ دوش ناکام ہو چکا ہے۔“

نہال نے دو انگلیوں سے اپنی ناک دبا کر یوں منہ بنایا گویا ابھی مرے گا۔ بس یہاں تلال کی برداشت بھی جواب دے گئی اور

اس نے لمحے کے ہزار دیں حصے میں اٹھ کر نہال کی ”منڈی“ دبوچ لی اور اسے اچھی طرح دھو ہی ڈالا تھا۔ بلال اور درید اس اچانک حملے پر پہلے ہراساں ہوئے پھر بیچ بچاؤ کرانے لگے۔

”قسم اللہ پاک کی میں روز کے ان جھگڑوں سے ننگ آ گیا ہوں۔“

انہیں بمشکل چھڑا کر بلال نے پھولی سانسوں سے دل تھام کر کہا۔

”اگر آپ انصاف سے کام لیں ہم دونوں میں یہ نو بہت ہی ند آئے مگر آپ نے ہمیشہ اسے بے جا سپورٹ کیا ہے۔“

صوفی نے پر بیٹھا تلال مڑے ہوئے مرنے کی طرح ناک پھلائے بولا تھا جبکہ نہال کو درید کمرے میں پھینک آیا تھا۔

”مجھے تجھ سے دشمنی جو ہے۔“

بلال نے کھا جانے والے انداز میں کہا۔

محض ایک سال چھوٹا ہے وہ مجھ سے، مگر آپ یوں ہی بیہو کرتے ہیں گویا وہ مجھ سے صدیوں چھوٹا ہو۔ ”کا کا“ بنا کے رکھا ہوا ہے۔“

طلال آج سارا حساب کلیئر کرنے کے موڈ میں تھا۔

”طلال بس کر دے یار۔ اس نے صرف مذاق ہی تو کیا تھا ناں۔“ اور تم نے اس کی ٹکڑی بھی دل لگا کر کر دی، پھر بھی تیرا کلیجہ ٹھنڈا نہیں ہا۔“ اب بے وجہ ہی بڑے بھائی سے الجھ رہا ہے۔ چل دفع ہو، جا کر انجوائے کر اپنا میوزک، درید نے اس کے بکھرے جنگلی چوہے کی طرح کھڑے بال درست کیے تھے۔ تلال پیر پٹختا جھلاتا باہر چلا گیا۔

”اب تم بھی اٹھ کر اپنے دھندے لگو۔ کیا آٹھ بچوں کی ماں کی طرح دونوں ہاتھوں سے سرتھامے بیٹھا ہے۔“

درید کی مثالیں ہمیشہ ہی زالی ہوتی تھیں۔ بلال سارا ذہنی دباؤ بھول کر اسے گھورنے لگا۔

”مجھے نہیں لگتا کہ میرے نصیب میں اپنا ایک بچہ بھی ہوگا۔ دونوں مجھے کنوارہ ہی مار کر دم لیں گے۔“

”تو مجھ پر کا ہے گھوریاں مار رہا ہے، سارا قصور تمہارے ابا جی کی رومانٹک نیچر کا ہے۔“

درید کی بے غیرتی پر بلال اچھل پڑا تھا اور لاؤنج میں انٹر ہوتا اسفند چاہ کر بھی اپنی مسکراہٹ نہ روک پایا تھا۔

”کینے، بے غیرت، بے شرم۔“

بلال نے صوفے پر دھرے سارے کٹن ایک ایک کر کے اسے مارے تھے مگر وہ بھی ڈھیٹ تھا۔ دانت نکالتا رہا۔ بلال مار کر دل

ہلکا کر کے صوفے پر لیٹ گیا اور انگلیوں سے کپٹی کو دبانے لگا۔

”بائی دی وے بلال میرے ذہن میں ایک انٹر سٹنگ خیال آیا ہے، اگر کہے تو تجھ سے شیئر کروں۔“

تیرے گھٹیا ذہن میں صرف بے ہودہ خیال آسکتے ہیں دفع کرو۔“

”درید بھیا بتائیں تو۔“

نہال کمرے سے نکل کر پھر سے وہیں آ بیٹھا تھا۔“

”اچھا اب تو اتنا کہہ رہا ہے تو خیال یہ تھا کہ اگر تمہارا ایک اور بھائی ہوتا تو اس کا نام کیا ہوتا۔ جمال، بلال، تلال، نہال کے بعد

ایسا کوئی ہم قافیہ نام بچتا ہے۔“

”آپ کے ذہن میں ہے!“

”ہے تو!!“

بمشکل لب سے مسکراہٹ روک رکھی تھی اسفند نے سر ہلایا کہ باز آ جاؤ۔

”کیا.....؟“

صرف نہال نہیں بلکہ انجان بنے بلال کا ذہن بھی ادھر ہی تھا۔

”وہال احمد.....“

اسفند اس بار اپنی ہنسی روک نہ سکا تھا جبکہ بلال خطرناک تیور لیے اٹھنے کو تیار تھا۔  
 ”شکر کرو تمہارے اباجی کا موڈ بدل گیا ورنہ.....“

درید کو بات مکمل کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ بلال نے آکر اس پر جو چڑھائی کی کہ اسفند بھی دنگ رہ گیا۔  
 اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ بنے یا بلال سے درید کو بچائے۔



آف سے گھر لوٹا تو شدید سناٹے نے استقبال کیا تھا اس کا۔ پہلے وہ قدرے فکر مند ہوا مگر لاؤنج میں بیٹھ کر ذہن کو ریلیکس کیا تو یاد آیا کہ آج فرائی ڈے ہے، اور ظاہر ہے وہ تینوں بھائی ویک اینڈ گزارنے گاؤں چلے گئے ہوں گے۔ مگر درید..... وہ لگتا ہے آج اب تک نہیں لوٹا۔ اسفند نے خود ہی اندازہ لگایا تھا مگر گھبرا کڈ تو نہیں تھا!! اس کا مطلب درید گھر پر ہے۔ وہ اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔ فریش ہو کر فریق چیک کیا، سوائے جوس کے اور کوئی قابل قبول چیز نہیں لگی۔ اس نے جگ نکالا اور دو گلاس اٹھا کر چھت پر آ گیا، کیونکہ اسے یقین تھا کہ درید وہیں ہوگا۔  
 ”گڈ ایوننگ۔“

وہ درید کے ساتھ والی چیئر سنبھال کر بیٹھا تھا۔ گلاس اور جگ ساتھ رکھے ہوئے چھوٹے سے ٹیبل پر رکھ دیے۔ خلاف معمول درید بہت چپ تھا۔  
 ”اینی پرابلم۔“  
 ”ہوں۔“

وہ پہلے چونکا پھر نفی میں سر ہلادیا۔ اسفند سمجھ گیا کہ آج پھر اس پر اداسی کا دورہ پڑا ہے۔ ریزرو تو نہیں رہتا تھا، ہاں کبھی اداسی کا دورہ پڑتا تھا۔

”لے جوس پی لے۔“

گلاس بھر کے اس کے سامنے کیا، اس نے خاموشی سے تھام لیا۔  
 ”امی کا فون آیا تھا۔“

اکثر یہ خاموشی اسی دن ہوتی تھی جب اس کے گھر سے فون آتا تھا۔ درید نے محض سر ہلایا تھا۔  
 بات تو عجیب تھی مگر سچ کہ درید عباس کے من میں محبت کا دکھ بہت گہرا تھا مگر اس نے اسفند کی طرح اپنی ذات گم نہیں کی تھی۔  
 بھرپور طریقے سے جیتا تھا، لیکن کبھی دکھ شدت اختیار کر لیتا تو.....  
 اس کے دکھ کو اسفند ضیاء نے دل کی تمام شدتوں سے محسوس کیا تھا۔ تبھی اس کا کندھا تھپک کر وہاں سے ہٹ گیا تھا۔



وہ تمام کیفیات سب سے چھپا کر رکھتا تھا۔ یا شاید اس نے اپنا درد اکیلے سہنا سیکھ لیا تھا۔ اگلے دن درید کا موڈ ٹھیک ہو گیا مگر وہ بہت زیادہ چپ تھا۔ رات بھر وہ کس قدر بے چین رہتا تھا اور یہ واقف تھا۔ اس نے آج تک ایسی کوئی رات نہیں دیکھی تھی کہ جس میں اسفند نے سکون پایا ہو۔

ہاں فجر کی نماز کے بعد کچھ دیر وہ سوتا تھا اور اس پر درید ٹوک دیتا تھا کہ ”یہ نحوست نہ پھیلا یا کر۔“ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اسفند کے اندر کیا ہے مگر دکھ یہ تو طے تھا کہ کوئی ایسا زخم ہے جو اس کے اندر ہر ہے۔

”کون سا روگ لگا بیٹھا ہے خود کو کہ زندگی یوں بوجھ کی طرح گزار رہا ہے۔“

وہ چپ نہ رہ سکا۔ حالانکہ کتنے ماہ ہو گئے تھے اسفند کو یہاں آئے، اس نے اپنے اور ان سب کے درمیان ایک فاصلہ قائم رکھا ہوا تھا جسے وہ کبھی نہیں ختم کر پائے تھے۔ مگر آج درید کو جانے کیا سوچھی تھی۔

”تجھے ہی لگتا ہے..... ایسا کچھ نہیں ہے۔“

”تیری چپ کے پیچھے راز ہے اسفند ضیاء۔!!“

”ضروری ہے کہ خاموشی پر اسرار ہی ہو۔ یہ میرے مزاج کا حصہ بھی تو ہو سکتی ہے۔“

”یوں تو اسفند ضیاء میں تجھے بہت زیادہ تو نہیں جانتا، ہاں یہ بات دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ خاموشی تیرے مزاج کا حصہ نہیں جو تو نے خود پر طاری کر لی ہے۔“

”ایسا ہے بھی تو، کیا کرے گا جان کر۔“

”صرف تیرے من کے لگے قفل کھولنا چاہتا ہوں۔ تاکہ تم زندگی کو اللہ پاک کی خوبصورت نعمت سمجھ کر جیو۔“

”کیوں چاہتا ہے تو ایسا، کیا رشتہ ہے تیرا میرا۔“

”رشتے تو من کے احساس سے بنتے ہیں۔ تیرا دل مانے تو رشتہ بہت گہرا ہے، اور نہ مانے تو کچھ بھی نہیں۔“

”میری تو اپنی ذات پر کچھ بھی نہیں کا لیل ہے درید۔ نہ کوئی میرا ہے اور نہ میں کسی کے لیے کچھ ہوں۔“

”یہ تیری سوچ ہے اسفند، ورنہ ہم نے کبھی تجھے خود سے الگ نہیں جانا۔ تجھی تو جانا چاہتا ہوں کہ تیرے من کو کون سا روگ لگ گیا ہے۔“

”ایک بار پھر بکھر جاؤں گا، بہت مشکل سے سمیٹ پایا ہوں خود کو۔“

اس کی سنہری کانچ سی آنکھوں میں سرخی نمایاں ہونے لگی۔

”تجھے لگتا ہے کہ درید عباس تجھے بکھرنے دے گا۔“

اس نے اسفند کے چہرے پر نظریں جما کر کہا تھا۔

حالانکہ وہ تو صرف اپنی ذات میں بند رہتا تھا، مگر آج درید کے سامنے ہار سا گیا۔

منسوب تھے جو لوگ میری زندگی کے ساتھ

اکثر ملے وہ بھی بڑی بے رُخی کے ساتھ

درید کی نگاہیں اس کے رنجیدہ چہرے پر گڑھ کر رہ گئیں جس کی آنکھوں میں درد نمایاں ہونے لگا تھا اور لب ہولے ہولے ہل

رہے تھے۔



اس کا تعلق بھی میڈیا سے تھا۔ ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی سے منسوب ہونے کے ساتھ ساتھ اچھا فوٹو گرافر بھی تھا۔ اپنے پروفیشن کے باعث اس کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ جن میں میل فیملی سب ہی شامل تھے۔ یوں بھی یہ فیلڈ ایسی وسیع تھی کہ وہ قسم نہیں کھا سکتا تھا کہ اس کی کسی لڑکی سے دوستی نہیں ہے۔ اس کے فرینڈز میں لڑکیوں کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی۔

ہائی نیچر وہ بہت فرینڈلی تھا۔ کچھ وجاہت بھی وہ کمال رکھتا تھا کہ لڑکیاں خود ہی اس کی طرف متوجہ ہو جاتی تھیں۔ اس کے چہرے پر سنہرے کانچ سی شوخیاں اور ہر دم مسکراتی دوسروں کو اپنی گردیدہ کر لیتی تھیں۔ ہاں یہ بھی سچ تھا کہ فرینڈز بہت تھیں مگر گرل فرینڈ والا پورشن ابھی تک خالی تھا۔

اس نے تقریباً تہا عمر گزاری تھی۔ ماں باپ سالوں پہلے چل بے تھے اور بہن بھائی کوئی نہیں تھا۔ مگر اس نے اکیلے پن کو کبھی خود پر طاری نہیں کیا تھا اور لائف کو بہت مزے سے گزار رہا تھا۔

دن کا بیشتر حصہ وہ باہر ہی گزارتا تھا اور فارغ ہو تو فرینڈز کے ساتھ گید رنگ میں ٹائم پاس کرتا۔ بہت من مو جی سا بندہ تھا۔ وہ کبھی اپنے کسی اپارٹمنٹ پر سب فرینڈز کو بلا لیتا۔ خوب ہلہ گلہ ہوتا اور خوب ڈرنک چلتی۔ اور بس اس کی خامیوں میں سب سے بڑی خامی یہ ہی تھی کہ وہ ڈرنک کرتا تھا۔ اس کے کسی فرینڈ کو اعتراض نہ تھا، کیونکہ وہ خود اس کے ساتھ بیٹھ کر پیتے تھے۔ مگر اس کا کلوز فرینڈ سعد رسول اسے اکثر ٹوکتا تھا۔ اور وہ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیتا تھا۔ کبھی کبھار فرینڈز کے ساتھ ٹائٹ کلب میں وہ ضرورت سے زیادہ ڈرنک کر لیتا تو سعد ہی اسے گھر چھوڑتا تھا۔

آج بھی اس کے دوست کی برتھ ڈے پارٹی تھی۔ اور اسی لیے وہ جلدی گھر آیا تھا۔ ابھی وہ باتھ سے نکلا ہی تھا کہ اس کے سیل پر پیپ ہوئی۔ وہ تو لیے سے بال رگڑتا موبائل اٹھا کر چیک کرنے لگا۔ اور یس کا بٹن پش کر کے کان سے لگایا تھا۔

”ہیلو!“

”گڈ ایوننگ ڈیر کہاں تھے تم؟ کب سے کال کر رہی ہوں۔“

اس نے شدید حیرت سے موبائل کان سے ہٹا کر دیکھا۔ اس کی حیرت کی وجہ وہ دوسری طرف سے نسوانی آواز نہیں بلکہ قطعی



انجانی آواز، اور اس پر بے تکلف لہجہ تھا۔

”سوری! میں آپ کو پہچان نہیں پایا۔“

”نیور ماسٹڈ!“

دوسری طرف بے نیازی سے کھلکھلاتے لہجے میں کہا گیا تھا۔

”آپ کون ہیں.....؟“

مے بی اس کا ذہن کام نہ کر رہا ہو اور وہ پہلے مل چکے ہوں، تبھی اس نے لہجے میں سختی نہیں آنے دی۔

”مائی نام از یعنی، یعنی کنول!“

اس نے پوری طرح ذہن پر زور دیا تھا مگر اسکے حلقہ احباب میں یہ نام قطعی شامل نہیں تھا۔

”دس از رنگ نمبر، ایم سوری۔“

”سو اسٹ۔ رائنگ نمبر کور اسٹ بننے میں کتنی دیر لگتی ہے مسٹر.....“

”واٹ ڈو یو مین!“

”سیدھا سا۔ فرینڈ شپ کرنا چاہتی ہوں تم سے۔“

”میڈم میں اتنا فارغ بندہ نہیں ہوں۔ کہیں اور ٹرائی کرو۔“

وہ چڑسا گیا۔ اور لائن کاٹ کر تیاری کرنے لگا۔ کیونکہ اسے اپنے بالوں سے بہت پیار تھا اور وہ جانتا تھا کہ لیٹ ہونے پر اس

کے فرینڈز نے گنجا کر دینا تھا اسے۔

لیٹ نائٹ وہ گھر پہنچا تھا۔ کچھ ڈرنک بھی زیادہ ہی کر لی تھی۔ بیڈ پر گرتے ہی ہوش نہ رہا اور صبح دیر سے آنکھ کھلی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ

اب ہر کام میں افراتفری کر رہا تھا۔ ناشتہ بنا کر ٹیبل پر رکھا تھا اور فریج سے جوس لے کر ابھی بیٹھا ہی تھا کہ سیل چیخنا شروع ہو گیا۔

اس نے بنا دیکھے مصروف انداز میں کال ریسیو کی تھی۔

”گڈ مارنگ ڈیر!“

گاڈ۔ اس کے ذہن سے تو لہجہ اور رائنگ نمبر سب محو ہو چکے تھے کہ سویرے ہی پھر۔“

”فار گاڈ سیک۔ آپ جو بھی ہیں، میں قطعی آپ کے ٹائپ کا بندہ نہیں ہوں۔ مجھے تنگ کرنا بند کر دو۔“

”بٹ آئی تھنک، آپ میرے لیے مسٹر اسٹ ہیں۔“

”یو آر میڈ۔“

”آف کورس! بٹ صرف تمہارے لیے۔“

”اوگا ڈ.....“

اس کا من چاہا سر پیٹ لے اپنا۔

”آئی تھنک یو آر بزی۔ میں رات میں کال کروں گی۔ بٹ آپ کا پیچھا نہیں چھوڑوں گی۔“

کیا ڈھیٹ لڑکی تھی۔ اپنی کہہ کر فون بند کر گئی لیکن اس وقت اس کے پاس ٹائم نہیں تھا ان فضول باتوں کو سوچنے کا۔



”کیا بات ہے جان من آج ان قاتل نگاہوں میں مسکراہٹ کی جگہ الجھن نظر آ رہی ہے۔ خمار کی جگہ پریشانی دکھاوی دے رہی ہے۔“

اس نے سعد رسول کی بے وقت شاعری پر اسے گھورا تھا۔

”سب کچھ نظر آ رہا ہے، وہ نیند نہیں دکھائی دے رہی جو تیرے باعث پوری نہیں ہوئی۔“

”میرے باعث۔“

سعد نے حیرت سے دیکھا۔

”یوں کہیے مسٹر اسٹیفن جوزف کہ آپ کو شباب اور شراب نے مدہوش کر دیا تھا۔ ڈانس کرتے ہوئے وقت کا اندازہ نہ رہا۔“

سعد نے آئینہ دکھایا تو وہ آنکھ دبا کر ہنس دیا۔

”ویسے بہت مزہ آیا تھا ناں۔“

”ہاں جی، جن کے آگے پیچھے دو شیرائیں مچھر مکھیوں کی طرح بھنبھناتی ہوں مزہ انہیں ہی آ سکتا ہے۔“

”جج جج۔ تو تو جیسے تسبیح کے دانے گن رہا تھا وہاں۔ پتلی کمر پر تو میں پھسل رہا تھا ناں۔“

اسٹیفن نے رات کی چوری پکڑ لی تھی اس کی۔ سعد منہ پھاڑ کے ہنس دیا۔

”بائی دی وے، آج نشا سرمد سے میٹنگ تھی تیری۔“

سعد نے سنجیدہ ہوتے ہوئے یاد دلایا تو اس کے خوشگوار موڈ کا بیڑہ غرق ہو گیا۔

”تو چلا جا..... یار مجھے بڑی چڑ آتی ہے اس سے۔ چھپکلی کی طرح چپکنے کے چکر میں رہتی ہے یار۔“

”آئی ڈونٹ کیئر اور یونو مجھے نفرت ہے اس طرح کی گرلز سے۔“

”یونو اسٹیفن، اس وقت وہ بیٹ ماڈل ہے پاکستان کی۔“

”سوواٹ سعد..... مجھے اپنا نام بنانے کے لیے ایسی سٹرچی کی ضرورت نہیں ہے۔“

نشا سرمد جتنا اس پر مرتی تھی وہ اتنا ہی دور بھاگتا تھا اس سے۔

”اچھا تجھ سے کام تھا، موڈ خراب نہ کر۔“

سعد نے اس کی پیشانی پر نمایاں ہوتے بل دیکھے۔

وہ بھی گہری سانس لے کر خود کو خواہ مخواہ کی بد مزگی سے نکالنے لگا۔ سعد کی باتوں میں الجھ کر اسے یاد نہیں رہا۔ ورنہ وہ سعد سے رائگ کال والی لڑکی کے بارے میں شیئر کرنا چاہتا تھا۔ دوسری طرف اس کے من میں یہ بھی تھا کہ ہو سکتا ہے یہ اس کے کسی فرینڈ کی شرارت ہو۔ جو بھی تھا، ایک بار پھر وہ یہ بات فراموش کر گیا۔ مگر دوسری طرف وہ ہی مستقل مزاجی تھی اور بات کی اتنی پکی تھی کہ عین اس وقت کال کی جب وہ لائن آف کر کے سونے کی تیاری میں تھا۔ جی جان سے جل گیا تھا وہ اس کی آواز سن کر۔

”ڈسٹرب تو نہیں کیا میں نے۔“

”بی بی گھڑی کی سوئیاں دیکھو۔ اس وقت کسی بھی شریف آدمی کو کال کر دوں تو وہ ڈسٹرب ہی ہوگا۔“

”ایم سوری، مگر تمہاری آواز سنے بنا مجھے نیند نہ آتی۔ یونو، بے شک تمہیں میری آواز سن کر غصہ آتا ہے۔ بٹ میرے لیے تم اور تمہاری آواز، دونوں بہت اسپیشل ہیں۔“

”لسن میڈم! یہ ڈرامہ بند کرو اور سیدھے سے بتاؤ کہ تم کون ہو اور مجھے تنگ کر کے کیا ملتا ہے۔“

”میں صرف تمہیں چاہتی ہوں۔“

بے باک لہجے اس کے تن بدن میں آگ لگا گیا۔

”جسٹ شٹ آپ۔“ بند کرو یہ بکواس اور مجھے سکون سے سونے دو۔“

”میرا سکون چھین کر تم کیسے سکون سے سو سکتے ہو۔“

”ٹیل می پلیز! آخر تم کون ہو؟“

”عینی کنول ہوں۔ آئی نو۔ تم مجھ سے تنگ ہو، بٹ میں تم سے دوستی کرنا چاہتی ہوں۔“

”اور میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میرے پاس اتفاقاً لنو ٹائم نہیں ہوتا۔“

”آئی پراس یو، میں کبھی تمہیں تنگ نہیں کروں گی۔ بس تم جب تمام مصروفیات سے ایزی ہو جاؤ تو مجھے مس نیل کر دیا کرو۔“

”پاگل ہوں میں یا میرے سر پر سینگ ہیں۔“

”پاگل تو میں ہو چکی ہوں تمہارے لیے، بنا تمہیں دیکھے۔“

”اُف گاڈ..... یہ کیا بلا ہے؟“

مجال ہے جو کسی بات کا اثر ہوتا ہو۔ اگلے دن لنچ ٹائم میں وہ سعد سے یہ تمام صورتحال شیئر کر رہا تھا۔

”تمہاری چاہنے والیوں میں ایک اور کا اضافہ۔“

اس کے لہجے میں حسرت تھی۔

”خبیث انسان، میں جان پھڑوانے کے چلر میں ہوں اور لو!“

”اسٹیفی، اس سے ملنے کا بول ناں، دیکھتے تو ہیں کیا چیز ہے؟“

”آئی ول کل یو سعد رسول۔“

”ناؤ سیر لیں۔“ دیکھ اگر تجھے شک ہے کہ وہ ہمارے کسی فرینڈ کی شرارت ہے تو تب بھی ایک بار ملنا تو پڑے گا ناں۔“ تو اسے

فون کرناں۔“

”نیور۔“

وہ ماننے کو تیار نہ تھا۔

”ہاں اگر وہ خود کال کرے گی تو کہہ دوں گا۔“

سعد نے آنکھیں نکالنے پر اس نے بات مکمل کی۔ اور شام میں ہی اس کی کال آ گئی تھی۔ اتفاق سے سعد اس کے ساتھ ہی تھا۔

”میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”ریکلی! اس کا مطلب ہم دوست بن گئے۔“

”نو..... ملنے کے بعد ڈیسیائیڈ ہوگا۔“

اس نے فوراً اسپاٹ لہجے میں کہا تھا۔

”اوکے، کب اور کہاں.....“

وہ تو جیسے تیار بیٹھی تھی..... اسٹیفن نے اسے ٹائم اور جگہ کا بتا کر فون بند کر دیا تھا۔

”مل لینا جا کے اب۔“

”کیا مطلب؟؟“

سعد کے حیران انداز میں کہا۔

”اسے کیا پتا چلے گا اگر میری جگہ پر تم چلے جاؤ گے، تمہاری حسرت بھی پوری ہو جائے گی۔“

”بڑا کمینہ ہے تو.....!“

”یونو، آج میں بڑی ہوں۔“

”کل کا ٹائم دے دیتا۔“

”سچ بتاؤں تو مجھے ملنا ہی نہیں۔ تیری خواہش تھی، اب مل لینا اور آ کے مجھے بھی بتا دینا۔“

سعد نے صاف صرخ کر دیا۔

”اکیلا!!“

”کہاں پھنسا دیا تو نے۔“ تجھے ہیلپ کرنے کو کہا تھا، جان عذاب میں ڈالنے کو نہیں۔“

اس نے گردن جھٹکی مگر سعد نے کسی نہ کسی طرح اسے قائل کر لیا تھا اور وہ عین ٹائم پر پہنچ بھی گیا تھا۔

”میں اسے جانتا تک نہیں۔ یہاں تو سینکڑوں لڑکیاں ہیں۔“ کیسے پتا چلے گا ان میں عینی کنول کون ہے۔“

وہ جھنجھلایا ہوا تھا۔ سعد اس کے چہرے پر بیزاری دیکھ کر جل کر رہ گیا۔

”اچھا شکل تو ٹھیک کر۔ جاڈیٹ پر رہا ہے اور بارہ بج رہے ہیں۔“

”تھپڑ کھالے گا تو۔ ڈیٹ پر۔“

وہ دونوں چاروں طرف نگاہیں گھما رہے تھے۔

”وہ اکیلی لڑکی بیٹھی ہے بلیوڈریس والی۔“

سعد نے آنکھ سے اشارہ کیا۔

”تو ضروری ہے کہ وہ ہی ہو۔“

”پوچھنے میں کیا حرج ہے، جادفع ہو۔ میں یہیں ویٹ کرتا ہوں۔ سعد نے اسے آگے کی طرف دھکا دیا اور خود وہیں خالی ٹیبل

کے گرد پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

اچھا خاصا بندہ کس چکر میں پھنسا دیا تھا۔

”مس عینی کنول۔“

وہ عین اس کے سامنے آن رکھا تھا۔ اس کے سوال پر وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”ایس!!“

عینی کنول کی نظریں اس کے چہرے پر جیسے جم کر رہ گئیں۔

”میڈم پلیز سٹ ڈاؤن۔“

بمشکل اس نے لہجہ نارمل رکھا۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے اسے بھی کہا تھا وہ جیسے چونک کر مسکرا کر پھر سے بیٹھ گئی۔

اسے دیکھ کر یہ شک بھی دور ہو گیا تھا کہ اس کے کسی فرینڈ کی شرارت ہوگی۔ مگر یہ طے تھا کہ وہ جو بھی تھی

حسن و خوبصورتی کا نمونہ تھی۔



”اب ہم دوست بن سکتے ہیں۔“

وہ مسکرا کر بولی تو وہ لمحے بھر کو ساکت رہ گیا تھا۔

”کیا چاہتی ہو تم مجھ سے۔ میں تمہیں جانتا تک نہیں ہوں۔“

جان پہچان بنانے کے لیے تو آئے ہیں ناں۔“

اس کے لہجے میں اعتماد تھا۔

”نام جان سکتی ہوں تمہارا؟“

”اسٹیفن جوزف۔“

اس کے بولنے پر وہ لمحہ بھر کو خاموش سی ہوئی تھی مگر اگلے پل وہی مسکراہٹ دوبارہ اس کے لبوں کا حصہ بن گئی جو پہلے بھی اس کے چہرے پر تھی۔

”یونوا اسٹیفن، تمہارے لیے میں غیر اہم ہوں۔ مگر تم میری دیوانگی بن گئے ہو۔ تمہیں دیکھ کر چاہئے گی ہوں میں اور آج تم سے ملنے کے بعد اس دیوانگی میں اضافہ ہو گیا ہے۔“

”لیکن میں یہاں صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ پلیز کیوں اپنا اور میرا وقت برباد کر رہی ہو، میں بہت مصروف بندہ ہوں۔“

”میں نے پہلے بھی تم سے کہا تھا اور آج بھی وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری مصروفیت میں کبھی تنگ نہیں کروں گی۔ بٹ پلیز یہ مت کہنا کہ مجھے کال کرنا چھوڑ دو۔“

”وائے۔“ وہ اکتا گیا تھا۔

”میں تمہیں مجبور نہیں کرتی کہ تم بھی مجھے چاہو۔ مگر تم میری چاہت ہو اور تم سے بات کرنا میری مجبوری ہے۔ پلیز!“

وہ صاف انکار کرنا چاہتا تھا مگر اس کی آنکھوں میں التجا نے اس کی زبان روک لی اور وہ سر ہلا بیٹھا تھا۔

یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ مگر پھر روز رات میں عینی کنول سے بات کرنا اس کی روٹین میں شامل ہو گیا۔

پہلے پہل وہ صرف اس کی سنتا تھا اور ہاں میں جواب دے دیتا۔ مگر دھیرے دھیرے جب بے تکلفی ہوئی تو وہ بھی عینی کنول سے اچھی خاصی گپ شپ کرنے لگا۔ اور محض ایک ماہ میں وہ دونوں ایک دوسرے کے بارے میں تمام باتیں جان چکے تھے۔

یعنی کنول ایک امیر باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ ماں باپ دونوں ہی بزنس میں انوالورہتے تھے اور تنہائی دور کرنے کے لیے اس نے فون پر دوستیاں بنانے کا مشغلہ اپنایا تھا۔

اسٹیفن کے علاوہ بھی اس کے بہت سے دوست تھے جن سے فرینڈ شپ اس کی فون پر ہوئی تھی۔ یہ اس کا شوق بن گیا تھا۔ مگر

اب ان کی دوسری شخص فون تک محدود نہیں تھی، وہ اشرم ملتے تھے۔ سبھی باہر ڈنر کر لیا اور سبھی وہ اسٹیشن کے اپارٹمنٹ پر آ جاتی۔ سبھی اسے فون کر کے پوچھ لیتی کہ وہ کب تک بڑی ہوگا..... اور وہیں سے اسے پک کر لیتی۔

”اسٹیفنی..... خیریت ہے ناں، کچھ خاص اہمیت دینے لگے ہو یعنی کو۔“

سعد رسول نے جونوٹس کیا کہہ دیا۔

”ہاں.....! بی کو زوہ ہے ہی اسپیشل۔“

اس نے کھل کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”دھیان سے! نشا سرمد کو علم ہو گیا کہ تم کسی اور کی زلف کے اسیر ہو چکے ہو تو بہت برا ہوگا۔“

”میری پرسنل لائف میں انٹرفیر کرنے کا حق کس نے دیا ہے اسے۔“

”اچھا تو جا، موڈ خراب نہ کر۔“

وہ جانتا تھا کہ عینی نے اسے فون کیا ہے۔

”سعد! پتا نہیں مگر عینی بہت اہم ہو گئی ہے میرے لیے۔“

”اچھی بات ہے ناں! تنہا زندگی گزرنے میں سکتی۔ اور لائف پارٹنر بھی ٹائم پر تلاش کر لینا چاہیے۔“

”لائف پارٹنر۔“

اس نے زیر لب دہرایا تھا مگر مزید کچھ کہا نہیں اور تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ عینی کنول کے سامنے بیٹھا تھا۔

”اچھے لگ رہے ہو۔“

اسکائی بلیو شرٹ اور بلیک پینٹ میں اس کی وجاہت نمایاں ہو رہی تھی۔ وہ مسکرایا۔ یہ حقیقت تھی کہ عینی کی پرشددت چاہت نے اسے اپنی طرف کھینچا تھا۔ وہ اتنی محبت کرتی تھی تو بھلا کیسے وہ خود کو محبت کی اس آگ سے بچا سکتا تھا۔ تبھی وہ عینی کنول کو اس کی شدتوں سے بڑھ کر چاہنے لگا تھا۔

”پتا نہیں عینی کنول اس محبت کا انجام کیا ہے۔“

اس کی سنہرے کانچ سی آنکھوں میں بے چینیاں جھلک رہی تھیں۔

”کیوں ہو تم بے یقین۔“ میں تمہارے لیے جان دے سکتی ہوں مگر تمہیں چھوڑ نہیں سکتی۔“

”میں اتنا جانتا ہوں عینی کہ!! میں ادھورا ہوں تمہارے بنا۔ تمہارے وجود سے میری ذات مکمل ہو سکتی ہے۔“

”آ کی نو۔“

”آئی ایم فائن سعد رسول۔“

سینکڑوں بار کہنے کے باوجود بھی سعد نے اسے گھرا کر ہی چھوڑا تھا۔

”تجھے وہم ہو گیا ہے، میں نے نارمل ہی پی ہے۔“

”اندازہ ہے مجھے۔“

اس کے لڑکھڑاتے لہجے پر وہ تپ کر بولا تھا۔

”تم یہ چھوڑ نہیں سکتے۔“

”تجھے کیا پرابلم ہے۔“

”یہ کوئی اچھی چیز نہیں ہے اور جب اس سے سختی سے منع کیا گیا ہے تو.....“

”تمہارے مذہب میں منع ہے!! اور اس کے باوجود تم سب لوگ پیتے ہو، سرعام پیتے ہو۔ مجھ پر پابندی کیوں؟؟“

وہ کبھی کبھی ایسی تلخ بات کہہ جاتا اور سعد سہہ جاتا۔ کیونکہ بات تلخ ضرور ہوتی تھی مگر حقیقت بھی تھی کہ مسلمان ہونے کے باوجود

یہ برائی عام تھی ہمارے معاشرے میں۔

”میں تو نہیں پیتا۔ اسی لیے تمہیں اپنا سمجھ کر منع کر دیتا ہوں۔ مگر آج کے بعد نہیں کروں گا..... سو جاؤ گڈ نائٹ۔“

”سعد سن۔ ایم سوری، میں تجھے ہرٹ کرنا نہیں چاہتا تھا۔“

”میں ہرٹ نہیں ہوا۔“

وہ سعد کو روکنے کے لیے اس کے پیچھے بھاگا تھا۔ سعد نے سہولت سے اس کا ہاتھ ہٹایا تھا اور بہت دھیمے سہجے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

”ایک بات کہوں؟ مذہب کوئی بھی ہو برائی سب کے لیے برائی ہی ہے۔ یہ محض انسان کی اپنی سوچ کا فرق ہوتا ہے۔“

لحہ بھر کو وہ رساں سے بولا تھا۔

”ناراض ہو گیا ہے ناں!“

”نہیں، بس نیند آ رہی ہے۔“

”تو..... یہیں سو جا اس وقت گھر جائے گا، انکل آئی ڈسٹرب ہوں گے۔ میں فون کر دیتا ہوں۔“

زبردستی کھینچ کر اسے واپس لے آیا۔

”ایم سوری سعد پلیز!“ اتنا وہ سمجھ گیا تھا کہ سعد ہرٹ ہوا ہے۔

سعد بھی ناراضی بھول کر بولا تھا۔ وہ ہنس دیا۔

”لو کچھ اور مانگ لیتے، ادھر نام لیا ادھر اس کا فون آ گیا۔“

اس کے موبائل پر صرف عینی کی ہی کال آ سکتی تھی۔ اس نے بنا اٹینڈ کیے سیل سعد کی طرف بڑھا دیا تھا۔

”نو، میں تو ایسے ہی کہہ رہا تھا۔ خود بات کرو۔ اس سے تم نے بات کرنی ہے۔“ وہ سر ہلاتا ہوا دور جا بیٹھا تھا۔

”وہ تو ہر وقت مجھ سے بات کرنا چاہتی ہے۔ یونو سعد! ششی از کریزی اور اس نے مجھے بھی دیوانہ بنا دیا ہے۔ اب تو محسوس

ہوتا ہے کہ اس کے بن سانس بھی نہیں لے سکوں گا۔“

اسے الفاظ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں تھی، سعد اس کی دیوانگی کے عالم سے بخوبی واقف تھا۔

”او کے! بٹ ابھی کال اٹینڈ کرو۔“

ایک بار بند ہو کر پھر سے موبائل بجنے لگا تھا۔

”ہیلو ڈیئر.....!“

لہجے میں کچھ شراب کا خمیر تھا اور کچھ اس کے پیار کا۔

”سو گئے تھے۔“

”اول ہوں..... ابھی آیا تھا گھر۔ یوں بھی تم سے بات کیے بنا سوسکتا ہوں۔“

”یہ ہی تو پر اہلم ہے اسٹیفن جوزف، ورنہ رات کے اس پہر انسان سوچکا ہوتا ہے۔“ وہ مسکراتے لہجے میں بولی تھی۔

”میں تو ہر رات تمہارے وجود کو محسوس کر کے سونا چاہتا ہوں۔ کب مٹاؤ گی یہ دوریاں، کب ختم ہوں گی میری بے قراریاں۔“

وہ ہسکے ہسکے انداز میں بولا تھا۔ سعد نے بمشکل اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی روکی، کیونکہ اس کے خیال میں اسٹیفن۔

”آئی تھنک، تم نے آج پھر ڈرنک کی ہے۔“ عینی بھی سمجھ گئی۔

”تمہارے پیار سے زیادہ نشہ نہیں ہے شراب میں۔“

”بٹ، اس وقت صرف شراب کا نشہ ہے تمہارے لہجے میں..... تم پلیز سو جاؤ۔“

”گڈ نائٹ!“

”گڈ نائٹ، لو یو ڈیئر۔“

”آئی لو یو ٹو.....“

عینی کی خوبصورت آواز بند ہونے کے بعد بھی کانوں میں اتری ہوئی تھی۔

سعد نے تشرارت سے جملہ ادھورا پھوڑا۔

”سوواٹ، بدنام گر نہ ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔ محبت میں انتہا سے گزر جانا ہی دیوانگی ہے۔“

”اچھا دیوانے صاحب! مجھے تو نیند آ رہی ہے۔ تم کھوئے رہو خیالوں میں، مجھے سونے دو۔“

سعد نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔



اکثر ہی وہ اس سے ملنے اس کے فلیٹ پر آ جاتی تھی، جیسے آج اچانک آ کر اس نے سر پرانز دیا تھا۔ کیونکہ آج وہ گھر پر تھا۔

”سر پرانز برا تو نہیں لگا۔“

”وائے!“ اس کی سارے جہاں سے خوبصورت آنکھوں والی مسکراہٹیں تھیں جو یعنی کنول کو دیکھ کر گہری ہو جاتی تھیں۔

”یہ گھر بھی تمہارا ہے اور میں بھی، جب بھی آؤ گی تمہیں منتظر ملیں گے۔“

”او، ریلی!“

”میرے پیار کی سچائی میری آنکھوں میں نظر نہیں آتی جان من۔“

”ان آنکھوں میں جو نظر آتا ہے وہ میرے وجود کو پگھلا دیتا ہے۔“ دیوانگی دونوں طرف برابر تھی۔

”کیا لوگی۔“ اس نے ماحول پر چھائے اثر کو زائل کرنا چاہا۔

”آج میں بناؤں گی اور تم چپ کر کے پی لو گے۔“

”کیا.....!“

”بلیک کافی.....!“

”اوکے۔“ اس نے کندھے اچکائے۔ یعنی کچن کی طرف چل دی۔ وہ وہیں بیٹھ کرٹی وی دیکھنے لگا تھا۔

”اسٹیفن! تمہیں نہیں لگتا یہ فلیٹ چھوٹا ہے۔“

کافی کاگ اس کے سامنے رکھ کر بولی تھی۔ اپناگ ہاتھ میں لیے وہ وہیں کھڑے ہو کر تمام جائزہ لینے لگی۔

اسٹیفن نے گردن موڑ کے اسے دیکھا جو عین اس کے پیچھے کھڑی تھی۔

”میرے خیال میں ہم دونوں کے لیے کافی ہے۔“

یعنی اس کی شوخ سی بات پہ کھل کر مسکرائی تھی اور بالکل اس کی پشت کے پاس آ کر بانہیں اس کے شانوں پر پھیلا دیں۔ چہرہ

اس کے سیاہ بالوں پر رکھ دیا۔



اس کے لفظوں میں آج سنی جو اسٹیفن کے دل کو چھوئی۔ اس نے عیسیٰ کا بازو تھام کر اسے اپنے پیچھے سے اپنے سامنے بالکل قریب بٹھایا تھا اور اس کے نازک وجود کو بانہوں کی پناہوں میں لے لیا۔

اس پر سحر طاری ہونے لگا تھا۔

”ہاں! مگر وعدہ کرو یہ دیوانگی صرف میرے لیے ہوگی اور عمر بھر کم نہ ہوگی۔“

اس کی محبت کا خمار عینی کنول کو بھی مدہوش کر رہا تھا۔ اسٹیفن جوزف اس وقت کمزور لمحوں کی گرفت میں تھا۔ اس نے لبوں سے عینی کا چہرہ چھوا تھا۔ عینی کی قربت اسے بہکا رہی تھی۔ اس کا تنفس تیز ہونے لگا تھا۔

اس سے پہلے کہ اس کی مدہوشی حد سے گزرتی، یکدم اسے ہوش آیا تھا اور اس نے عینی کو جھٹکے سے دور کیا تھا خود سے اور فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

”اوگا ڈا!“ دس ازرانگ۔“

دونوں ہاتھوں سے سر تھامے وہ نفی میں سر ہلارہا تھا۔ عینی دنگ سی اس کی حالت دیکھ رہی تھی۔

جس ماحول میں دن رات وہ رہتا تھا وہاں صحیح غلط کا اندازہ بہت کم لوگوں میں ہوتا ہے اور اس کے اندر یہ احساس تھا تبھی وہ شرمندہ تھا۔

”یہ کیا کرنے لگا تھا میں۔“

”اوکے، جسٹ ریلیکس! شاید دیوانگی اسی کا نام ہے۔“

”بٹ دس ازرانگ۔ مجھے لمٹس کر اس نہیں کرنی چاہیے تھیں۔ ایم سوری، عینی پلیز!“

”اٹس اوکے۔“

اس نے اسٹیفن کا ہاتھ تھام کر اسے صوفے پر بٹھایا اور پانی دیا۔

”تم میرا جنون بن گئی ہو۔ میں نہیں رہ سکتا اب مزید تمہارے بنا پلیز عینی۔“

”میلیومی! یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ (وہ بولی)

”مشکل کیا ہے؟“ اسٹیفن کی آنکھیں اس کے جواب پر حیرت سے پھٹ گئیں۔

”تم جانتے ہو اسٹیفن کہ تمہارے اور میرے بیچ کیا رکاوٹ ہے۔“

”یو مین کہ تم مسلمان ہو اور میں!!“

عینی اسے خاموش کرا گئی۔

”تمہارے لیے یہ میری محبت سے زیادہ اہم ہے۔ ہزاروں شادیاں ہوتی ہیں ایسے دنیا میں۔“

”ہوتی ہوں گی، مگر میں تم سے ایسے شادی نہیں کر سکتی۔“

”یعنی یہ شرط ہے تمہاری۔“

”ایسا نہیں ہے اسٹیفن، مگر میں کوئی ایسا قدم نہیں اٹھا سکتی جو ہمارے معاشرے میں غلط سمجھا جاتا ہے۔“

”معاشرے کی اتنی فکر ہے تمہیں۔ اور یعنی تم اس وقت میرے گھر پر میرے ساتھ موجود ہو۔ یہ معاشرے کے لیے صحیح ہے، دن رات مجھے فون کرتی ہو۔“

”وہ میری محبت ہے کہ میں نہیں رہ سکتی۔ لیکن کیا تم میرے لیے یہ نہیں کر سکتے۔“

”کیا.....؟“

”یہ ہی کہ تم اسلام قبول کر لو۔“

کئی لمحے ان دونوں کے بیچ خاموشی رہی۔

”تم مجھ سے میری سانسیں بھی مانگ لو تو یعنی کنول میں انکار نہیں کر سکتا۔ تم جیسا چاہتی ہو میں تیار ہوں صرف تمہیں پانے کے لیے۔“

”رئیلی اسٹیفن!“

بہت خوش ہوئی تھی وہ۔ اسٹیفن نے سر ہلا دیا۔

اس کے خیال میں تو صرف یعنی کنول کی محبت اہم تھی اب جو وہ چاہتی تھی۔

اس نے حامی بھر لی تھی۔

”میں کل صبح تمہیں لینے آؤں گی۔ قاری صاحب کے پاس چلیں گے۔“

”جہاں لے جاؤ گی چل پڑوں گا۔ مجھے صرف تمہیں پانا ہے اور بس، اس نے اقرار کی مہر لگا دی۔“

سعد رسول کو اس نے یہ نیوز دی تھی، وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو چکا ہے تو سعد نے بہت خوشی سے اسے گلے لگایا تھا، بہت خوش

ہوا تھا۔

”محبت ہو یا دوستی، یہ کبھی کسی مذہب یا ذات کے فرق کو تسلیم نہیں کرتی۔ میرا ایمان میری محبت ہے اور میری محبت کی یہ خواہش تھی

جس کا میں نے احترام کیا۔“

سعد رسول کے چہرے پر یکدم خوشی کے تاثرات ختم ہو گئے تھے۔

”تم جانتے ہو تم نے جو دین اپنایا ہے اس کے لیے دل کی رضا مندی اور دل سے ایمان لانا سب سے اہم ہے۔“

”دیکھو سعد! میں نے دل و دماغ کی رضا مندی سے ہی یہ فیصلہ لیا ہے۔“ اس نے سعد کا چہرہ دیکھا۔

”مگر اس فیصلے میں تمہارا مرکز اللہ کی ذات نہیں، عینی کی خوشی اہم ہے۔ تم نے عینی کو پانے کے لیے یہ دین قبول کیا ہے۔ اللہ کی رضا کو پانے کے لیے نہیں۔“

”تم کیوں مجھ سے اب یہ بحث کرنا چاہتے ہو۔ تمہارے لیے میری خوشی اہم نہیں۔“

”ہے، اور میں تمہارے لیے بہت خوش بھی ہوں۔ اللہ پاک تمہیں سارے جہاں کی خوشیاں عطا کرے۔“

اس نے اس کے شانے کو تھپک کر کہا تھا اور مسکراتے ہوئے اسے گڈ لک کہہ کر چلا گیا۔ ہاں اسے اپنے بیسٹ فرینڈ کے اسلام قبول کرنے کی جو خوشی ہوئی تھی وہ اب نہیں رہی تھی۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا سعد رسول نے۔

اور اب وہ تھا اور عینی، اور ان کی دیوانی محبت۔

”عینی! اب کس بات کے انتظار میں ہو؟ تم اپنے پیرٹس سے بات کرو ناں!“

”اسفند ضیاء! میں نے ان سے بات کی ہے، پلیز کچھ وریٹ کرو۔“

”ڈیڈ سنڈے کو فارغ ہوں گے، میں تمہیں ان سے ملواؤں گی۔“

وہ ساحل سمندر پر بیٹھے تھے۔ اور آج اسفند بہت سنجیدہ تھا۔ اس ٹاپک کو لے کر اب عینی کیوں دیر کر رہی ہے۔ جبکہ عینی نے جو کہا اس نے آنکھیں بند کرے مانا تھا۔

کیونکہ اس نے پوری سچائی اور دل کی تمام شدتوں سے عینی کو چاہا تھا۔

”تمہارا موڈ کیوں آف ہے؟“

وہ اپنے موبائل پر آنے والے ایس ایم ایس کو چیک کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”سیدھی سی بات ہے، اب ایک پل بھی تم بن نہیں گزرتا۔“

”اوگاڈ! یو آر کر ریزی اسفند ضیاء۔“

یہ نام بھی عینی کی پسند تھا۔ ورنہ قاری صاحب نے اسے احمد ضیاء کا نام تجویز کیا تھا مگر اس نے تو وہ ہی کرنا تھا جو عینی کی چاہت تھی۔

”ہاں ہوں۔“

اس نے قدرے غصے سے کہا تو وہ ہنس دی۔ تبھی اس کے موبائل پر پیپ ہوئی تھی۔ اس نے فوراً کال اٹینڈ کی۔

”ہائے تابش! سوری یار میں بزی تھی۔“

حالانکہ ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ اس کے ساتھ ہوتے ہوئے عینی کے پاس کوئی کال آئی تھی۔ اکثر ہی اس کی کالز آتی تیں کیونکہ فون پر دوستی کرنا اس کی ہابی تھی۔

مگر آج پہلے بار اسے بُرا لگا تھا۔ وہ کتنا سیریس تھا شادی کے ٹاپک کو لے کر جبکہ عینی کو فکر ہی نہیں تھی۔ وہ غصے میں وہاں سے اٹھ گیا۔

جانے کیوں اسے لگ رہا تھا کہ اب یعنی کی دیوانگی سرد پڑنے لگی ہے یا شاید وہ واقعی اس کے لیے کریزی ہو رہا ہے۔  
 ”یہ کیا حرکت ہے، کیوں اٹھ آئے تم؟“

”تمہیں فرق پڑتا ہے، میرے ہونے یا نہ ہونے سے۔“

”اسفند! تمہارے ساتھ کیا پرابلم ہے۔“

”میرے ساتھ ہوتے ہوئے تم کسی اور سے بات کرو، مجھے اچھا نہیں لگتا۔“ اس نے صاف گوئی سے دل کی بات کہہ دی۔

”وہ میرا دوست ہے اور یونو ویری ویل، یہ فرینڈ شپ کرنا میری ہابی ہے۔ یہ میں نہیں چھوڑ سکتی۔“

اسفند ضیاء اس وقت خاموش ہو گیا مگر اب اکثر ہی ان میں یہ بحث شدت اختیار کرنے لگی تھی۔ اسفند کے چہرے کا اضطراب ان دنوں چھپائے نہیں چھپتا تھا۔ ابھی سعد کو پوچھتا پڑا۔ حالانکہ اس نے اسفند کو اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

”کیوں بے چینیاں جھلک رہی ہیں ان سنہری آنکھوں میں!“

”تھنک!“

وہ سعد کو کیا بتاتا کہ یعنی کے سرد پڑتے جذبات نے بے چین کر دیا تھا۔ وہ جتنا اس کے لیے پاگل تھی، اب لا پروہ ہو رہی تھی۔

”اتنے فاصلے نہیں ہوئے ابھی ہم میں کہ تیری آنکھیں مجھ سے دل کا حال کہنا چھوڑ دیں۔“

”دل ہی تو احمق ہے، کسی حال میں خوش نہیں رہتا۔“

”یعنی سے جھگڑا ہوا ہے!“

”وہ ملتی کب ہے، اب کال کر دو تو نمبر بڑی ہوتا ہے۔ پورا دیک ہو گیا ہے سعد، جانے کیوں میرا دل وہنوں کا شکار ہو رہا ہے۔“

سعد اس کے بغیر نہیں جی سکتا، مر جاؤں گا۔“

”اللہ پر بھروسہ رکھو۔ ان شاء اللہ جو ہوگا بہتر ہوگا۔ شاید اس کی کوئی مصروفیت ہو۔“

”کچھ بتائے تو سہی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا وہ اپنے پیرنٹس سے بات کر چکی ہے اور اتوار کو اس نے مجھے اپنے ڈیڈ سے ملوانا تھا۔“

بٹ اس نے مجھ سے کوئی کامیٹ نہیں کیا۔“

”ہو سکتا ہے اسی بات کو لے کر ان کے گھر میں کوئی پرابلم ہو اور وہ تمہیں پریشان نہ کرنا چاہتی ہو۔“

”سعد اس کے پیرنٹس اچھے خاصے لبرل ہیں۔ یعنی ان کی انکلوٹی اولاد ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ اس چیز کو ایڈجسٹ ہو سکیں گے۔“

”پھر تجھے کیا بے چینی ہے؟“

”یعنی کا بدلتا رویہ۔“ اس نے دل کا خدشہ ظاہر کیا۔

”اوکے، میں یعنی سے بات کروں گا، تو کیوں اتنا ٹینس ہو رہا ہے۔“ سعد نے اسے تسلی دی تھی اور محض تسلی نہیں تھی، اس نے یعنی

سے کانٹیکٹ بھی کیا تھا۔

”اسفند بہت آپ سیٹ ہے، تم سے ملنا ہے۔“

”اوکے۔“ عینی نے کہا تھا اور وہ سعد نے جہاں بلایا، آئی بھی تھی۔“

”یونو ویری ویل، کہ تم اس کے لیے کیا ہو۔ اس کے پاس دنیا میں تمہارے علاوہ اور کوئی بھی رشتہ نہیں بچا ہے۔ وہ دوسروں کا شکار ہے۔“

سعد کی بات کے جواب میں وہ خاموش ہو رہی تھی۔

”میں اس سے خود بات کر لوں گی۔“

اس کا لہجہ کسی بھی تاثر سے خالی تھا۔ سعد نے اسے دیکھا۔

”کب.....!“

”آج کل میں بڑی ہوں، فرصت ملتے ہی۔“

”جبکہ تم جانتی ہو کہ وہ کتنا فکر مند ہے۔“

”دس ازناٹ مائی پرا بلیم..... اسے سمجھا دو۔“

”یعنی! بات کیا ہے؟ تم سے ملنے کے بعد مجھے بھی اندازہ ہوا کہ اسفند سچ ہی پریشان ہے۔ تمہارا لہجہ بہت بدلا بدلا سا ہے۔“

”یہ میرا پرسنل میٹر ہے۔ میں تم سے ڈسکس نہیں کر سکتی۔“

”اوکے، بٹ ریمیمبر، میرے دوست کو ذرا سی بھی ٹھیس پہنچی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“

سعد جانے کیوں جذباتی ہو گیا۔

”اوہ، تو ٹھیک ہے۔ جا کے سنبھالو اپنے دوست کو۔ کیونکہ میں شادی کر رہی ہوں تائش سے، اور کل ہمارا نکاح ہے۔“

وہ سعد کو شاک کی کیفیت میں چھوڑ کر اپنی بات مکمل کر کے چلی گئی۔



بہت کوشش کی اس نے کہ اسفند کو بتا دے مگر وہ یہ ہمت خود میں پیدا نہیں کر سکا۔ دو دن کشمکش میں گزر گئے۔ مگر اس کی حالت دیکھ کر کچھ بتانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں بے سدھ پڑا تھا۔ کمرے میں سگریٹ اور شراب کی بوتلیں ہوتی تھیں کہ سانس لینا محال تھا۔ مگر سائیکس پڑے اسفند کو دیکھ کر وہ اس کی طرف لپکا۔

”اسفند!“ اس نے اسفند کو دونوں بازوؤں سے تھام کر اٹھایا اور اس کا گال تھپکا تھا۔ مگر وہ قطعی ہوش میں نہ تھا۔ پھر اسے

ایمر جنسی میں اٹھا کر وہ ہاسپٹل لایا تھا۔ جہاں اسے فوری ٹریٹمنٹ دی گئی تھی۔

”ضرورت سے زیادہ ڈرنک کے باعث ان کی یہ کنڈیشن ہوئی ہے۔“



یہ ڈاکٹر کی رائے تھی۔

”یہ روٹین میں ڈرنک کرتے ہیں؟“

”اتنی زیادہ نہیں کرتا، کبھی کبھی بس فرینڈز کے ساتھ۔“

”آپ کو اندازہ ہے کہ اتنی زیادہ ڈرنک ان کی کڈنیز کے لیے بھی پر اہم بن سکتی ہے۔“

اب وہ کیا سمجھائے ڈاکٹر کو کہ صدے اور دکھ کے باعث اس نے زیادہ پی لی ہے، ورنہ وہ کبھی حواس نہیں کھوتا تھا۔

دو دن کی ٹریٹ منٹ کے بعد وہ کچھ بہتر ہوا تھا۔ مگر سعد کی گود میں سر دھرے جب وہ بچوں کی طرح ہلک ہلک کر رو دیا تو سعد کی

آنکھیں بھی نم کر گیا..... وہ کیسے اسے حوصلہ دیتا، وہ تو خود شک میں تھا۔

”کیوں سعد کیوں؟؟ ایسا کیوں کیا اس نے میرے ساتھ؟“

”شاید وہ تیرے قابل ہی نہیں تھی۔ اللہ پاک نے تیرے لیے یقیناً اس سے کہیں بہتر لڑکی منتخب کی ہوگی۔“

”سب کچھ چھین کر اب کیا دے گا وہ مجھے!“

”استغفر اللہ..... ایسے الفاظ ادا نہیں کرتے اسفند..... وہ ہمیں ستر ماؤں سے زیادہ چاہتا ہے، اسی لیے ہمیں وہ عطا کرتا ہے جو وہ

ہمارے لیے چاہتا ہے اور جو وہ چاہتا ہے اسی میں ہماری بھلائی ہوتی ہے۔“ وہ کافی دیر اسے سمجھا تا رہا۔

اسفند کی ذہنی حالت بہت ابتر تھی۔ ایک ہفتہ مکمل ہو چکا تھا مگر وہ سنبھل نہ سکا۔ اور پھر جب کچھ حوصلہ ہوا تو عینی کنول پھر اس کے

سامنے آ گئی۔ وہ اور سعد بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔

”تم واقعی میری دیوانگی بن گئے تھے، مگر جب تابش سے میری دوستی ہوئی اور دھیرے دھیرے ہم قریب آئے تو مجھے محسوس ہوا کہ تم

سے محبت محض میری جذباتیت تھی۔ محبت تو مجھے تابش سے ہے اور اتنی شدید کہ اس کے بن اک پل بھی سانس لینا مجھ پر بھاری گزرتا ہے۔“

اسفند ضیاء کا دل ماتم کرنے لگا کہ جس لڑکی کو اس نے دیوانگی کی تمام حدوں سے چاہا وہ.....

”میں تمہاری محبت کی قدر کرتی ہوں اسفند۔ ہم ہمیشہ اچھے دوست رہیں گے۔“

”تمہیں لگتا ہے عینی کنول کہ اب مجھے تمہاری شکل بھی دیکھنی چاہیے!“

”تمہیں تو میرا احسان مند ہونا چاہیے اسفند ضیاء۔ تم غیر مسلم تھے اور تمہیں دائرہ اسلام میں داخل کرنے کا کریڈٹ مجھے جاتا ہے۔“

”اور اگر تم ایسا سمجھتی ہو کہ تمہیں اس کا ثواب ملے گا تو تم غلط ہو عینی کنول۔ تم ایک دھوکے باز عورت ہو۔ تم نے جس طرح میرے

دوست کی زندگی برباد کی ہے اس کا دل توڑا ہے، وہ آہ عمر بھر تمہارا پیچھا کرے گی۔“ سعد مزید چپ نہ رہ سکا۔

میں جا کر تمہارے شوہر کو تمہاری حقیقت بتاؤں گا کہ تم کس قدر گری ہوئی ہو۔“

”اچھا! کوشش کر کے دیکھ لینا۔“

وہ تلخ مسکراہٹ اچھالتی چلی گئی۔ اور اسفندیاء سعد رسول کی بانہوں میں ڈھے گیا تھا۔

”میرے سچے جذبوں کے ساتھ اتنا بڑا مذاق!“

”اللہ تو دیکھ رہا ہے ناں!“

سعد نے اسے خود سے بھیج لیا۔



”تمہیں صبر صرف اللہ کی ذات دے گی اسفند۔ دل کے قرار کے لیے اس سے رجوع کرو۔“

سعد نے اسے رستہ دکھایا تھا۔ یہ سچ تھا کہ اس نے اپنی محبت کے لیے اسلام قبول کیا تھا۔

لیکن اب اس نے دل کے سکون و قرار کے لیے اس ذات سے رجوع کیا تھا۔ اپنے الفاظ اپنے اعمال کی معافی مانگی تھی۔ گڑگڑا کے توبہ کی تھی۔

باقاعدگی سے قاری صاحب کے پاس جاتا اور اکثر اپنا وقت ان کی قربت میں گزارتا۔

”اسلام کیا ہے، قاری صاحب.....!“

”اللہ پاک کی ذات اس کی وحدانیت پر کامل یقین اور اس رب کی عبادت و اطاعت ہی اسلام ہے۔“

”مجھے اس رب کی ذات پر یقین ہے، مگر وہ اطمینان نہیں، وہ سکون حاصل نہیں ہے جو مجھے آپ کے چہرے پر ملتا ہے۔“

”تمہارے من میں دوسو سے ہیں، انہیں دور کرو، سچے دل سے توبہ کرو۔ بہت سے افراد ایسے ہیں جو بظاہر ایمان رکھتے ہیں مگر

ایمان کے تقاضے پورے نہیں کرتے، تردد کا شکار رہتے ہیں۔ تم نے اسلام اللہ کی رضا کے لیے قبول کیا ہے تو اب رب کو راضی کرو، ایمان کامل رکھو۔“

”قاری صاحب! میں گناہ گار ہوں۔ مجھے راہ دکھائیے کہ کیسے اب رب سے توبہ کروں۔ مجھے اپنے جیسا بنادیں۔“

”بچے! میں تو خود گناہ گار ہوں۔ اس رب کو راضی کرنے کی تگ و دو میں رہتا ہوں۔ تم شرمندہ ہوا اپنی خطاؤں پر۔ اس رب سے

معافی مانگو وہ بڑا معاف کرنے والا ہے اور بخشش کرنے والا ہے۔ وہ تو اپنے بندوں کی مغفرت کے حیلے بہانے ڈھونڈتا ہے۔ کس بندے کو اس سے رجوع کرنا شرط ہے۔“

وہ جیسے جیسے ان کی قربت میں بیٹھتا، جس کی روح کو تسکین ملتی تھی۔ دل کو سکون اور راحت ملتی تھی۔

اسے افسوس ہوتا تھا کہ وہ اب تک کیوں دور رہا ہے اس رب سے، جو تمام جہانوں کا مالک ہے، یکتا ہے، لاشریک ہے۔“

مگر شاید ابھی اس کے صبر کی آزمائش تھی۔

اس کا قریبی دوست اس کے دکھ سکھ کا ساتھی سعد رسول ایکسیڈنٹ میں شدید زخمی ہوا تھا اور محض چند گھنٹوں میں اسے ہمیشہ کے

لیے چھوڑ گیا۔ یہ دکھ تو اس دکھ سے کہیں بڑھ کر تھا جو اسے محبت کی بے وفائی پر تھا۔

”میرے پاس میرے دوست کے علاوہ کوئی رشتہ نہیں تھا قاری صاحب۔ اب میں تنہا رہ گیا ہوں۔“

”اللہ پاک تمہیں صبر جمیل عطا فرمائے۔ اپنے دوست کے لیے دعا کرو اللہ پاک اس کی مغفرت فرمائے۔“ آمین!

اس کڑے وقت میں قاری صاحب کی باتوں نے اسے ہمت و حوصلہ دیا تھا۔ اس کا دل شہر سے اٹھ چکا تھا۔ وہ یہاں سے جانا

چاہتا تھا۔

”اگر تمہیں لگتا ہے کہ ماضی سے وابستہ یادیں بھلانے کے لیے یہ قدم ناگزیر ہے تو ضرور جاؤ۔ اللہ پاک تمہاری حفاظت کرے،

تمہیں امان میں رکھے۔“

”مجھے عمر بھر آپ کی دعاؤں کی طلب رہے گی قاری صاحب!“

اس نے ان کے دونوں ہاتھ تھام کر عقیدت سے آنکھوں سے لگائے۔

”بس ایک بات کہنا چاہتا ہوں احمد ضیاء!“

وہ اسے اسی نام سے پکارتے تھے۔

”ماضی قریب میں جو بھی تمہارے ساتھ ہوا، اسے بھلانا مشکل ہے۔ مگر اللہ کی رضا اور اس کے حکم کو مد نظر رکھتے ہوئے تم اپنے

دل کی تمام سچائیوں سے اس لڑکی کو معاف کر دو۔ اللہ تعالیٰ معاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔“

”وہ تو میں کر چکا ہوں، مگر قاری صاحب! وہ محبت اب بھی دل میں ہے۔“

”اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو صبر کی تلقین فرماتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ رب اس صبر سے تمہارے لیے کوئی خیر کثیر پیدا فرمادے۔“

وہ سر ہلانے لگا تھا۔

اس نے خود کو مکمل بدل لیا تھا۔ اور اب ہر دم یہی دعا مانگتا کہ اس کی حیات ایسی ہو جائے کہ جو معبود حقیقی کو پسند آ جائے۔“

بس سعد رسول کے بعد اس شہر میں من نہ لگتا، لہذا وہ شہر چھوڑ آیا۔ یہاں آ کر ہوٹل میں کب تک رہتا، تو اس نے فی الوقت رینٹ

پر گھر کے لیے تلاش شروع کر دی۔

جہاں اسے درید عباس ملا۔

”بھیا! گھر ملے یا نہ ملے اگر اس کڑا کے کی گرمی اور تیز دھوپ میں اگر مزید تم نے یہ تلاش جاری رکھی تو 1122 والوں کو خبر ضرور

مل جائے گی کہ سڑک پر ایک بندہ بے ہوش پڑا ہے۔“

”کیا مطلب!“

”اندر آ جاؤ، سارے مطلب سمجھاتا ہوں۔ پہلے خشک حلق تر کر لو۔“



اس نے پہلے اسفند کو پانی دیا تھا۔

”شہر میں نئے آئے ہو؟“

”ہوں، صبح مجھے کسی نے بتایا تھا کہ اس علاقے میں ریٹنٹ پر گھر مل جائے گا۔“

”ہوگا، مگر بھیا اتنی دوپہر میں کیوں خوار ہو رہے تھے؟“

”مجھے گھر کی شدید ضرورت ہے۔“

”اگر ضرورت اتنی ہی شدید ہے تو تم ہمارے غریب خانے پر زندگی بسر کر سکتے ہو، جب تک تمہیں قابل قبول گھر نہ ملے۔“

یہاں میرے علاوہ بھی تمہیں تین کارٹون برداشت کرنے ہوں گے۔ اس کے علاوہ کوئی مشکل نہیں ہے بس۔“

ضرورت تو اسے واقعی تھی، اس نے طائرانہ نظر گھر پر ڈالی۔

”چار کمرے، ایک لیونگ، کچن اور مہن شامل ہیں اس گھر میں۔“

”کرایہ اور ایڈوائس۔“

”پاجی! اُسی اپنا سامان چکو، تے آ جاؤ۔ فیر کرایہ بھی منک جاؤ گا۔“

اسفند کو قدم جمانے کے لیے ٹھکانہ درکار تھا۔ اس نے غنیمت سمجھا اور سامان اٹھا کر آ گیا۔

سنہرے کانچ کی سی آنکھوں کے گوشے نم تھے اور ان میں گہری سرخی کی لہر نمایاں تھی۔ درید عباس کو افسوس ہوا۔ کاش وہ لاعلم رہتا،

لا علمی بھی نعمت ہوا کرتی ہے۔ اب اسے وہ الفاظ نہیں مل رہے تھے جن سے وہ اسفند کو حوصلہ دیتا۔

”تجھے اب بھی محبت ہے اس سے؟“

”کیا کروں، بے بس ہوں۔ میری محبت تو سچ تھی ناں درید! میرے من سے وہ محبت نہیں مٹتی۔“

”لا حاصل ہے اسفند ضیاء۔“

”ہاں! مگر مجھے اس سب سے یہ سبق حاصل ہوا کہ عورت ذات ناقابل اعتبار ہے۔“ لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔

”یونو اسفند! یو آ ررائنگ!“

”آئی ایم سرپرائزڈ درید عباس..... یہ تم کہہ رہے ہو جبکہ جس کے دل کو خود ٹھیس اس عورت ذات نے ہی دی ہے۔“

”تو!“ وہ زور سے نفی میں سر ہلانے لگا۔

”اس کی کوئی مجبوری رہی ہوگی کہ وہ مجھے سچ نہ بتا سکی، مگر اس نے ارادنا مجھے ہرٹ نہیں کیا۔“

”اچھا، یہ پھر ہر مہینے کے اینڈ میں سوگ کس بات کا مناتا ہے تو۔“

”کم از کم اس بات کا نہیں کہ وہ غلط تھی یا مجھے چھوڑ گئی، ہاں دکھ ہوتا ہے کہ وہ مجھے نہ مل سکی اور مجھے یقین ہے کہ جیسے میرے دل

میں آج تک آباد ہے، مجھے بھلا وہ بھی نہیں پائی ہوگی۔“

”یو آ رامیزنگ درید عباس۔ ایک لڑکی تمہیں دھوکا دے کر کسی اور کی ہو جائے۔“

”اس نے مجھے دھوکہ نہیں دیا اسفند، میرا دل کہتا ہے۔“

اسنے اسفند کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

”آئی ڈونٹ نو۔ بس اتنا طے ہے درید عباس کہ محبت صرف دکھ دیتی ہے۔

اس کی یہ بات بھی درید کو سچ لگی تھی۔

”ہائے ہائے میرے شرٹ!“

سورے سورے نہال کی دہائی پر اس کی آنکھ کھلی تھی۔

”خدی قسم ویک اینڈ اتنا اچھا گزرا اور پھر آج سورے ہی سورے سچ شروع ہو گئی۔“ ٹیبل پر ناشتہ لگاتے درید کی جھنجھلائی

آواز آئی۔

”ڈونٹ وری! ہم تمہاری جان نہیں چھوڑنے والے۔“

بلال نے عالمی ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا۔

”پتہ ہے مجھے، بے غیرتی کے مقابلے میں سیکنڈ پرائز تو نے ہی جیتا تھا۔“ اس نے پانی سے بھرا جگ ٹیبل پر چٹا۔

”ہائیں، سیکنڈ..... فرسٹ پرائز کس کو ملا تھا درید بھائی۔“

طلال جواب تک بے نیاز بنا بیٹھا تھا، اشتیاق سے بولا۔

”آف کورس تجھے۔“ اور یہ سن کر تلال منہ بسورنے لگا تھا۔

”حد ہو گئی ہے، کوئی میرا دکھڑا سن ہی نہیں رہا۔“ نہال نے واویلا مچایا۔

”میاں کبھی کبھار ہو تو کان بھی دھریں۔ تم نے تو لڑاکا بیویوں والا وطیرہ ہی اپنا لیا ہے۔ صبح سے دہائیاں دیتے ہوئے رات ہو

جاتی ہے۔“ درید نے لا پرواہی سے کہا۔

”طلال نے میری شرٹ جلا دی ہے۔“ نہال نے روہنسی لہجے میں کہا تھا۔ بلال نے تلال کو گھورا۔

”بائی گاڈ! ارادتا نہیں جلائی۔ بس استری کو زیادہ ہی محبت تھی اس کی شرٹ سے۔ ایسے چمکی عمران ہاشمی کی طرح اترنے کا نام ہی

نہیں لیا۔“

”ہاں تجھے جس دن بھی استری کرنی پڑ جائے ایسا ہی ہوتا ہے۔“

وہ غصے سے لال پیدا ہوتا اندر مڑ گیا۔ دوسری شرٹ استری کر کے پہنی اور بنانا شستے کے چلا گیا۔



”کتنی غلط بات ہے۔ وہ بنانا شتے کے چلا گیا۔“

”اسفند اٹھ تو چکا تھا نہال کی آواز پر، اب آیا تو وہ تینوں اطمینان سے ناشتہ کر رہے تھے۔“

”روٹھی حسیناؤں جیسے نخرے ہوتے ہیں اس کے صبح میں منانے کا نام نہیں ہوتا۔“

”لیکن زیادتی تو طلال نے کی ہے ناں! کالج کی شرٹ جلا دی اس کی۔“

”بیلو می بگ بی..... جان کر نہیں جلائی۔“

”کم از کم بلال تجھے زبردستی کچھ کھلانا چاہیے تھا۔“

”مغز نہیں الٹا تھا میرا، جو میں اپنا ناشتہ بھی حرام کرتا۔“

بلال ویسے ہی ان کے جھگڑوں سے عاجز تھا۔ اسفند نے تاسف سے سر ہلایا۔

”اور میری ہاف وائف اب نصیب سے جلدی اٹھ گیا ہے تو ناشتہ کر لے۔“

درید عباس اکثر اسے یوں چھیڑتا تھا۔

”بک نہیں۔“ اس نے درید کو گھورا۔

شام تک اسے نہال کا خیال رہا تھا، تب ہی واپسی پر اس کے ہاتھ میں نئی شرٹ تھی جو اس نے نہال کو تھمائی تھی۔

”تھینکس اسفند بھیا!“

”واہ! کبھی ہم پر بھی نظر کرم ڈال دیا کریں بگ بی۔“

طلال نے فوراً ہی ٹوکا تھا۔

مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔



”طلال! اگر اب تو نہیں بیٹھاناں تو تجھے چھت سے نیچے پھینک دوں گا۔“ درید نے نیچے جھانکتے ہوئے طلال کو دھمکی دی تھی۔

”ایویں انرجی ویسٹ کر رہے ہو بھیا جان ٹیسی۔ اینوں لگتی کوئی نہیں، بے غیرتی وچ ڈپلومہ ایویں نہیں کیتا۔“ نہال نے گلے

ہوئے کہا۔

”طلال! دس از لاسٹ وارنگ۔“

”کیا ہے یار؟؟ خود تو گھٹ گھٹ کر زندگی گزار رہے ہو، مجھے تو لائف کا مزہ لینے دیں۔“

”یہ ہی حال رہا نا تیرا، چھت پر داخلہ ممنوع کر دوں گا میں۔“ درید نے سنجیدگی سے کہا۔

”طلال بات مانتے ہیں یار، شریفوں کا محلہ ہے، ضروری ہے کہ کہیں سے کمپلین آئے گی تو تب ہی مانو گے۔“

”یار! میں نے کیا کیا ہے، میرے کھڑے ہونے سے کیا کمپلین آئے گی۔“

”تم اچھی طرح جانتے ہو کہ گرمی کی شام میں اکثر لوگ چھت پر ہوتے ہیں۔“

”مانا کہ ٹین اتاج میں مخالف صنف کی جانب متوجہ ہونا نچرل سی بات ہے مگر تمہارا طریقہ غلط ہے۔“

”بگ بی! آپ کے خیال میں صرف میں غلط ہوں۔ کس دور کی بات کر رہے ہیں آپ! اب لڑکیاں خود آفر کرتی ہیں لڑکوں کو،

آپ نہیں جانتے۔“

وہ نروٹھے پن سے بولا۔

”تم سے کہیں زیادہ ایڈوانس ماحول میں لائف گزاری ہے اس نے۔ اگر سمجھانے کی کوئی بات کر رہا ہے تو سن لے۔“ درید نے جھڑکا۔

”آئی نو! آنے والے وقت میں حیا اور وقار صنف نازک میں بھی نایاب ہو جائیں گے۔ بٹ ینگر برادر! انسان کو اپنی نظر کی

حفاظت خود کرنی چاہیے۔

”ویری سوری بگ بی! بٹ کیا کروں، آپ میرے آئیڈیل انسان ہیں مگر میں آپ جیسا نہیں بن سکتا۔“ طلال نے معذوری

بیان کی۔

”قصورتیرا نہیں، تیری عمر کا ہے۔“

”ٹنسی اب بڑھے ہو گئے ہوجی۔“

”روح بڑھی ہے، آپے تے ایسے سوہنے ہو۔“ نہال نے گوہرافشانی کی۔

”یو آ رامپاسبل!“ اسفند چڑ گیا۔

”ٹنسی خفا ہو گئے۔“

”نہیں، میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اپنی پڑھائی پر توجہ دو، کن چکروں میں پڑ گئے ہو۔“

”آپ محبت پر بہت یقین رکھتے ہیں بگ بی!“

”تمہیں لگتا ہے کہ جو تم کر رہے ہو وہ محبت ہے!“

”نہیں، لیکن مجھے درید عباس کی طرح پہلی نظر کی محبت پر قطعی یقین نہیں ہے۔ میرے خیال سے انسان کو اچھی طرح سمجھ کر ایک

دوسرے کو جان کر محبت کرنی چاہیے۔“

”محبت نہ ہوئی پلاننگ ہو گئی۔“

”لائف پلان کرنے کا نام ہی تو محبت ہے۔ زندگی بھر کا سودا ہوتا ہے۔“ طلال نے بحث بڑھائی۔

”محبت ہوتی وہ ہی ہے جو پہلی نظر میں ہو۔“

”پتہ چلے محترمہ کہیں اور کمیڈ ہوں پھر! بندہ تین چار لڑکیاں نظر میں رکھے، پھر سیلیکٹ کرے۔“

”لڑکی کیا ہوئی شرٹ ہو گئی جودل کو بھائی پھینک دیں۔“

”میرے نزدیک عورت کی عزت و احترام زیادہ مقدم ہے۔ جس شخص کی نظر میں عورت کا احترام ہوگا وہ یہ سوچ کبھی نہیں رکھے گا۔ محبت کرنا بھی ہر کسی کے بس کا روگ نہیں طلال، یہ بھی بڑے دل والے ہی کر سکتے ہیں۔ ہر لڑکی پر عاشق ہونے والے نہیں۔“

درید کو موضوع سنجیدہ کر گیا۔

”کیا ملا آپ کو محبت کر کے؟ نہیں کرنی مجھے ایسی محبت جس کی وجہ سے میں باقی ساری محبتیں فراموش کر دوں۔“

”اب تم پر نسل ہو رہے ہو۔“ درید نے ٹوکا۔

”غلط تو نہیں ہوں ناں!“

”او کم آن یار! اسٹاپ اٹ۔“

اسفند نے دونوں کو روکا تھا مگر درید سخت موڈ آف کیے اٹھ گیا۔



جانے لوگ کیسے کہہ دیتے ہیں محبت سوچ سمجھ کر اور پرکھ کے بعد کرنی چاہیے۔ اس کے نزدیک یہ محبت نہیں، پلاننگ ہوتی ہے۔“

”محبت تو وہ اثر ہے جو اچانک دل پر ہوا اور دھڑکنیں منتشر کر دے۔“

”روح کو سرشار کرنے والا وہ جذبہ جو کسی بھی لمحہ دل میں اتر جائے اس کی تیاری نہیں کی جاتی۔ پہلے سے ارادہ نہیں باندھا جاتا۔“

”اور اگر یہ جرم ہے تو وہ پورے دل سے اقرار کرتا ہے کہ اس نے یہ جرم کیا ہے۔ اس نے پہلی نظر کی محبت کی ہے۔“

وہ سردیوں کی نرم گرم سی دوپہر تھی۔ دو ہفتوں کی سخت سردی اور دھند کے بعد آج سورج سویرے ہی مہربان ہوا تھا۔ اور تمام لوگ

دھوپ کی اس نعمت (سردیوں میں دھوپ نعمت لگتی ہے) سے بھرپور فیض اٹھا رہے تھے۔ وہ بھی فارغ تھا، سو آج دھوپ انجوائے کرنے کا نیا

طریقہ اپنایا تھا۔ کرسی اور ایک اسٹول اٹھا کر گھر کے باہر آ بیٹھا۔ کرسی پر بیٹھ کر ٹانگیں اسٹول پر پھیلائیں۔ اس سے دو سال بڑا بھائی یا سر

عباس بھی کیوں لے کر وہیں آ گیا۔

”کیوں صرف آج مزے دار لگے ہیں۔“

وہ دونوں بھائی ہلکی پھلکی شوخیوں کے ساتھ کیوں کھا رہے تھے۔ دو سال بڑا ہونے کے باوجود یا سر سے اس کا مذاق چلتا تھا۔

”آپس کی بات ہے، یہاں بیٹھ کر دھوپ اور آنکھیں دونوں سینک رہے ہوتی۔“

اس نے پل بھر کی چوری بھی پکڑ لی تھی یا سر کی۔

”مجھے جیسے شریف آدمی پر اتنا بڑا الزام!“

”الزام نہیں، میری دو گناہ گار آنکھیں گواہ ہیں۔ ابھی جو ریڈ اور بلیو ڈریس میں براؤن بالوں والی لڑکی گئی ہے، آپ نے اسے پٹانے کی کوشش کی۔ آپ کی نظروں نے دور تک اس کا پیچھا کیا۔ اس کے یا تو تلی لبوں پر پنک لپ سٹک تھی۔“

”اچھا!“ یاسر نے دو جھانپڑ لگائے تھے اس کے۔“

”میں نے سرسری نظر ڈالی۔ مجھے بدنام کرتے ہو، خود پورا پوسٹ مارٹم کر کے بیٹھ گئے۔“

”ارے میں نے ایسا کچھ نہیں کیا، وہ تو اس کی نیلی کانچ سی آنکھیں پل بھر مجھ پر کیوں تو میں نے بھی دیکھ لیا۔“

اس نے ڈھٹائی سے ہنسی نکالی۔ یاسر دو چار ہاتھ مزید اس کے جڑ تاٹاٹھ گیا اور پھر سے پھیل کر بیٹھ گیا۔

وہ آج شرط لگا کر بیٹھا تھا کہ سورج جائے گا تو وہ اندر جائے گا۔ امی نے دوبارہ کھانے پر بلایا تو وہ نہیں گیا۔

”اندر آؤ گے تو کھانا ملے گا۔ فقیروں کی طرح دروازے پر نہیں دوں گی۔“

وہ جی اچھا کہہ کر آنکھیں موند کر دھوپ کے مزے لینے لگا۔

قریباً ڈھائی بجے کا ٹائم تھا جب نیند کا غلبہ زور سے آیا اور وہ کرسی سے نیچے گرتے گرتے بچا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں..... جسم پر سستی سی چھا گئی تھی۔ مگر اچانک نیند کے جھٹکے سے اس نے آنکھیں جو کھولیں تو اسے لگا بالکل رائٹ ٹائم پر اس نے دیدے واکھے تھے۔

وائٹ کالج کے یونی فارم میں جو دو شیزہ اسے سامنے دکھائی دی تھی وہ اس کی نظریں ساکت کر گئی تھی۔ حالانکہ اس کا چہرہ بالکل سادہ تھا۔ وائٹ دوپٹے کے ہالے میں سنہری گندی چہرے میں جو کشش تھی وہ آج سے پہلے ہزاروں چاند چہرے دیکھ کر بھی اسے محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس کی کنورہ سی بڑی بڑی آنکھوں میں ناگواری تھی اس کے لیے جو ہونقوں کی طرح اسے گھور رہا تھا اور جب تک وہ ان کے گیٹ سے اگلے گیٹ کو کراس کر کے اندر نہیں گئی درید عباس کی نگاہیں اس پر ہی جمی رہیں۔

کتنی حیرت انگیز بات تھی، اس کے پڑوس میں دنیا کی سب سے پیاری لڑکی رہتی تھی اور وہ بے خبر تھا۔ اب اسے دھوپ میں بھی کشش محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ تب ہی وہ کرسی اور اسٹول اٹھا کر اندر آ گیا اور امی کے پاس صحن میں ہی چار پائی پر پھیل گیا۔ مگر اس کے ذہن سے لمحہ بھر کو بھی وہ چہرہ کو نہیں ہوا تھا۔ بڑی عجیب سی بات تھی کہ ایک سادہ سا چہرہ اس کے حواسوں پر چھا گیا تھا حالانکہ اس سے کہیں زیادہ خوبصورت وہ ریڈ ڈریس والی لڑکی تھی جس کے حوالے سے وہ یاسر کو چھیڑ رہا تھا۔ پھر بھی وہ محض چند منٹ بعد ہی ذہن سے نکل گئی تھی۔

یہ تو ذہن سے چپک کر ہی رہ گئی تھی۔

”ہمارے محلے میں نئے لوگ آئے ہیں امی۔“

رات کے کھانے پر وہ امی سے پوچھ رہا تھا۔ امی کے ساتھ ساتھ یاسر اور ابو نے بھی بہت حیران ہو کر اسے دیکھا تھا۔

”بچے، جو تمہارے حالات ہیں کچھ دنوں میں تمہیں اپنے گھر میں رہنے والے لوگ بھی نئے لگیں گے۔“

امی ہمیشہ ہی اس کی عادت سے نالاں رہتی تھیں کہ وہ صرف اپنی ذات میں مگن ہو کر جیتا تھا۔ گھر میں، پڑوس میں، محلے میں کیا ہو



رہا ہے، اسے کچھ خبر نہ تھی۔

”ہمارے محلے میں تو دو سال سے نئے لوگ نہیں آئے، تم پڑوس کی بات کر رہے ہو۔“

”یہ جو ہمارے ساتھ والا گھر ہے براؤن گیٹ والا.....“

”اعجاز بھائی کا ہے۔ چھ سال ہو گئے ہیں انہیں یہاں آئے۔ ایڈووکیٹ ہیں۔ بہت اچھی فیملی ہے۔“

”مجھے نہیں پتا تھا۔“

”اپنی ذات سے نکلو گے تو پتا چلے گا ناں! عمر بھر یہ تعلقات، یہ رشتہ داریاں ہم نے ہی نہیں نبھانی۔ آج ہیں، کل کا کیا پتا۔ آنکھیں بند کر کے جس طرح تم زندگی گزار رہے ہو، یہ غلط ہے۔ دو بھائی ہو تم، جو ہماری کل کائنات ہو۔ یا سر سے ہمیں کوئی گلہ نہیں ہے مگر تم نے کبھی گھر کو وقت دیا۔“

”تمہیں تو یہ تک علم نہیں ہوتا کہ تمہاری امی کی طبیعت کس قدر خراب رہی ہے۔“

امی کے ساتھ ساتھ ابو نے بھی آج اس کی خبر لی تھی۔

”مجھ سے سارا وقت گھر میں ٹک کر نہیں بیٹھا جاتا۔ یہ میرے مزاج کا حصہ نہیں ہے۔“

”سچ کہا۔ آج قسمت سے گھر میں تھے تو گلی میں ڈیرے ڈالے بیٹھے رہے ہو۔ میں کہتی ہوں کب جائے گی تمہاری لا پرواہی۔“

شادی کی عمر ہو چکی ہے تمہاری..... اور اگر یہی حالات رہے تو میں ہر گز کسی معصوم لڑکی کو لا کر عمر بھر بد دعائیں نہیں سمیٹ سکتی۔ تم نے تو اس کی خبر نہیں لی۔“

”چار دن ہوئے ہیں میری نوکری کو، آپ کو شادی کی پڑگئی ہے۔ یہ جو دو سال سے جاب کر رہا ہے اس کی کر دیں۔“

وہ چڑ گیا تھا۔ اس لیے کچھ لاڈ لاکھا اور بقول یا سر کے بد تمیز بھی۔

”ہاں تو کر رہی ہوں ناں! تمہیں تو یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ تمہارے بھائی کی بات طے ہو گئی ہے۔“

”اس گھنے نے مجھے بتایا کب ہے۔“ اس نے کھسکا کر کہا۔

”شاباش! تم گھر میں رہتے ہو اور یہ تمہیں بتائے گا۔“

ابو نے اسے شرمندہ کیا..... اسے قدرے افسوس بھی ہوا کہ وہ ضرورت سے زیادہ ہی لا پرواہ ہے۔ مگر وہ کیا کرتا، اس کی نیچر ہی

ایسی تھی۔ خیر یا سر کی منگنی طے ہو گئی تھی اور دن اسے یاد تھا۔

اس منگنی سے اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اس کی میرب اعجاز سے جان پہچان ہو گئی۔ بے تکلفی تو خیر نہیں، مگر بات چیت ضرور ہوئی تھی۔

وہ فوراً تھ ایر کی اسٹوڈنٹ تھی۔ پُر خلوص، ملنسار اور سادہ مزاج۔ درید عباس تو اس کے سادہ مگر پُر کشش چہرے کا ہی دیوانہ ہو چکا تھا۔ اس کے لیے یہ ہی بہت اچھا تھا کہ میرب اعجاز ایڈووکیٹ اعجاز عارف کی بیٹی تھی۔ ان کے پڑوس میں رہتی تھی اور بس۔ اس سے زیادہ جاننے کی



اس نے سعی کی نہ اسے ضرورت تھی۔

”آپ کو میرا نمبر کہاں سے ملا۔“

پہلی بار جب اس نے یا سر سے اس کا فون نمبر لے کر فون کیا تھا تو وہ حیران رہ گئی۔

”یا سر سے، کیا تمہیں بُرا لگا۔“

”نہیں تو، بس.....!!“

یہ اس کی پہلی کال تھی۔ پھر وہ اکثر آفس سے آ کر شام میں اسے کال کر لیتا تھا۔ بات ہمیشہ وہ مختصر کرتی تھی۔ کال صرف وہ کرتا تھا۔ میرب نے کبھی اسے کال نہیں کی تھی مگر اتنا جانتا تھا کہ ان میں اچھی انڈر سٹینڈنگ ہو گئی تھی۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ میرب کے لیے وہ کیا ہے۔ مگر وہ میرب اعجاز کو دل کی تمام شدتوں سے چاہنے لگا تھا۔

اسکی سحر کا آغاز اور دن کا اختتام میرب اعجاز سے ہونے لگا تھا۔

”آج کالج نہیں گئیں۔“

”اول ہوں۔“

اس کی آواز میں تازگی نہیں تھی۔

”تم ٹھیک تو ہو میرب!“

”ہاں! میں بڑی تھی۔ گھر میں کچھ گیسٹ آئے ہوئے ہیں۔“

اس نے ٹالا، حالانکہ درید اندازہ لگا گیا تھا کہ وہ کچھ چھپا رہی تھی۔

”تم ٹینس ہو!“

”کچھ پرسنل پرابلم ہیں بس۔“

اس کا مطلب ہے کہ تم مجھے اس قابل بھی نہیں سمجھتیں کہ اپنے پرابلمز شیئر کر سکو۔“ اس نے افسوس سے شکوہ کیا۔

”شاید ابھی آپ سے شیئر نہ کرنا میری مجبوری ہو۔“

اس کے لہجے میں مان تھا۔

”اوکے، ایز یو وِش۔“

اس نے بنا خفا ہوئے سہولت سے فون بند کر دیا تھا۔

دو تین دن وہ بھی مصروف رہا جو اس نے میرب کو کوئی ٹیکٹ نہیں کیا۔ مگر اس دن دوپہر میں وہ جلدی گھر آ گیا تب ہی راستے میں

میرب بھی کالج سے آتے ہوئے اسے ملی تھی۔

درید نے قطعاً راستے میں اسے مخاطب نہیں کیا مگر گھر آ کے پہلا کام اسے کال کی تھی۔  
 ”میں نے ابھی ابھی تمہیں دیکھا ہے، تم بہت ڈسٹرب لگی ہو۔“  
 ”ہاں!“ اس نے اعتراف کیا تھا۔

”کیا وجہ ہے.....؟“

اس نے پوچھا اور وہ بتاتی بھی، مگر تب ہی اسے میرب کے پیچھے بہت تیز آوازیں سنائی دی تھیں۔  
 ”درید میں خود آپ کو کال کرتی ہوں، ابھی پلیز کچھ۔“  
 ”نیور مائنڈ۔“ اسے خود تشویش ہوئی تھی کہ پراہلم کیا ہے۔  
 ”خفا تو نہیں ہوئے۔“

”کم آن میرب! جنہیں چاہا جاتا ہے ان کے دکھوں اور پریشانیوں کو سمجھنا بھی انسان پر فرض ہے۔“  
 ”تھینکس.....“

میرب نے فون بند کر دیا مگر وہ الجھ گیا۔ اس کے پیچھے جو چیخنے کی آوازیں تھیں اور اس الجھن کو امی سلجھا سکتی تھیں۔  
 ”امی! اعجاز انکل کے گھر میں کوئی ٹینشن ہے۔“

بات تو بے ہوش ہونے والی تھی۔ ان کا بیٹا اپنی ذات سے نکل رہا تھا۔ ماں خوش تھی۔

”ہاں بس! لڑکیوں کے ماں باپ بھی عمر بھر فکر مند رہتے ہیں۔ اللہ پاک تمام بیٹیوں کے نصیب اچھے کرے۔“  
 امی تو اسے مزید الجھن میں ڈال گئیں۔

”کیا ہوا، مسئلہ حل نہیں ہوا۔ اعجاز بھائی کا۔“ ابو بھی شریک گفتگو ہو گئے۔

”آئے ہوئے ہیں بچی کے سسرال والے۔ عمران بھی آیا ہے۔ اللہ پاک لڑکے کو ہدایت دے۔“  
 امی اس کی ساری حسیں بیدار کر گئی تھیں۔ بچی کے سسرال والے کہہ کے۔

”پھول سی بچی مر جھا کے رہ گئی۔“ امی تاسف سے سر ہلانے لگیں۔

”آپ بھی خبر لے لیا کریں۔ اعجاز بھائی پوچھ رہے تھے آپ کا۔“

امی ابو سے مخاطب ہو گئیں اور درید عباس پر سانسیں بھاری ہونے لگیں۔ اسے جانے کیوں انہونی کا وہم ستانے لگا۔ وہ امی سے

تو کچھ نہیں پوچھ سکا، ہاں رات میں یا سسرے ایویں سرسری سا ذکر چھیڑا تو اس پر تمام راز کھل گیا۔

”اعجاز انکل کی بیٹی نے لومیرج کی تھی اپنے کزن سے..... مگر چھ ماہ بعد ہی گھر میں جھگڑے شروع ہو گئے اور تقریباً سال بھر سے

وہ یہیں ہے۔ اب سنا ہے کہ اس کا شوہر اور سسرال والے آئے ہیں اسے لینے۔“

”وہ تو پڑھ رہی تھیں ناں!“ درید نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔

”اس کی تعلیم ادھوری رہ گئی تھی، پھر اس نے وقت بھی تو گزارنا تھا۔ بہت پریشان رہی ہے وہ۔“

مزید کچھ پوچھنا بے کار تھا۔ اس کی آنکھوں میں مرچیں سی لگنے لگیں۔

”او کے یار! میں تو سونے جا رہا ہوں، نیند آ رہی ہے۔“

وہ یا سر کو نال کر کمرے میں آ گیا۔

”میں انجان تھا۔ کم از میرب مجھے بتا کر میرے بڑھتے قدم روک دیتی۔ عورت کتنی ہی سادہ مزاج ہو، خود پر اٹھنے والی نگاہ کا

مفہوم جان لیتی ہے۔ میرب میرے احساسات سے انجان نہیں تھی۔

غلطی میری ہے۔ میں نے کبھی میرب کے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کی۔ اس سے کبھی اس کی ذات کے حوالے سے اس

کی فیملی کے حوالے سے کچھ نہیں پوچھا۔

شاید میں نے اپنی غلطی سے یہ ٹھیس کھائی ہے۔

بس محبت کا یہ روگ ایسا لگا کہ اس کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا۔ وہ تو بھرے گھر میں رہ کر ہمیشہ صرف اپنی ذات میں مگن رہا، مگر

اب تو جانے اس پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔

اس نے حقیقت جاننے کے بعد دوبارہ میرب سے رابطہ کرنے کی کوشش نہ کی۔ البتہ پہلی بار میرب نے اسے خود کال کی تھی جو اس

نے بنا اٹینڈ کیے کاٹ دی تھی۔

ایک محبت ان تمام محبتوں پر ایسی حاوی ہوئی کہ اس نے اپنا گھر، ماں باپ، بھائی شہر تک چھوڑ دیا اور پچھلے دو سال سے وہ یہاں تھا۔

فون پر رابطہ بھی گھر والے خود کرتے تھے اور جس دن بات ہوتی تھی ان سے درید عباس کے من میں پہلی نظر کی محبت پھر بین کرنے

لگتی۔ اس کے دل میں میرب اعجاز آج بھی اسی مقام و مرتبے پر تھی۔ نہ محبت کم ہوئی تھی نہ عزت۔ بس ایک پہلی تھی جو وہ سلجھا نہ سکا۔ ایک بات

تھی جو دو سال سے اسے الجھا رہی تھی کہ جب میرب نے لو میرج کی وہ اپنے گھر واپس چلی بھی گئی تو وہ کیوں اسے کال کرتی تھی۔ میرب نے ان

دو سالوں میں کئی بار اسے کال کی تھی، جو اس نے اٹینڈ نہیں کی اور اس کا ایس ایم ایس تو آج بھی اس کے ان باکس میں Saved تھا۔

وہ کیوں اس سے بات کرنا چاہتی تھی۔ وہ کیا کہنا چاہتی تھی!“

مگر سونے سے پہلے وہ ایک بار اس کا میج ضرور ریڈ کرتا تھا۔

”Where are you?“۔ آپ کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ پلیز کال می۔“

اس کے الفاظ درید عباس کی سب سے بڑی الجھن ہے۔“



وقت نے دھیرے دھیرے انہیں قریب کر دیا۔ وہ ایک دوسرے کے دکھ سے واقف تھے، سمجھتے تھے بلکہ اسفند ضیاء کو تو لگتا تھا کہ وہ چاروں ہی اس کے لیے اہم بنتے جا رہے ہیں۔

”یک نہ شد دوشد، بگ بی! آپ بھی نہال کو فیور کرتے ہیں۔ مجھ سے بھی پیار کر کے دیکھیں، میں بھی برا نہیں۔“

”تجھے پیار کرنے والیاں بہت ہیں، ہمارے پیار کی تجھے ضرورت نہیں۔“ درید نے فوراً کہا تھا۔

”کل کس کو لیے بانیک پر گھوم رہا تھا۔“

”اتنا بڑا الزام میری شرافت پر۔“ احتجاج کروں گا، دھرنادوں گا۔“ طلال نے چلا کر کہا۔

”چھتر بھی کھائے گا۔“ بلال نے تازا۔

”ایویں ہمارے ہاں دھرنے کا رواج عام ہے۔ ہمیشہ دھرنے دیے والوں کی مافی جاتی ہے۔“

”تجربہ کر کے دیکھ لے پھر۔“ درید نے اکسایا۔

”نہ بابا..... اکثریت میری مخالف ہے، اقلیت کو ہمیشہ مار پڑتی ہے۔“ وہ ڈر گیا۔

”کا کا سمجھدار ہو گیا۔“

”اس ملک کا بچہ بچہ سیاست میں ہی سمجھدار ہے کیونکہ اسے ایک ہی سبق پڑھنے کو ملتا ہے، سیاست، سیاست، سیاست۔“

”اس ملک کے بچے ہی تو نا سمجھ ہیں، انقلاب ہمیشہ نوجوانوں نے برپا کیا ہے مگر آج کا نوجوان کیا سوچتا ہے؟“

”یہ ہی کہ اس کی گرل فرینڈ کی تعداد اس کے دوست سے کم کیوں ہے۔ اس نے کونٹیکٹ میں لڑکیوں کے نمبر کی گنتی کم

ہے۔ ہمارے ملک میں ہر چیز کا استعمال غلط ہوتا ہے چاہے وہ موبائلز ہوں یا انٹرنیٹ۔“

”مجھ پر ڈائریکٹ اٹیک نہ کریں، یہ سارے معاشرے کا المیہ ہے۔“ طلال نے کہا۔

”ہم سارے معاشرے کی ہی بات کر رہے ہیں۔“

”معاشرہ سدھارنا حکمرانوں کا کام ہے، ہمارا نہیں۔“

”یہ ہی خامی ہے ہمارے اندر طلال، تبدیلی اپنی ذات سے شروع ہوتی ہے۔“

اسفند نے رسان سے سمجھایا۔

”لگتا ہے آپ کو اس ملک میں تبدیلی آ سکتی ہے جس ملک میں ساٹھ سال سے چہرے تبدیل نہیں ہوئے جہاں حکومت وراثت

سمجھ کر کی جاتی ہے۔ جہاں تعلیم و شعور کا فقدان ہے۔“

”اور یہ شعور کون آ کر بیدار کرے گا ہم میں۔ اب اقبال نہیں آئے گا جوانوں کو جگانے۔ یہ شعور ہمیں خود بیدار کرنا ہوگا اپنے

اندر تبدیلی ہمیشہ اپنی ذات سے شروع ہوتی ہے۔“

”اوگاڈ! کس بحث میں پڑ گئے یار، چینج دی ٹاپک۔“ طلال نے کہا۔

”کب سدھرے گا طلال تو.....“ اسفند نے اسے گھورا۔

”خدا کی قسم اگر آپ ساتھ رہے تو وہ دن ضرور آئے گا۔“

طلال واقعی اسے آئیڈیالائز کرتا تھا۔ اس کی مقناطیسی شخصیت سے بہت انپائر تھا وہ۔

”کوئی مرد اتنا وجہ ہو کہ لڑکیاں اس پر مرتی ہوں اور اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ کا راستہ بہت اچھا ہے۔ اللہ مجھے بھی ہدایت دے۔“

”چنگا مکھن لگا دیا۔“

نہال کی زبان پر کھجلی ہوئی۔ اسفند مسکرا دیا اور طلال چڑ کے نہال کو مارنے لگا تھا۔



اتنا گہرا ملال درید عباس کے چہرے پر پہلی مرتبہ تھا۔ اسے وقتی دورہ تو پڑتا رہتا تھا مگر دو دن گزرنے کے بعد بھی اس کے چہرے پر وہی کیفیت تھی۔

”سیریس میٹر ہے کوئی، تو کبھی اتنا اداس نہیں ہوتا۔“

”اسفند..... ابو کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔“

”واٹ؟ اور تو اب تک یہیں بیٹھا ہے۔“

اسفند نے تاسف سے اسے دیکھا جس کے چہرے پر کرب جھلک رہا تھا۔

”وہاں جانے کا حوصلہ نہیں پڑتا یار۔“

”ایک لڑکی کی محبت اتنی حاوی ہے تم پر..... کہ تم نے جہنم دینے والے ماں باپ، اپنا گھر ہر رشتہ چھوڑ دیا۔ خوش نصیب ہو درید

عباس کہ یہ نعمت میسر ہے۔ سر پر دعائیں دینے والی ماں کا سایہ، باپ کی پُر شفقت نگاہیں اور تمہارے لیے تڑپنے والا بھائی ہے۔ شکر ادا کرو

اس رب کا جس نے اتنا نوازا ہے تمہیں اور صبر کرو اس پر جو تمہارا نصیب نہیں تھی۔“

اسفند نے قدرے سختی سے اسے ڈانٹا تھا۔

”کیسی اولاد ہو تم تمہارے ابو تکلیف میں ہیں اور تم یہاں بیٹھے ہو۔“

”مجھے خبر ہے نا کیسے خود پر جبر کر کے بیٹھا ہوں۔“

”وائے کس نے کہا ہے..... جبر کرنے کو..... اٹھو تیاری پکڑو۔“

اسفند نے اسے جیسے جھنجھوڑا تھا۔ درید عباس اگلے لمحے بیگ تیار کر رہا تھا۔ اسفند اسے خود اسٹیشن چھوڑنے گیا تھا۔

”سفر میں زیادہ ٹینشن نہ لینا۔ گھر پہنچ کر اپنی اور انکل کی خیریت ضرور بتانا مجھے۔“



”اپنا خیال رکھنا، اوکے۔“

”اوکے مائی ہاف وانف۔“

”بڑا کمینہ ہے تو۔“

اسفند نے مسکرا کے اسے گلے لگایا تھا۔ جانے کیوں اسے درید عباس میں سعد رسول نظر آتا تھا۔ تب ہی تو وہ اتنا قریب آ گیا تھا اس کے۔“

شام میں گھر سونا لگا تو اس نے لائبریری کا رخ کر لیا۔ اچھی کتابوں کا مطالعہ اس کی عادت بن گئی تھی۔ وہ اکثر ہی یہاں آ جاتا تھا۔

”آپ یہیں بیٹھ کر مطالعہ کریں ہم یہ کتاب آپ کو ایڈیٹ نہیں کر سکتے۔“

وہ پچھلے پانچ منٹ سے اس لڑکی کے ساتھ لائبریری انچارج کی بحث من رہا تھا۔

”میں یہاں نہیں بیٹھ سکتی، پلیز!“

”ایم سوری بی بی! ہماری بھی مجبوری ہے۔“

اس نے صاف انکار کر دیا۔ لاچار وہ لڑکی خاموشی سے کتاب لیے وہیں بیٹھ گئی مگر اس کے چہرے پر ملال سا تھا۔ اسفند نے کئی

بار اس لڑکی کو لائبریری میں دیکھا تھا۔ وہ یہیں بیٹھ کر اپنے نوٹس بناتی تھی۔ آج اس کی کوئی مجبوری ہوگی جو وہ کتاب لے کر جانا چاہتی تھی۔

انسانی ہمدردی کے تحت اس لڑکی پر ترس سا آیا تھا۔ اس کی نظر لمحہ بھر کو اٹھی، پھر وہ اپنی کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”ایکسیوزمی.....“

ابھی چند منٹ گزرے تھے کہ وہ آواز پر چونکا۔ وہ ہی لڑکی اس کے سامنے تھی۔

”ایم سوری! ہے تو غیر اخلاقی حرکت، مگر مجھے یہ کتاب چاہیے تھی۔ مجھے اسائنمنٹ مکمل کرنا ہے۔“

”شیور، وائے ناٹ۔“ اسفند نے کتاب بند کر کے اسے تھما دی مگر اسے یہ پتا چل گیا وہ تاریخ اسلام پر اسائنمنٹ بنا رہی ہے۔

”تاریخ اسلام کی سٹوڈنٹ ہیں آپ!“

ایک عرصے بعد وہ کسی صنف نازک سے مخاطب تھا۔

”جی!“ مختصر سا جواب دے کر وہ اس سے دوکرسیاں چھوڑ کر بیٹھ کر لکھنے لگی تھی۔

”میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں.....؟“

”آ.....!!“

لڑکی نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا۔

”جی! کیونکہ مجھے اسلامی ہسٹری بہت پسند ہے۔“

”ریلی!“ ایک اشتیاق تھا جو اس کے معصوم چہرے پر اتر تھا۔

اس نے پیڈ اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔

”مجھے آج جلدی گھر جانا ہے، میری ماما کی طبیعت خراب ہے۔“ وہ خود ہی بتانے لگی۔

”آپ کو ٹرسٹ ہو تو آپ چھوڑ جائیں، میں مکمل کر دوں گا۔“

”جھینکس! میری ماما کیلی ہیں ہاسپٹل میں، مجھے ان کے پاس جانا ہے۔“

”اللہ آپ کی ماما کو صحت کاملہ عطا کرے۔ آپ فکر نہ کریں جائیں۔“ اس نے ہمدردانہ لہجے میں کہا تھا۔



دو سال کے بعد اپنے گھر میں قدم رکھا تھا مگر یہاں آ کر ایسا لگا کہ دو سال کہیں درمیان آئے ہی نہیں تھے۔ گلی سے لے کر گھر تک کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ آج بھی براؤن گیٹ کے باہر اعجاز عارف ایڈووکیٹ کے نام کی پلیٹ نمایاں تھی۔ وہ لب کچلتا اندر آ گیا۔ صحن میں ہر چیز یوں ہی رکھی تھی جیسے وہ چھوڑ کے گیا تھا۔ گلوں کی تعداد اور ترتیب تک نہ بدلی تھی۔

بوگن ویلیا کی نیل آج بھی ساری دیوار پر پھیلی ہوئی تھی۔ انار کے پیڑ کے پتے اب بھی سبز تھے۔ چار پائیاں وہی تھیں۔ برآمدے تک آیا تو وہاں بھی ہر چیز ویسی تھی، حتیٰ کہ امی نے اس کی مخصوص چیئر جس پر بیٹھ کر وہ پڑھتا تھا، ہلائی تک نہ تھی۔

”درید۔۔۔۔۔“

یاسر کی پہلی نظر پڑی تھی اس پر۔

”امی، ابو درید آ گیا۔۔۔۔۔“

وہ زور سے چیخا اسکے گلے لگ گیا تھا۔ امی بھی باہر آ گئیں۔ ان کی آنکھیں نم تھیں۔ درید نے انہیں بانہوں میں سمیٹ لیا۔

”جیتے جی ہی مار بیٹھا ہمیں۔ پلٹ کر دیکھا تک نہیں۔“

ان کی بات پر وہ شرمندہ تھا۔ امی بہت کمزور ہو گئی تھیں۔

”ایم سوری۔۔۔۔۔ اچھا ابو کہاں ہیں۔۔۔۔۔؟“

”اپنے کمرے میں ہیں۔“

یاسر کے بتانے پر وہ خاموشی سے ان کے کمرے میں آیا تھا۔ ابو سو رہے تھے یا شاید دواؤں کے زیر اثر تھے۔ وہ ہولے سے چلا ان کے پاس آ بیٹھا تھا۔ کتنے ویک ہو گئے تھے۔ چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ اسے شدت سے افسوس ہونے لگا کہ وہ کیوں دور رہا اتنے عرصے۔۔۔۔۔ اپنے گھر، اپنے ہر رشتے سے شاید اس کے وجود کا احساس تھا کہ ابو نے آنکھیں کھولی تھیں۔

”درید۔۔۔۔۔“ ان کے لب ہولے سے ہلے تھے۔ درید نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ تھام لیا۔

”تو آ گیا.....“

”جی! کیسے ہیں آپ.....؟“

”تجھے دیکھ لیا ناں، اب ٹھیک ہوں۔“

نقاہت بھری آواز سے شرمندگی کی اتھا گہرائیوں میں ڈبو گئی۔ وہ چھوٹا تھا اسی لیے ابو کا لاڈلاتھا۔ اپنی تمام تر لاپرواہی کے ساتھ بھی انہیں عزیز تھا۔

”ابو آپ آرام کریں۔“

اس نے ابو کا ہاتھ لمبوں سے لگایا۔ وہ ان کے پاس بیٹھا رہا، جب تک ابو سوئے نہیں۔ پھر باہر آ گیا۔

”حد ہو گئی، دو سال ہو گئے مگنی کو آپ نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ شادی کر دیں اس کی ریٹائرمنٹ لے لیں گھر کے کاموں سے۔“

امی کو کام میں مصروف دیکھ کر وہ بولا تھا۔

”تو آ گیا ہے ناں، اب دونوں کی ساتھ کروں گی۔“

”میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“

”کتنی دیر لگتی ہے ارادہ بنتے۔ یوں بھی شرقتی لڑکا ہے۔ ارادہ تو امی نے بنالیا ہے، تو نے صرف سہرا باندھ کے جانا ہے۔“ یاسر نے چھیڑا۔

”ہاں! کاٹھ کا الو ہوں نا میں۔“

اس نے گردن جھٹکی۔ ہمیشہ ہی صرف اپنی مانتا تھا وہ۔

”یہ لاپرواہی چھوڑ دے درید۔ چھبیس سال کا ہو چکا ہے۔ میچور ہے، سمجھدار ہے اور پھر شادی کی ایک عمر ہوتی ہے۔“

”وہ لڑکیوں کی ہوتی ہے۔“ فوراً جواب دیا۔

”خدا کے لیے بدل لو خود کو، ابو کی طرف دیکھو! بے موسم کے پھل اچھے لگتے ہیں نہ پھول خوشبو دیتے ہیں، امی ٹھیک کہہ رہی

تھیں۔“

شادی کی بھی تو عمر ہوتی ہے۔

”ہاں تو، تو کر لے دو سال بڑا ہے مجھ سے۔“

وہ کب ہاتھ آنے والا تھا۔

”امی سے کام نہیں ہوتا۔ ساری زندگی ملازم رکھنے کے خلاف رہیں اور اب دیکھو یہ گھر ملازموں کے سپرد ہے۔ صرف کچن کا کام

امی کرتی ہیں۔ یاسر نے بتایا۔

”شرم کر، یہ نہیں ہوا کہ بیوی لاکر ماں باپ کی خدمت کرواتے۔“ وہ درید عباس تھا، مجال ہے کہ ذرا بھی اٹھ لے۔

”اچھا چل اندر چلتے ہیں۔“

”نہیں، یہاں مزہ آ رہا ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا آ رہی ہے۔“

وہ چار پائی پر پھیل کر لیٹ گیا۔

دروازہ کھول کر وہ آئی تھی جو پہلی بار کی طرح آج بھی اس کی ساری توجہ کھینچ گئی اور وہ ان کے پاس سے گزر کے یاسر سے ہیلو ہائے کرتی اندر چلی گئی۔ درید کی نظروں نے کچن تک اس کا پیچھا کیا تھا۔

”ہوش میں آ جاؤ میاں۔“

”یہ کون ہے یاسر۔“

اس نے یہ جان بوجھ کر انجان بننے کی ایکٹنگ کی، حالانکہ دل کی دھڑکن اس کا نام پکار رہی تھی۔ میں نے دنیا تیاگ دی، وہ مجھے یوں بھول گا۔

”کوئی فائدہ نہیں، وہ میرا ہے۔“

یاسرے چھیڑا، اس نے گھورا۔

”ہے کون.....؟“

”اعجاز انکل کی بیٹی ریحاب۔“

یاسر نے بتایا تو وہ اچھل کر اٹھ بیٹھا۔

”کیا! کیا نام بتایا تو نے۔“

”ریحاب! یہ رہنے آئی ہوئی ہے۔ امی کی طبیعت کی وجہ سے اکثر ان کی ہیلپ کرنے آ جاتی ہے۔“

”اعجاز انکل کی بیٹی کا نام تو میرب نہیں تھا۔“

”ہاں! وہ مگر دوسری ہے۔ یہ دونوں ٹوئنز ہیں ناں..... ریحاب کی شادی جلدی ہو گئی تھی۔ میرب ماسٹرز کر رہی ہے۔“

”واٹ.....!!“

اس کے پیروں تلے گویا زمین کھینچ لی تھی کسی نے۔

”ان کی دو بیٹیاں ہیں؟“

”ہاں! تجھے نہیں پتا.....؟“

یاسر نے اچنبھے سے دیکھا اور وہ کہہ تک نہ سکا کہ اگر پتہ ہوتا تو دو سال وہ یہاں سے دور جا کر کیوں گزارتا۔



زندگی میں پہلی بار درید عباس کو اپنی نیچر کی لاپرواہی بہت بُری لگی تھی۔ دو سال گنوا دیے..... دوپل بھی کر یہ ہی بات پہلے امی یا یاسر سے پوچھ لیتا تو آج یوں نہ بیٹھا ہوتا۔

”تیرے چہرے پر یہ ہوائیاں کیوں اُڑ رہی ہیں۔“

یاسر نے اب اس کے چہرے پر غور کیا تھا۔

”بس یار، افسوس ہو رہا ہے کہ میں دو سال اپنے گھر سے دور رہا، کاش میں خود کو بدل لیتا تو یہ لمحے نہ گنواتا۔“

”دیر آید، درست آید.....“

یاسر نے مسکرا کر کہا۔ پھر سنجیدہ ہوا۔

”ایک بات اور پوچھوں۔“

”ہاں! میرب کی کال کیوں اینڈ نہیں کی تو نے۔“

”تجھے پتا ہے کہ اس نے مجھے کال کی تھی۔“

”ہاں تو نے نمبر بدل لیا تو اس نے مجھ سے تیرا نیا نمبر لیا تھا۔“

یاسر نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

”تیرے اور میرب کے بیچ کچھ ہے درید.....“

”اگر کچھ تھا بھی تو میری اپنی غلطی کی وجہ سے ختم ہو گیا۔“ وہ گہری سانس لیتا اٹھ گیا۔



"Where are you Asfand Zia? Please call me back."

وہ عشاء پڑھ کر گھر آیا تو اس نے سیل چیک کیا۔ چھ مس کالز اور تین SMS درید عباس کے آئے ہوئے تھے۔ اس نے فوراً ہی کال کی تھی۔

”کہاں مر گیا تھا..... کال کر کر جان آدمی رہ گئی میری۔“ بنا سلام دیا کیے اسٹارٹ ہوا تھا وہ۔

”ایم سوری یار! موبائل Silent Mode پر تھا، مجھے پتا نہ چلا۔“

”تجھے پتہ نہیں چلے گا کسی دن میں بھی Silent Mode پر چلا جاؤں گا۔“

”اچھا بک نہیں، یہ بتا انکل ٹھیک ہیں۔“

”ہوں، ہی از فائن ناؤ۔“

”تھینکس گاڈ..... پھر کب آرہا ہے؟“

”ایک دو دن میں.....“ آجایا میرا تو دماغ خراب ہو یا ہے ان کے داویلیے سن کر..... یونو، طلال صرف تیری زبان سمجھتا ہے۔“  
 ”سچ اسفند، وال میں ضرور کالا ہے۔ پہلے بلال مہینوں گاؤں نہیں جاتا تھا اور اب ہفتے کے پانچ دن بعد بھاگ جاتا ہے۔ کوئی چکر تو ضرور ہے۔“

”جو بھی چکر ہے، آ کے دریافت کر لینا۔ اس وقت صرف اپنی اور میری بات کر۔“

”کیا بتاؤں یار، مجھ سے بڑا بھی کوئی گھامڑ نہیں ہے۔“

”کیوں، کیا ہوا.....؟“

”آ کے بتاؤں گا.....“

”ابھی بتا دے یار، رات بھر نیند نہیں آئے گی ورنہ.....“

”مجھے الزام نہ دے، تجھے پہلے کون سا نیند آتی ہے۔“

”جس دن سے تو گیا ہے بالکل بھی نہیں آتی۔“

”ہائے میں مر جاواں، خیر ہے جان من۔“

”تیرے خراثوں کی ایسی عادت پڑی کہ اب سناٹے سے خوف آتا ہے۔“

درید عباس کو اس سے ایسے جواب کی امید نہیں تھی، تب ہی گلا پھاڑ کے ہنسا تھا۔

”پہلے بتاتا میں بلال کو کہہ دیتا تیرے پاس سو جاتا۔ صرف خراثے ہی نہیں پیار کی سرگوشیاں بھی سننے کو ملتیں۔“ (بلال کو نیند

میں بولنے کی عادت تھی)

”یا پھر طلال کو سلا دیتا..... ایسے لپٹ کر سوتا کہ.....!!“

”اوکے، اسٹاپ اٹ پلیز!“

”بھول گیا کہ درید عباس سے بات کر رہا ہے۔“

”چل سو جا اچھا..... پھر رات بھر مجھے کو سے گا۔ حالانکہ رات بھر تو نے پٹھروں سے ہی مذاکرات کرنے ہیں۔“

”ملتان میں پٹھر نہیں ہوتے۔“

”بس میرے باپ اللہ حافظ!“

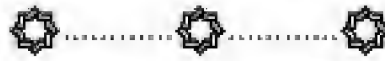
”درید زور سے ہنسا تھا اس کی بے بسی پر۔“

”کاش درید عباس تو میرے پاس ہوتا۔“

”کیوں، میری جدائی میں کچھ کچھ ہو رہا ہے۔“

”گڈ نائٹ!“

اسفند کی برداشت ختم ہوگئی تو اس نے کال کاٹ دی۔ یہ اور بات ہے کہ فون بند کر کے وہ خود بھی ہنس پڑا۔



اگلے دن عصر کے بعد وہ پھر امی کے پاس بیٹھی تھی۔ درید کو ذرہ برابر بھی فرق محسوس نہیں ہوا تھا۔ اس میں اور میرب میں تمام وہ ہی نقش تھے۔

”امی چائے پینی ہے۔“

حالانکہ دو سال سے یہ سارے کام وہ اپنے ہاتھوں سے کرتا تھا مگر ماں سے لاڈ اٹھوانے کا مزہ ہی اور تھا۔ ریحاب نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

”بیٹھیں آنٹی، میں چائے بنالاتی ہوں۔“

وہ سبزی بناتی اٹھ کر چلی گئی۔ امی بھی سبزی اٹھا کر اس کے پیچھے چلی آئیں۔

”میرب کیسی ہے.....؟“

غیر متوقع سوال پر ریحاب چونکی تھی۔

”بڑی جلدی خیال آ گیا ہے تمہیں اس کا۔ دو سال تک خبر بھی نہ لی کہ زندہ بھی ہے یا مر گئی۔ تمہاری بے رخی سہہ کر۔“

”اس تمام غلط فہمی کی وجہ تم ہو۔“

اس نے صاف گوئی سے ساری الزام اس پر ڈالا تھا۔ ریحاب نے اسے دیکھا۔

”مجھے نہیں پتا تھا کہ تم دو بہنیں ہو۔ مجھے لگا کہ میرب کی شادی ہو چکی ہے۔ سو میں یہاں سے چلا گیا۔“

”کتنی بار اس نے تمہاری یہ غلط فہمی دور کرنے کے لیے کال کرنے کی کوشش کی مگر تم نے کال نہیں سنی۔“ امی کی ڈیڑھ کے بعد وہ

بالکل تنہا پڑ گئی۔ اس وقت میں اسے تمہاری کمی شدت سے محسوس ہوئی..... مگر تم تو ایسے گئے کہ پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔“

”آنٹی کی ڈیڑھ..... کب ہوئی.....؟“

”ڈیڑھ سال ہو گیا ہے۔“

”یعنی اس کے جانے کے چھ ماہ بعد ہی وہ۔“

”ایم سوری ریحاب.....! بخدا میں ہر چیز سے لاعلم ہوں۔ میں تم سے بھی معافی مانگتا ہوں، اس سے بھی شرمندہ ہوں۔“

”مانا کہ غلط فہمیاں ہو جاتی ہیں مگر درید تمہیں ایک بار اپنے اس شک کو یقین میں بدلنے کے لیے سبھی میرب سے پوچھنا چاہیے تھا۔“

”ضرور پوچھنا چاہیے تھا۔ مگر مجھے لگا کہ پہلے ہی اس کی میرڈ لائف ڈسٹرب ہے، کہیں میرا فون مزید مشکلات پیدا نہ کر دے۔“

”میر ڈالائف۔“ ریحاب بڑبڑائی۔

”اب قصور تو سارا تمہارا ہے ناں! تم میرے اور میرب کے بیچ فاصلے کی وجہ بنی ہو۔“

”صحیح، کمزوریاں اپنی، الزام میرے سر۔“ تمہاری عادت کا علم ہے مجھے۔ انکل آنٹی کتنے نالاں ہیں تمہاری عادتوں سے۔“

محبت کرتے تھے مگر کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ میرب اعجاز کون ہے۔ ان کی فیملی کیسی ہے۔“

”میں نے سوچا تھا عمر پڑی ہے جان لوں گا۔“ اس نے نچل ہو کر سر کھجایا۔“

”اچھا پھر عمر پڑی ہے، مناتے رہنا میرب اعجاز کو۔ جواب تمہاری شکل دیکھنے کو بھی تیار نہیں ہے۔“

”یوں تو مت کہو، کوئی تو ہیلپ کر دو میری۔ دو سال پہلے ہی اپنے ہاتھوں سے گنواچکا ہوں۔“ اس نے معصوم بننے کی ایکٹنگ کی۔

”میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ میرے میاں مجھے لینے آگئے ہیں، میں سویرے ملتان جا رہی ہوں۔“

”ریسی! تم ملتان میں رہتی ہو۔“

”ہاں! میرا سسرال ہے وہاں۔“

”بس پھر میں تمہارے گھر کے سامنے دھرنادوں گا کہ اس لڑکی کی وجہ سے میری زندگی برباد ہوگئی۔ میری محبت مجھ سے روٹھ گئی۔“

”جو تے بھی کھاؤ گے، تمہیں شاید علم نہیں کہ میرے میاں ایس پی ہیں۔“

اس کے بتانے پر وہ منہ بنانے لگا۔

”اس کا سیل نمبر دے دو، خود منالوں گا۔“

”خود ہی لے لینا۔“ وہ اسے چڑاتی وہاں سے ہٹ گئی۔



”تھینک یو۔“

وہ توجہ سے اسٹڈی کر رہا تھا جب شناساسی آواز پر چونکا۔ نگاہیں اٹھائیں تو سیاہ اسکارٹ کے ہالے میں وہ ہی چہرہ پُر وقار

مسکراہٹ لیے کھڑا تھا۔

”اس دن آپ میری ہیلپ نہ کرتے تو میرا سائنٹس مکمل نہ ہوتا۔“

”اٹس مائی پلیور!“ وہ مسکرا کر بولا۔

”آپ کی ماما کیسی ہیں.....؟“

”بہتر ہیں، مگر ابھی چھٹی نہیں ملی۔“

”تو آپ کے فادر۔“



”میرے پاپا کی ڈیڑھ ہو گئی ہے۔ میں اور ماما کیلے ہیں اس دنیا میں۔“ وہ یکدم سنجیدہ ہو گئی۔

”او، ایم سوری! آپ کی ماما کو کیا ہوا ہے؟“

”ہارٹ پشٹنٹ ہیں۔ اکثر ہی بیمار رہتی ہیں، جب سے پاپا گئے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”ویری سیڈ!“ اس نے دکھ بھرے انداز میں کہا تھا۔ ان دونوں کا ایک ہی شوق تھا مطالعہ اور پھر وہ تو ماسٹرز کر رہی تھی اسلامک

ہسٹری میں۔

اب روز ہی تقریباً انکی ملاقات ہوتی تھی۔ مگر دونوں بہت محتاط اور اخلاق کے دائرے میں ضرورت کی بات کرتے تھے۔ اسفند اس کی ماما کی صحت کے متعلق ضرور پوچھ لیتا تھا اور اسے اپنے ٹاپک کے لیے اگر اس کی ہیلپ درکار ہوتی تو وہ لازماً پوچھتی تھی۔ وہ احتراماً اسے سر کہتی تھی۔ اس نے اپنا نام حریم فاطمہ بتایا تھا۔

وہ آج بھی کافی دیر تک اس کے ساتھ نوٹس بنواتا رہا اور جب گھر پہنچا تو سب کی مشکوک نظریں خود پر پائیں۔

حالانکہ عام دنوں کی نسبت لاؤنج کا ماحول کافی پُر سکون تھا۔ نہال اور طلال بھی اچھے موڈ میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔

چونکہ گرمیاں عروج پر تھیں اس لیے بلال نے سب کے لیے چائے کے بجائے مینگو وٹیک بنا رکھا تھا۔

”بگ بی! بڑی مشکوک ٹاسمنگ ہے آج کل آپ کی۔“

طلال اسے صوفے پر لیٹا دیکھ کر بولا تھا۔

”کیوں.....؟“

”شام میں کہاں ہوتے ہیں روز۔ بدنام مجھے کیا ہوا ہے۔ اللہ گواہ ہے کہ میں شام گھر پر گزارتا ہوں۔“

اس نے ایکٹنگ کی تو وہ ہنس دیا۔

”سچ بتا، تیری نئی ہیر کٹنگ کے بعد کوئی لفٹ شفٹ۔“

نہال ہاتھ آیا موقع کیسے جانے دیتا۔ طلال کے دل پر چھریاں چل گئیں۔

”سب بلال بھائی کی وجہ سے ہوا ہے۔ ہر ہفتے گاؤں جاؤ۔“

”گاؤں جانے سے بال کٹوانے کا کیا تعلق۔“ اسفند اس کا داویلا انجوائے کر رہا تھا۔

”اباجی نے ڈانٹ ڈانٹ کر کٹوا دیے۔“

”مجھے تو تم اچھے لگ رہے ہو اس نئے لگ میں۔“

”ہاں! آپ کو تو اچھا لگوں گا۔ میرے خوبصورت بالوں سے تو آپ کی ویلیو کم ہونے لگتی ہے۔“ اسفند ہنس دیا۔

”درید نہیں آیا..... دل نہیں لگ رہا اس کے بنا۔“

”بڑی عجیب لوائسٹوری ہے درید بھیا کی بھی۔“

”ہوں.....“ ٹاپک پیار محبت کا ہو وہ جانے کیوں کتراتا تھا۔ اب کے بھی یہ ہوا مگر اس بار طلال نے اسے پکڑ لیا۔

”وائے بگ بی! ذکر محبت کا ہو، آپ نگاہ کیوں چرا لیتے ہیں۔“

وہ سمجھا تھا اس کی خاموشی موضوع بدل دے گی، بٹ آج تو طلال نے حد کر دی، ڈائریکٹ پوچھ ڈالا۔

”اس لیے کہ میرے نزدیک یہ وقت کا زیاں ہے۔“



”اسپاسمیل مجھے لگتا ہے محبت کی گہرائی آپ سے زیادہ کوئی نہیں سمجھتا اور آپ کہتے ہیں کہ محبت وقت کا زیاں ہے۔“

”جس شخص کا خیر محبت سے گندھا ہو وہ محبت کے وجود سے انکار نہیں کر سکتا۔“

”مجھ پر ریسرچ کرنے سے تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔“

”اول ہوں، ریسرچ نہیں کر رہا۔ آپ سنا بننا چاہتا ہوں۔“

”ہو ہی نہیں سکتا۔“

نہال نے بیچ میں بول کر حتمی فیصلہ دیا۔

”کیوں.....؟“

”وہ کڑیاں دیکھ کر منہ موڑ لیتا ہے اور توں کڑیاں دیکھ کے دنیا توں منہ موڑ لیتا ہے۔“

”یونو..... یہ بھی اسٹائل ہے بگ بی، جتنا منہ موڑتے ہیں لڑکیاں اتنا ہی مرتی ہیں ان پر۔“

”ہائے رہا..... ٹیسی اس لیے ریز رو رہتے ہو بھائی جان!“ نہال نے کلیجہ تھاما۔

”تم لوگ کبھی نہیں سدھر سکتے۔ بھلا میری عمر ہے اس چھچھور پن کی۔“

”یونو بگ بی! شادی کے لیے بیسٹ ایچ ہے آپ کی۔ بندے کو اسی عمر میں شادی کرنی چاہیے جب وہ میچور ہو جائے۔“

”تھینکس فار ایڈوائس۔“

”بلال کی کردو، میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔“

”قربان تیری سادگی..... کیا خیال ہے آپ کا ہر ویک اینڈ پر گاؤں کے چکر باجی کی محبت میں لگ رہے ہیں۔ وہ خود ہی یہ پلان

کر رہے ہیں۔“

”مطلب؟“

”مریم فاروق کی کشش ہر ویک اینڈ پر گاؤں لے جاتی ہے اور ہم معصوم بلا وجہ مارے جاتے ہیں۔ آپے دونوں شام کو چھت پر

چہل قدمی کرتے ہیں، میں اور نہال اباجی کی جھڑکیاں کھاتے ہیں۔“

”اور تب ہی ہم دونوں نے فیصلہ لیا ہے کہ اس ویک اینڈ پر ہم ان کے ساتھ نہیں جائیں گے۔ ہمارا ویک اینڈ خراب کر دیتے ہیں۔“ نہال نے پُر جوش انداز میں فیصلہ سنایا تھا۔



ریحان واقعی صبح چلی گئی تھی۔ اب میرب سے بات کرنا بہت کٹھن مرحلہ تھا۔ جو بھی ہے میرب اعجاز تمہیں منا تو میں لوں گا مگر اس سے پہلے میں نے کچھ اور سوچا ہے۔ اس نے اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنایا اور یاسر سے تمام باتیں شیئر کریں۔“

”اب امی ابو کو منانا تیری ذمہ داری ہے۔ لیکن یہ طے ہے کہ یاسر کہ شادی مجھے صرف میرب سے کرنی ہے۔“

”اور اگر وہ نہ مانی۔“

”وہ من جائے گی، آئی بیلو، مگر کیا امی ابو مان جائیں گے۔“

”آج تک تیری ایسی کوئی خواہش ہے جو انہوں نے رد کی ہو۔ مگر اعجاز انکل کی طرف سے کچھ۔“

”اچھی بات منہ سے نکال یاسر۔ میں جا رہا ہوں یہ معاملہ تیرے سپرد کر کے اور اب صرف جب ہی آؤں گا جب تم سب کو منا لوں گیا اور مجھے یقین ہو جائے گا کہ میرب اعجاز صرف میری ہے۔“

”اوکے!“

”ایک کام اور کر دے، مجھے اس کا سیل نمبر دے دے۔“

”وہ ریحان کی طرح خوش مزاج نہیں ہے، ریز روٹی ہے۔ میری بھی اس سے زیادہ بات چیت نہیں ہے۔“

”غلط! وہ بہت خوش مزاج لڑکی ہے۔“

یاسر بولا تھا تب ہی امی آ گئیں۔

”درید ایک دو دن رک جاتا اور۔“

”امی میری چھٹی کل ختم ہو رہی ہے، پھر اسفند نے بھی فون کر کے تنگ کیا ہوا ہے۔“

اس نے گھر میں سب کو اسفند کے بارے میں بتا دیا تھا۔ امی کو تو اس سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔

”اچھا اگلی بار اسے لے کر آنا ساتھ۔“

”ہاں! یاسر کی شادی پر ضرور لاؤں گا۔“

”تیری بھی ساتھ ہی کروں گی۔“

”دیکھیں گے۔“

وہ مسکراتا ہوا اٹھ کے ابو سے ملنے چلا گیا اور سب سے مل کر وہ ایک بار پھر سے یا سر کو یاد دلانا ہوا باہر نکلا تھا۔ یا سر اس کے ہمراہ ہی آیا تھا۔

گیٹ سے باہر ہی انہیں اعجاز انکل کھڑے مل گئے تھے۔  
 ”السلام علیکم انکل!“

اس نے احترام سے سلام کیا۔ حال چال پوچھا۔  
 ”جار ہے ہو، اتنی جلدی۔“

”بس انکل، چھی ختم ہو رہی ہے کل۔“

”اچھا..... اللہ تمہیں کامیاب کرے..... مگر بچے چکر جلدی لگا لیا کرو، تمہارے ابو کی طبیعت اب ٹھیک نہیں رہتی۔“  
 انہوں نے پیار سے سمجھایا تھا۔

”جی ان شاء اللہ! اس بار جلد آؤں گا۔“

قدرے خفیف سا وہ سر جھکا گیا۔



وہ رات کو گھر لوٹا اور ید عباس کو سامنے دیکھا تو کھل سا گیا۔ درید بھی بہت چاہت سے اسے گلے لگا تھا۔  
 ”کیسا ہے، بڑا بے شرم ہے، بھول ہی گیا تھا۔“

”تجھے بھولنا اتنا آسان کام ہے، ہاف وانف۔“ آنکھ دبا کر شوخی سے بولا تھا۔ اسفند ہنس دیا۔  
 ”تھینکس بھیا آپ آگئے، ورنہ اسفند بھیا کی حرکات و سکنات آج کل مشکوک ہو گئی تھیں..... آفس کے بعد ایسے گھر سے نکلتے ہیں کہ دیکھیں اب لوٹے ہیں۔“

”تجھے صرف بکواس کرنی آتی ہے۔“

اسفند نے اسے ایک لگایا تھا۔ اور درید کے ساتھ بیٹھ کر حال احوال لینے لگا۔ وہ سب اس وقت صحن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ درید کے آنے سے جیسے وہ بہت کھل سا گیا تھا۔ اسے درید سے وہ ہی لگاؤ سا ہو گیا تھا جو سعد رسول سے تھا کبھی..... اور اگر درید عباس نہ ہوتا تو شاید سعد رسول کی کمی عمر بھر اسے دکھی کرتی۔

”گھر میں سب ٹھیک تھے؟“

”ہاں! اور سب تجھے سلام کہہ رہے تھے۔ امی نے خاص الخاص کہا ہے کہ اگلی بار تجھے ساتھ لے کر آؤں۔“  
 ”اچھا۔“ وہ اتنے خلوص پر خوشی سے مسکرایا تھا۔



”بھئی لگتا ہے بھابی سے صلح ہو گئی ہے۔ چہرہ پر نور برس رہا ہے۔“

عدیل پکا کھوجی تھا، اسفند ہنس دیا۔ درید گھور نے لگا۔

”میں نے تیری کھوج لگالی بھئی۔“

”مجھے اتنی کھلی چھٹی کب دی ہے، تین تین پہرے دار ہیں میرے۔ نظریں بھی ڈھنگ سے ملائے نہیں دیتے۔ اور خود شام میں

روز جانے کس سے ملنے جاتے ہیں۔“ وہ کلس کر بولا۔

”میری طرف سے کھلی چھٹی ہے تجھے، مگر لڑکی صرف ایک ہی ہو۔“

درید نے کہا، بلال نے اس کے سامنے روز کی طرح جوس کا گلاس رکھا۔ بھلا ایک گلاس سے پیٹ بھرتا ہے کبھی۔

اس کی ذومعنی بات درید سمجھ گیا تھا۔

”پیٹ تو بھرتا ہے میاں نیت نیک ہونی چاہیے۔ زیادہ پینے سے لوز موشن بھی لگ جاتے ہیں۔ اسی لیے موشن ہو یا اموشن،

کنٹرول میں رکھنے چاہئیں۔“

”خاک..... یہ زندگی کا مزہ نہیں۔“

”تیرا قصور نہیں، ملتان کی آب و ہوا ہی ایسی ہے۔“

”ہور کی، کوئی لڑکی غلطی سے پتا بھی پوچھ لے تو پہلے منڈے نے فون نمبر مانگنا ہے، دوستی کی آفر مانگنی ہے۔ لڑکی نوں آپے پتہ

چل جائے گا کہ لڑکا ملتان توں بی لانگ کر داوا۔“

”توں، وڈا سیانا۔“

طلال نے نہال کو لٹاڑا تھا۔

اسی ہنسی مذاق میں کافی وقت بیت گیا تھا۔ وہ درید سے اس دن والی بات نہ پوچھ سکا۔ مگر اگلے دن وہ شام میں لاہریری نہیں گیا

تھا بلکہ درید کے ساتھ شام گزاری تھی اور درید نے اسے ساری اسٹوری سنا دی۔

”اگر اب بھی گھر نہ جاتا تو شاید عمر بھر پچھتا تا۔ تھینکس گاڈ اسفند، میرا نقصان زیادہ نہ ہوا، مگر وہ ناراض ہے مجھ سے۔“

”وہ حق پر ہے۔“

”میں اسے منانا چاہتا ہوں۔ اس کی غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں۔ میں اسے چھوڑ کر نہیں آیا تھا بلکہ۔“

”اللہ کرم کرے گا یار، ان شاء اللہ یا سر تمہیں گڈ نیوز ہی دے گا۔“

”انشاء اللہ!“

درید کے دل سے نکلا تھا۔

ابھی اسے لوٹے ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ یاسر نے اسے فون کر کے بتایا۔

”سب راضی ہیں، صرف میرب نہیں مانتی۔ انکل بھی خوش ہیں مگر وہ صرف میرب کی مرضی کے بنا کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتے۔“

”مجھے اس سے بات کرنی ہے یاسر پلیز مجھے اس کا نمبر دو۔“

وہ بے چین ہو گیا۔ یاسر نے اسے ریحاب کا نمبر دیا تھا۔

”ریحاب! تمہاری بہن احمق ہے اسے سمجھاؤ پلیز۔“

”کیا ہوا.....؟؟؟“

”مانا کہ میں سزا کا مستحق ہوں۔ وہ جو چاہے سزا دے مگر یہ نہ کرے۔ وہ منع کر رہی ہے۔ ریحاب اسے سمجھاؤ۔“

”تم خود اس سے بات کیوں نہیں کرتے۔“

”وہ میری سنے گی؟“

”ہاں!“

”اس کو ریحاب سے میرب کا نمبر مل گیا تھا اور رات میں ہی وہ اس کا نمبر ملا رہا تھا۔ دو تین بار ملانے پر کال ریسیو کی تھی اس نے۔“

”ہیلو..... کون؟“

شاید وہ نیند میں تھی۔

”درید عباس۔“

اس کی آواز سن کر دوسری طرف سناٹا چھا گیا تھا۔

”میرب پلیز فون بند مت کرنا.....“

”ایم سوری میرب پلیز.....! تم مجھے جو سزا دو گی میں سہہ لوں گا، مگر انکار مت کرو۔ میں تمہارے بنا نہیں رہ سکتا۔“

”دو سال سے میرب اعاز کی خبر لی آپ نے۔“

”بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا میں۔ مانتا ہوں، تسلیم کرتا ہوں اپنی ہر خطا۔ مگر دو سال کیسے جیا یہ میرا رب جانتا ہے

میرب..... ہر رشتہ سے قطع تعلق کر بیٹھا تھا میں۔“

”ایک بار مجھ سے پوچھ تو لیتے، بنا کچھ کہے، بنا بتائے چلے گئے، مڑ کر دیکھا تک نہیں۔ ہر رابطہ ختم کر دیا۔ میں نے آپ سے کہا تھا

کہ میں خود آپ سے شیئر کروں گی ہر بات۔ انتظار تو کرتے، وقت تو دیتے مجھے۔“

اس کی آواز میں نمی گھل گئی، جو درید عباس کا دل کاٹ گئی۔

”مجھے اس وقت اپنی دنیا تباہ ہوتی نظر آئی تھی میرو، میں نہیں سہہ سکتا تھا کہ تم کسی اور کی ہو۔“

”مجھے محبت کی راہ پر لا کر خود راہ بدل گئے۔ میں کیسے کسی اور کی ہو سکتی تھی۔ آپ میرے لیے ہر راستہ بند کر گئے تھے درید عباس۔“

”مگر اب مجھے جینا آ گیا ہے۔ زندگی کے ان مشکل لمحوں میں جب آپ کی کمی شدت سے محسوس ہوئی، آپ منہ موڑ گئے۔ ایک بار پلٹ کر بھی نہیں پوچھا کہ تم کیوں بار بار کال کر رہی ہو۔ اب صبر آ گیا ہے، جی لوں گی میں۔“

”مگر میں نہیں جی سکتا میرب اعجاز۔ میرے حال پر رحم کرو۔ فارگا ڈسک! مجھے معاف کر دو۔“ اس کے لہجے میں سچائی تھی۔

”میرب تم پہلی لڑکی ہو میرے دل میں سمانے والی اور تمہارے بعد ہزاروں چہرے آئے مگر مجھ پر اثر نہ کر سکے۔ اگر میرے دل میں تم نہ ہوتیں، تمہاری محبت نہ ہوتی تو دو سال میں خود پر ہر خوشی حرام نہ کرتا۔ میں نے مڑ کر وہ شہر نہ دیکھا جہاں میں پیدا ہوا، جہاں میرا گھر تھا، میرے ماں باپ تھے۔ ان تمام محبتوں پر صرف تمہاری محبت حاوی رہی۔ میں پلٹ کر نہیں گیا کہ تم وہاں جا کے شدت سے یاد آؤ گی۔ کہیں تم سے سامنا ہو گیا تو کمزور پڑ جاؤں گا۔“

”آ جاتے، ایک بار آتے تو آپ۔“ وہ روتے ہوئے چیختی تھی۔

”اب تم مجھے بے بس کر رہی ہو، رو تو مت یار پلیز!“

”کیا فرق پڑتا ہے آپ کو، میں تو دو سال سے رو رہی ہوں۔ کبھی پوچھا آپ نے، اب بھی ویسے ہی جی لیں جیسے جی رہے تھے۔“

”اتنا عرصہ مجھ پر وقت بھاری رہا میرب، مگر تم نہیں سمجھو گی کہ اس غلط فہمی نے میری زندگی پر کیسا اثر کیا۔ سارا قصور تمہارا ہے۔ بتا نہیں سکتی تھی کہ تم دو بہنیں ہو۔“

”آپ کو انٹرنیٹ کب تھا ان باتوں میں، اور ٹھیک ہے سارا قصور میرا ہے تو۔ مجھے میرے قصور کے ساتھ رہنے دیں۔“

”تم مجھے ہرٹ کر رہی ہو میرب۔“

”آپ نے بھی مجھے ہرٹ کیا ہے۔“

”او کے سوری! بس کہو تو کان پکڑ لوں۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ اب بھی خفا تھی مگر کال کاٹ گئی۔ درید سر پیٹ کر رہ گیا۔



دو دن بعد وہ لاہریری آیا تھا۔ غیر ارادی طور پر وہ منتظر بھی تھا حرم کا مگر بظاہر کتاب کا مطالعہ بھی کر رہا تھا۔ دو گھنٹے گزر جانے کے بعد بھی وہ نہیں آئی تو اسے تشویش سی ہوئی تھی۔ مگر اس کے پاس کوئی رابطہ نہیں تھا کہ وہ حرم فاطمہ کی ماما کی طبیعت ہی دریافت کرتا، سو وہ اٹھ کر مسجد چلا گیا اور عشاء کی نماز کے بعد گھر لوٹا تو درید عباس کا مسکراتا چہرہ منتظر تھا۔

”اس نے ہاں کر دی اسفند، امی نے مجھے اور تجھے بلایا ہے۔“ اس نے افتد کو گھما ڈالا۔

”ریلی!“ اسفند بھی خوش تھا اس کے لیے۔

”کب جائے گا..... پھر۔“

”نیکسٹ ویک، تو بھی تیار رہنا۔“

”ہوں۔“ وہ مسکرایا۔

اس کاروز کا معمول بن چکا تھا الا میریری جانا مگر حریم فاطمہ کا انتظار کئی دن پر محیط ہو گیا جو اس کی کیئرنگ نیچر کو بے چین کر گیا۔

”خیر ہے اسفند، کل بھی رات بھر جاگتا رہا، آج بھی بے کل ہے۔ ورنہ میں تو خوش تھا کہ اب تو بڑے سکون نیند لیتا ہے۔“

”پتہ نہیں درید، بس دل بے کل بنا ہے۔“

”کوئی پراہلم ہے۔“

درید کے پوچھنے پر نفی میں سر ہلا دیا۔

جانے کیوں اس کے دل میں بے چینی تھی کہ حریم فاطمہ مشکل میں ہے۔

”آیت الکرسی پڑھ کر سو جا، اللہ کرم کرگا۔“

درید نے مشورہ دیا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ اس نے سب کچھ پڑھ ڈالا تھا، پھر بھی سکون نہیں آیا۔

اگلے دن پھر وہ اس کا منتظر رہا۔ جب وہ نہیں آئی تو اس نے ٹھان لی کہ ضرور پتا کر کے رہے گا۔ یہ بھی سچ تھا کہ انسانی ہمدردی کے

علاوہ اس کے دل میں کچھ نہ تھا۔ اگر اسے حریم کے بارے میں پتا نہ ہوتا تو شاید وہ اتنا بے چین نہ ہوتا۔ اب جبکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اور اس کی

ماں اکیلی ہیں، نہ اس کے والد حیات تھے اور نہ ہی کوئی بھائی تھا۔ ماں ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھی، رشتے دار کوئی ملتے نہیں تھے۔ وہ تنہا اس ماں

کی ذمہ داری اٹھا رہی تھی اور پابندی سے یونیورسٹی بھی جاتی تھی۔

اس کے ذہن میں حریم کی نوٹ بک پر لکھا ایڈریس تھا سو وہ پوچھتا پوچھتا آخر پہنچ گیا تھا۔ حالانکہ اس شہر میں اس کی واقفیت بھی خاصی

نہیں تھی مگر اس نے حریم فاطمہ کا گھر ڈھونڈ لیا تھا۔ گنجان علاقے میں گھر کے سامنے کھڑا تھا وہ۔ اسے ڈور بیل بجاتے عجیب سے جھجک مانع تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ ڈور بیل بجاتا، دروازہ خود ہی کھل گیا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر عورت نکلی تھی۔ اسفند اس سے پوچھنا چاہتا تھا مگر وہ شاید

جلدی میں تھی۔ اس پر ایک نظر ڈالتی وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ اسفند کئی لمحے ادھ کھلے دروازے کو دیکھتا رہا، پھر ہمت کر کے دروازہ بجایا تھا۔

ایک نو عمر لڑکا آیا تھا۔

”حریم فاطمہ.....“

”باجی اندر ہیں، آجائیں.....“

اس نے اسفند کو بتایا۔ اسے ساتھ لاکر اندر بٹھایا، گھر میں گہرا سناٹا تھا۔

تعزیت کرنے آئے ہیں آپ۔“



لڑکے کے الفاظ تھے کہ ہم، وہ یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔ تعزیت اس کا مطلب.....“

وہ ابھی اس شاک سے نہیں نکلا تھا کہ سیاہ اسکارف ہمیشہ کی طرح لپیٹے حریم فاطمہ اندر آئی تھی۔ اس کا چہرہ اس کے دکھ کی گواہی دے رہا تھا۔ آنکھیں گریہ وزاری سے سو جھی ہوئی تھیں۔ گہرا حزن و ملال تھا اس کی آنکھوں میں۔

”سر..... آپ.....؟“

اس کی آمد یقیناً اس کی توقع کے قطعی برعکس تھی.....

”بہت افسوس ہوا حریم، مجھے تو یہیں آ کر علم ہوا کہ تمہاری والدہ کی ڈیڑھ تھ ہو گئی ہے۔“

”جی سر، ممابھی مجھے تنہا کر گئی۔“

”اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے اور تمہیں صبر عطا کرے۔ (آمین)“ اسفند نے گہرے ملال سے کہا تھا۔ حریم نے چہرے پر تیزی سے پھیلنے والے آنسو صاف کیے۔ اس کا دکھ اسفند کو شدت سے دل میں اترتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ تنہا رہنا کتنا کٹھن ہے۔ اس نے عمر تنہا گزاری تھی، مگر وہ مرد تھا اور حریم ایک کمزور و شیزہ..... ہمارے معاشرے میں ایک لڑکی کا تنہا زندگی گزارنا بہت مشکل امر ہے۔ شاید تب ہی اس نے حریم کے دکھ کو بہت محسوس کیا تھا۔



”بگ بی نہیں آئے اب تک۔“

طلال نے ایک بار پھر گھڑی پر نظر ڈالی جو دس بجانے والی تھی۔ ان چاروں کے چہروں پر فکر مندی جھلکنے لگی۔ وہ تو عشاء پڑھ کر سیدھے گھر آتے ہیں۔“

”وہ مسجد نہیں گئے آج، میں پوچھا آیا ہوں۔“

نہال نے بتایا۔ درید کے چہرے پر اس وقت سب سے زیادہ پریشانی تھی۔

”لابریری سے پتا کر کے آؤں۔“

”وہاں سے وہ روز کے ٹائم پر نکل آیا تھا۔“

درید خود جا کر معلوم کر کے آیا تھا اور اسی باعث وہ بہت پریشان بھی تھا کہ آخر اسفند لابریری سے کہاں گیا۔ نماز پڑھنے وہ

گیا نہیں حالانکہ وہ لابریری سے سیدھا مسجد جاتا ہے اور پھر سیدھا گھر۔“

”تم لوگ پلیز کھانا کھاؤ۔ آجائے گا وہ۔“

درید نے کہا۔ اس کے انتظار میں اب تک کسی نے کھانا تک نہیں کھایا تھا۔ درید نے زبردستی انہیں کھانا کھلایا اور ان کی تسلی کے

لیے دو چار نوالے خود بھی لیے حالانکہ اس کا دل اسفند میں اٹکا ہوا تھا۔ دس سے سوئی گیارہ کا ہندسہ بھی کراس کر گئی تھی۔ سیل فون اس کا سوچ

آف جا رہا تھا۔ اور یہ ہی وجہ تھی کہ اس کی ٹینشن بھی ہر گزرتے منٹ کے ساتھ بڑھ رہی تھی۔

تقریباً ساڑھے گیارہ بجے دروازہ بجا تھا اور وہ چاروں جھگن میں ہی بیٹھے تھے، یکدم کھڑے ہوئے تھے۔ درید نے بے تابی سے بھاگ کر دروازہ کھولا تو سامنے اسفند ہی تھا۔ درید نے گہری سانس خارج کر کے اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔ وہ بہت خاموشی سے اندر آیا تھا۔

”کہاں تھے آپ بھیا۔“ طلال اور نہال نے بیک وقت پوچھا۔

ان کے چہروں پر اپنے لیے فکر اور جھلکتی محبت دیکھ کر وہ حیران ہوا تھا۔

”اسفند بارہ بجنے والے ہیں، کہاں تھا تو.....؟“ ہر جگہ تجھے دیکھ آیا میں۔ لائبریری کے بعد کہاں تھا؟“

اللہ پاک کیسے انسانوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت ڈال دیتا ہے بنا تعلق، بنا کسی رشتے کے۔ اس دور میں جہاں سنگے رشتے بھی ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ ان کی محبت مثالی تھی۔

”ایم سوری گائز! ارجنٹ کام تھا، وہاں چلا گیا تھا۔“

اس نے طلال کا گال تھپک کر انہیں تسلی دی۔

”جان نکال دی تھی آپ نے بگ بی۔“

”ڈونٹ وری، آئی ایم فائن یار!“

اس نے دونوں بازوؤں میں ان دونوں کو سمیٹا تھا۔

انہیں ٹال کر جب وہ باتھ لے کر قدرے فریش ہو کر لیٹا تھا تب درید عباس نے کہا۔

”میں ٹین اتج بچہ نہیں جسے تم ٹال دو گے۔ کہاں تھے تم اور چہرے پر اتنا گہرا رنج آنکھوں میں سرخی، چال میں مایوسی میں نے

نوٹس کی ہے اسفند ضیاء، پلیز ٹیل می، کیا ہوا.....؟“

آج تک اسے درید عباس میں سعد رسول کی محض جھلک نظر آتی تھی مگر اس لمحے اسے لگا کہ سعد رسول ہی اس کے سامنے بیٹھا اس

سے جرح کر رہا ہے۔ وہ یکدم اٹھ بیٹھا کتنے لمحے اس نے درید کے چہرے کے نقوش کھوجے تھے کہ کہیں واقعی سعد تو نہیں۔ آج عرصے بعد

اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہوئے تھے۔ آنکھوں کی سرخی گہری ہوئی تو درید بہت شاکد سا اسے دیکھنے لگا۔

”آریو او کے اسفند!“

اس لمحے وہ خود کو اتنا کمزور محسوس کر رہا تھا کہ بنا کچھ کہے وہ درید عباس سے لپٹ گیا۔ درید نے نا سمجھتے ہوئے بھی دونوں بانہیں

مضبوطی سے اس کے گرد باندھ لی تھیں۔

کتنا وقت وہ درید کے گلے لگا رہا تھا۔ پھر الگ ہوا تو چہرہ بھیگا ہوا تھا۔

”کیا بات ہے.....؟“ اتنے عرصے میں آج سے پہلے تجھے اتنا کمزور میں نے کبھی نہیں پایا تھا۔ اسفند کیا ہوا ہے۔“

اس نے اب تک درید کو حریم کے بارے میں نہیں بتایا تھا کہ وہ اس بات کو ایسا بنالیتا اور خدا نخواستہ طلال تک ہلکی سی خبر بھی پہنچی تو اس نے فسانے بنا دینے تھے۔ حالانکہ حقیقت میں ایسا کچھ بھی نہیں تھا، مگر آج واقعی اس کا دل بہت بھاری ہو رہا تھا۔ اور اپنے لیے ان سب کے چہروں پر محبت اور پریشانی دیکھ کر اسکو یہ یقین ہی گیا تھا کہ کم از کم وہ تنہا نہیں ہے۔

تب ہی اس نے درید عباس کو حریم فاطمہ کے بارے میں بتا دیا۔

کئی دن سے وہ نہیں آرہی تھی۔ میں ویسے ہی اس کی ماما کی طبیعت پوچھنے اس کے گھر گیا۔ وہاں جا کے علم ہوا کہ اس کی ماما تو اس دنیا میں رہی نہیں۔ درید جانے کیوں مجھے اس معصوم لڑکی کا دکھ اپنے دل میں اتنی شدت سے محسوس ہوا کہ میں کمزور پڑ گیا۔ میں نے ساری زندگی تنہا گزاری مگر مجھے زیادہ پرہیز اس لیے نہیں ہوئیں کہ میں ایک مرد ہوں، وہ..... وہ تو کمزور سی لڑکی ہے، کیسے رہ پائے گی اس معاشرے میں تنہا۔“

درید بے خاموشی سے اس کی باتیں سنی تھیں۔

ہمارا ایمان ہے اسفند کہ وہ رب کبھی ہمیں ہماری برداشت سے بڑھ کر آزمائش نہیں دیتا۔ اگر اس لڑکی پر آزمائش ہے تب وہ ہی ذات باری تعالیٰ اس کے لیے وسیلہ بھی بنائے گا۔ ہو سکتا ہے اس پاک ذات نے اس لڑکی کے لیے کوئی بہترین فیصلہ محفوظ کر رکھا ہو۔“

”بے شک درید وہ ہم سے زیادہ ہمیں جانتا ہے اور ہم سے کہیں بہتر ہمارے لیے سوچتا ہے۔ بس ویسے ہی یار میرا دل آج بہت ادا سا ہو گیا تھا، شاید اپنے پرانے دن یاد آ گئے تھے۔“

”ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔“

درید نے اس کا سر تھپکا۔

”اللہ پاک اسے ہمت اور صبر عطا فرمائے۔ اور اس کی حفاظت فرمائے۔ بے شک وہ ہی ہماری حفاظت کرنے والا ہے۔“

درید کی بات پر اس نے سر ہلایا تھا۔

”اوکے، ناؤریلیکس۔ اب پلیز تمام باتیں ذہن سے نکال کر سو جاؤ۔“ وہ اسے شانہ تھپک کر کہتا خود بھی جا کر لیٹ گیا تھا۔“



”دیکھو حریم! موت برحق ہے ہر انسان کو قضا آتی ہے۔ میں تمہارے دکھ کا مداوہ تو نہیں کر سکتا، سوائے اس کے کہ تمہارے لیے دعا کروں اور تمہیں صبر کی تلقین کروں۔ میری کوشش ہے کہ تمہیں اس دکھ کے احساس سے نکال سکوں۔“

وہ حریم کی تنہائی شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ تب ہی آج پھر اسے حوصلہ دینے چلا آیا تھا۔

”کیسے صبر آ سکتا ہے اسے جس کی دنیا ہی اجڑ جائے سر۔ ماما کے علاوہ میرا تھا کون! صرف وہ ہی تو میری کل کائنات تھیں۔“

اس کے آنسو ہزار ضبط کے باوجود بھی نہیں رُک رہے تھے۔

”مجھے تمہاری تنہائی کا احساس ہے حریم، کیونکہ خود میں نے بھی ایک عمر تنہا گزاری ہے۔“

”شاید یہ تنہائی ازل سے ہمارا مقدر ہے سرجی۔ پہلے میں اور ماما بھی تنہا تھا اور اب مجھے یہ کڑا وقت تنہا گزارنا ہے۔ پھر جی.....

آپ نے جس طرح میرا ساتھ دیا، میرا حوصلہ بڑھایا، آپ کا یہ احسان میں کبھی نہیں بھول سکتی۔“

”میں نے جو کیا وہ انسانیت کے ناطے میرا فرض تھا حریم، خدا کے لیے اسے احسان کا نام نہ دو۔“

اس نے نرم لہجے میں اسے ٹوکا تھا۔

”سر آپ کے پیرنس بھی نہیں ہیں۔“

”نہیں، عرصہ ہوا وہ خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔“

”پھر آپ اکیلے رہتے ہیں، بہن بھائی بھی تو ہوں گے ناں آپ کے ساتھ۔“

”تمہاری طرح اکیلا ہوں میں بھی، ہاں چار بہت اچھے دوست اللہ پاک نے عطا کیے ہیں جنہوں نے میری تنہائی دور کر دی۔“

اس نے فرسٹ ٹائم اپنے بارے میں کچھ بتایا تھا اسے۔

شام میں دریا اس سے پوچھ رہا تھا۔

”تو گیا تھا حریم کی طرف؟“

جواب میں اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”مجھے نہیں لگتا اسے تیری ضرورت ہے۔ کتنے دن بعد آج تو گیا حالانکہ وہ ان دنوں بہت بڑے دکھ سے گزر رہی ہے اور اسے

ایک ہمدرد کی ضرورت ہے۔“

”آف کورس! اسے کسی ہمدرد کی ضرورت ہے، مگر درید عباس ہم کبھی بھی خود کو دوسروں کے سامنے Define نہیں کر سکتے،

ہماری نیت ہمارے دل کا حال صرف ہمارا رب جانتا ہے۔“

”واٹ ڈو یو مین!“ درید نے حیرت سے پوچھا۔

”وہ مجھے سرکھتی ہے۔ بہت احترام دیتی ہے۔ میرے دل میں بھی اس کا احترام بہت زیادہ ہے۔ مگر لوگ دلوں میں جھانک کر

نہیں دیکھتے۔ جو تم کہہ رہے ہو وہ قطعی غیر شرعی ہے۔ میرے روز اس کے گھر جانے سے اس کے وقار پر کوئی حرف آئے، مجھے اچھا نہیں لگے

گا۔ یونو، وہ لڑکی تنہا ہے۔“

جس گہرائی میں وہ سوچتا تھا، درید وہ نہیں سوچ پایا تھا۔ مگر اب اسے لگا کہ اسفند ٹھیک کہہ رہا ہے۔

”یو آر رائٹ..... مگر یار پھر بھی دن بھر اکیلی رہتی ہے اور تو جانتا ہے کہ اکیلے انسان کو ہزاروں سوچیں ستاتی ہیں، کم از کم فون پر

ہی کہی، اسے حوصلہ دیتے رہتا۔“



”ہوں..... ایک دو دن کی بات ہے پھر وہ یونیورسٹی جانے لگی گی تو دل کو کچھ صبر آ جائے گا۔ ذہن دوسری طرف ہوگا تو شاید وہ اس صدمے سے باہر نکل آئے۔“

”اسفند! ایک بات کہوں۔“

وہ جو بات کہنے جا رہا تھا اس نے پہلے سینکڑوں بار سوچا تھا، پھر بھی اسے شک تھا کہ اسفند برا نہ مان جائے۔

”ہاں! اسفند نے اچنبھے سے اسے دیکھا تو بات کہنے کی بھی اجازت مانگ رہا تھا۔“

”تمہا تم بھی ہو، تمہا وہ بھی ہے۔ ہو سکتا ہے اللہ پاک نے تمہیں حریم سے ملوایا ہی اس لیے ہو کہ تم اس کا سہارا بن سکو۔“

اس کی بات پر اسفند کئی لمحے ساکت سا اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

درید عباس کیا تجھے لگتا ہے میری زندگی میں اس کی گنجائش ہے۔ میں اسے کیا دے پاؤں گا۔ اور جب میں اسے وہ مقام ہی نہیں دے سکتا جو کہ ہونا چاہیے تو کیوں اس کی زندگی داؤ پر لگاؤں۔ ہو سکتا ہے کوئی ایسا شخص بھی ہو جس کے دل میں اس کی ہی چاہت ہو بس۔“

درید نے سہرے کا نیچے سی آنکھوں میں جھانکا تھا جہاں اضطراب برپا ہونے لگا تھا۔

”تو کیوں وہ بات کر رہا ہے درید جسے میرا من قبول نہ کرتا ہو۔ اور اگر واقعی اللہ پاک نے میرے لیے ایسا کوئی فیصلہ کر دیا تو پھر میرے من کو راضی بھی وہ خود کر دیے گا۔ وہ ہی دلوں میں محبت ڈالتا ہے۔“

درید نے اس کی برداشت کا مزید امتحان نہیں لیا تھا، ٹاپک چینج کر دیا۔ مگر اس کے اندر جیسے محبت پھر سے رو پڑی تھی۔



”درید کہاں ہے؟“

وہ آج شام گھر پر ہی تھا۔ درید کے علاوہ سب محسن میں بیٹھے تھے۔

”یونوبگ بی! اس کی لواستوری آج کل ہٹ ہے، مصروف ہوں گے میرب بھابی سے فون پر۔“

طلال کتنی باریک بینی سے تجزیہ کرتا تھا۔ اسفند مسکرا دیا۔

”اچھی بات ہے ناں! تم نے نوٹس کیا اس میں کافی چینج آیا ہے۔“

”ہوں، اور دن بدن پیارے بھی ہو رہے ہیں۔“

طلال مزے سے بولا۔ درید بھی چھت سے اتر آیا تھا۔

”بگ بی! کیا واقعی محبت انسان کو بدل دیتی ہے؟“

وہ یقیناً درید کو چھیڑ رہا تھا۔

”ہاں ناں! یار، دیکھا نہیں بلال کتنا بدل گیا ہے۔ حریم فاروق کی محبت میں۔ ہم جیسوں کو تو منہ ہی نہیں لگاتا۔“ درید عباس ہمیشہ

ایک تیر سے دو شکار کرتا تھا مگر اس لمحے اس کی بات جہاں طلال کی چلتی زبان بند ہوئی تھی وہیں بلال کے چہرے پر بھی سایہ سالہرا گیا تھا جو اسفند اور درید دونوں نے شدت سے نوٹ کیا تھا۔

”چل نہال اٹھ، تیری دوائے آؤں، کل پھر جانا بھی ہے۔“

بلال نے ان کی باتیں قطعی انور کرتے ہوئے چار پائی پر بے سندھ لیٹے نہال کو اٹھایا تھا جسے کل رات سے شدید بخار تھا۔

”ضروری ہے کہ کل ہی جائیں، اگلے ہفتے چلے جائیں گے۔“

طلال کا سارا موڈ جھنجھلاہٹ میں بدل گیا تھا۔

”اباجی کا فون ملا کر دے دوں تجھے خود کہہ دینا۔“

اس کا جلا کٹا لہجہ طلال پر گھڑوں پانی ڈال گیا۔

بلال زبردستی نہال کو اٹھا کر ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا جبکہ طلال اپنے سیل فون سے کھیلنے لگا۔ اسفند اور درید نے ایک دوسرے کی

شکل دیکھی۔

کچھ تو تھا جس نے ناصرف بلال کو ڈسٹرب کیا تھا بلکہ ہر وقت زندگی کو فل انجوائے کرنے والے طلال احمد کو بھی عجیب سی خاموشی

میں مبتلا کر رکھا تھا۔

”کچھ تو خاص ہے کل، تمہارے اباجی نے ارجنٹ بلا لیا۔“

”اتوار کو بلال کا نکاح ہے۔“

بڑی خبر وہ بہت سنجیدگی سے سن رہا تھا۔

”واقعی میں!“

درید نے مسکرا کے خوشی کا اظہار کیا۔

”چھوٹے چچا کی بیٹی مقدس سے۔“

اس کی خوشی کو طلال کی اگلی بات نے حیرت میں تبدیل کر دیا جبکہ اسفند کو بھی شاک لگا تھا، کیونکہ یہ بات اب سب کو پتا تھی کہ

بلال مریم کو چاہتا ہے۔

”مگر بلال تو مریم کو پسند کرتا ہے ناں.....؟“

”سو واٹ! اباجی کو کیا فرق پڑتا ہے کہ بلال کیا چاہتا ہے اور کسے چاہتا ہے۔ انہوں نے صرف ہمیشہ اپنی مرضی اور اپنی خوشی کے

لیے ہر فیصلہ کیا ہے، بلال خوش ہو نہ ہو۔ وہ خوش ہیں کہ انہوں نے بلال کا رشتہ اپنی پسند سے اپنے بھائی کی بیٹی جس کی عمر بمشکل پندرہ سال

ہوگی اس سے طے کر دیا۔“

ان دونوں کے لیے یہ باتیں شدید حیرت اور تاسف کا باعث تھیں۔ بلال کے دل ٹوٹنے کا دکھ اور پھر ایک کم عمر بچی کے ساتھ رشتہ طے کرنا۔

”اور بلال چپ چاپ مان گیا۔“

”کیا کرتا، ہمیں یہ حق کب حاصل ہے بگ بی، کہ ہم اپنی مرضی سے کر سکیں۔ بلال نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ اب چاہے عمر بھر وہ خود نہ رہے مگر یہ طے ہے کہ اباجی کے سامنے کچھ نہیں بولے گا۔“

”غلط..... یہ غلط ہے، بلال کو اسٹینڈ لینا چاہیے۔“

”اباجی سے بد تمیزی کرے یا ان کے سامنے اڑ جائے؟“

”نہیں، وہ انہیں قائل کرنے کی کوشش تو کرے۔ اپنی پسند اپنی محبت کا تو بتائے۔“

”بلال بھائی کی خاموشی ان کی محبت کی وجہ سے ہی ہے۔ وہ خود پر ہونے والی زیادتی سہ لے گا مگر مریم آپ پر آنچ نہیں آنے دے گا۔“

”اس کے بغیر جی لے گا۔“

”ان کے ساتھ جینا زیادہ کٹھن ہے۔ آپ نہیں جانتے کہ اگر بلال بھائی نے مریم آپ کا نام بھی لیا تو خاندان بھر میں فساد برپا ہو جائے گا اور ہر شخص صرف مریم آپ کو قصور وار ٹھہرائے گا۔“

”اس کی وجہ؟“

اسفند نے پہلی بار کچھ پوچھا تھا۔ وہ صرف سن رہا تھا۔

”سب سے بڑی وجہ کہ وہ چچا کی دوسری بیوی کی اولاد ہیں اور چچا نے اپنی پسند سے شہر کی زیادہ پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کی تھی۔ مریم آپ نے بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے، اپنی امی کی طرح۔ اور ہمارے خاندان میں زیادہ پڑھی لکھی لڑکیوں کو ویسے ہی برا سمجھا جاتا ہے۔“

”2013ء میں بھی اتنی جہالت، حالانکہ اب تو گاؤں دیہات کے لڑکے لڑکیاں بھی تعلیم حاصل کر کے اچھی جاب کے متلاشی رہتے ہیں۔ زمانہ بہت بدل گیا ہے طلال۔“

”زمانہ بدل کر کہیں بھی چلا جائے، ہمارے اباجی کے اصول نہیں بدل سکتے۔ یونہی درید بھیا! میں صرف اسی لیے اپنی زندگی فل ٹائم انجوائے کرتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میرے پاس یہ چند سال ہیں جو میں اپنی مرضی اپنی خوشی سے جی سکتا ہوں۔“

”ویری سیڈ! بائی گاڈ مجھے اتنا گہرا شک لگا کہ اس دور میں بھی جب دنیا اس قدر ریڈ وائس ہو گئی ہے، اب بھی ایسی سوچ!“

”اور تم دیکھو درید، کہ پھر بھی طلال نے خاموشی سے ان کی بات مان لی، حالانکہ آج کل کی اولاد اپنی بات منواتی ہے۔“

”اس لیے کہ ان کے پاس کوئی آپشن نہیں ہے۔“

طلال نے موضوع کو سمیٹا تھا۔ بلال اور نہال کی آمد پر وہ تینوں چپ ہو گئے تھے۔



”درید، تیرا جانا ضروری ہے، بس تو چلا جا۔“

درید کی امی کا فون آچکا تھا۔ انہوں نے درید کو بلوایا تھا۔ اب درید اس کے ساتھ بحث کر رہا تھا۔

”بہت ضروری ہے، اگر تو نہیں گیاناں تو سمجھ تیری میری ختم۔“

”تیری میری کیا۔“

اسفند نے مسکراہٹ لبوں میں دبائی تھی۔ درید کی صورت میں رب نے اسے دوست جیسی نعمت عطا کی تھی۔ وہ کبھی بھی اسے ناراض نہیں کر سکتا تھا۔ سو وہ چپ چاپ اس کے ساتھ آ گیا تھا مگر شام تک ہی درید اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ بور ہو رہا ہے حالانکہ امی ابو یا سب نے بہت خلوص اور اپنے پن سے اسے دیکھ کر دیکھا تھا۔

”شکل پر بارہ بج کر ہے ہیں، کیا ہوا۔“

”کچھ نہیں، بس دل نہیں لگ رہا۔“

”دل نہیں لگ رہا یا کچھ یاد آ رہا ہے۔“

درید نے خواجواہ ہی ہوا میں تیر چلایا تھا۔

”سچ بتاؤں! ذہن میں بلال کا خیال چپک کر رہ گیا ہے۔ جانے کیسے ہیں اس کے ابا جن کے نزدیک اولاد سے زیادہ اپنی مرضی

اہم ہے۔“

”بلال کو بھی خاموشی سے ہر غلط فیصلے پر سر نہیں جھکانا چاہیے۔ آج وہ چپ رہا تو سمجھو اس نے تلال اور نہال کے لیے بھی ہر دروازہ بند کر دیا۔“ درید کے خیال میں بلال کو اپنے حق کے لیے آواز اٹھانی چاہیے۔

”مگر یار، وہ کیسے اپنے والد کے سامنے ڈٹ جائے۔“

”اپنی ماں سے کہہ کے بات منوانے، ماں کو بچوں کی خوشی سے زیادہ کوئی بھی چیز اہمیت نہیں رکھتی۔“

”تجھے لگتا ہے کہ ان کے ابا کے آگے ان کی اماں کی چلتی ہوگی۔“

اسفند نے اسے دیکھا جو ہر سوچ انداز میں سر ہلانے لگا تھا۔

کچھ دیر بعد یا سر آ گیا تو درید غائب ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ درید کہاں گیا ہے۔ میرب اعجاز نے ہاں کر دی تھی، مگر وہ ناراض تو اب

بھی تھی اور درید عباس اسے منانے آیا تھا۔

”اگر ایسے ہی منہ موڑ کے بیٹھنا تھا تو مت آتیں۔“



”اب چلی جاؤں۔“

”لگ میرب! جو کچھ بھی ہوا غلط فہمی کے باعث ہوا، ارادتا میں نے تمہیں ہرٹ نہیں کیا۔“

”آپ کی جلد بازی کے باعث ہرٹ ہوئی ہوں میں۔ پل بھر میں کیے گئے فیصلے سے دکھ پہنچا ہے مجھے اور پھر دو سال تک پلٹ

کر دیکھا تک نہیں۔ آپ کو اتنا بھی اعتبار نہیں تھا مجھ پر کہ ایک بار پوچھ لیتے۔“

وہ رو ہانسی ہو گئی۔ درید عباس گہری سانسیں خارج کر کے رہ گیا۔

”تسلیم تو کر رہا ہوں اپنی ہر خطا اور کیا دو سال میں نے سکون سے گزارے ہیں میرب اعجاز۔ اک اک لمحہ تمہارے لیے تڑپتا رہا

ہے میرا دل۔ محبت کی ہے میں نے تم سے اپنے دل کی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ۔ تمہیں چھوڑ کر جانا میرے لیے خود کسی سزا سے کم نہیں تھا۔“

وہ سنجیدہ ہو گیا۔

میرب نے اس کا چہرہ دیکھا، جہاں سچائی رقم تھی۔

”اور اب تک جھیل رہا ہوں یہ سزا۔ ختم کر دو اب ناراضگی پلیر!“

”کیا کروں اور؟ جو چاہتے تھے مان تو لی ہے آپ کی بات۔“

”صرف میری خواہش پر ہاں کی تمہارے دل میں تو ناراضگی اب بھی اسی طرح ہے۔“

”کس نے کہا۔“

”ضرورت ہے کسی کو کہنے کی۔ روز تین بار تمہارا نمبر ڈائل کرتا ہوں جو بنا رسپانس کے بڑی کر دیا جاتا ہے، اور کیا سمجھوں

میں اسے میرب اعجاز!“

”اندازہ ہوا کہ مجھے کتنی تکلیف ہوئی ہوگی جب آپ میرے ساتھ یوں کرتے تھے۔“

”تم مجھ سے بدلے لے رہی ہو۔“

اس نے گھورا۔ وہ بمشکل اپنی ہنسی روک پائی۔

”جو مرضی سمجھیں۔“

”اوکے، فائن! بٹ یاد رکھنا، مس میرب اعجاز بہت جلد تمہارا سارا قرض سود سمیت چکاؤں گا۔ جتنا ستانا ہے ستالو، جو بدلہ لینا

ہے لے لو۔ میرا وقت بھی قریب ہے، پھر کیا کرو گی۔“

”آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں۔“

”جو مرضی سمجھو۔“

”اوکے! میں ابھی پاپا سے بات کرتی ہوں۔ ابھی وقت میرے پاس بھی ہے۔“

وہ الٹا اسے ہی دھمکانے لگی تھی۔ درید حیرین رہ گیا اس کی چالاکی پر۔ اسے گھورا تو وہ ہنس کر اٹھ کے بھاگ گئی۔



وہ تین دن رہا۔ صرف پہلے دن کے علاوہ باقی دو دن بہت اچھے گزرے تھے اس کے۔ خاص کر درید کی والدہ کے ساتھ گزرا بہت اچھا رہا۔ واپسی پر آتے وقت بہت پیار سے انہوں نے کہا تھا۔

”یہ گھر جتنا درید کا ہے اتنا ہی تمہارا ہے، جب دل چاہے اپنا گھر سمجھ کے آ جانا۔“

”کیوں نہیں آئی، ان شاء اللہ!“

”اگر تم مجھے درید کی طرح امی کہو گے تو مجھے زیادہ اچھا لگے گا۔“

”ضرور کہوں گا، امی کہنے کی حسرت تو میرے من میں دم توڑ گئی تھی، لیکن اگر آپ کو اچھا لگے تو میں ضرور کہوں گا۔“

وہ مسکرا کے بولا تھا۔ انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ یا سر بھی بغلگیر ہوا تھا۔

”تم سے مل کر بہت اچھا لگا۔ مگر حیرت جس بات پر ہوئی وہ یہ ہے کہ تم جیسا اچھا اور شاندار آدمی درید کا دوست کیسے بن گیا۔“

”جیسے اب تیرا بننا۔“

درید نے جل کر کہا تھا۔

بہت اچھی یادیں دل میں لیے وہ ملتان آیا تھا۔ مگر یہاں آ کر جو پہلا جھٹکا لگا کہ گھر لاکھڑا تھا۔ یعنی وہ تینوں اب تک گاؤں سے نہیں آئے تھے۔

”اللہ خیر کرے، ورنہ طلال کہاں نکلنے والا ہے۔“

وہ دونوں ہی فکر مند ہوئے تھے۔ فریش ہو کر انہوں نے بلال اور طلال دونوں کے نمبر ٹرائی کیے تھے مگر دونوں نے ہی کوئی رسپانس

نہ دیا۔ پھر درید تو لیٹ گیا اور اس کا ذہن حریم کی طرف چلا گیا۔ وہاں سے بھی اس نے ایک بار اسے کال کی تھی مگر کسی نے اس کے ضرور کی تھی

بات نہ کی۔ اب اس نے پھر سے نمبر ڈائل کیا تو نمبر سوچ آف تھا۔ حریم نے اسے کئی مس کالز کی تھیں پھر اب کیوں آف تھا نمبر۔ بظاہر وہ

مطمئن سا تھا مگر جانے کیوں ذہن الجھ سا گیا۔ پہلے بلال اور اب حریم۔

بلال تو صبح ہی آ گیا۔ مگر وہ اکیلا نہیں تھا، اس کے ساتھ مریم بھی تھی۔ اور جب اس نے بتایا کہ انہوں نے کورٹ میرج کر لی ہے تو

درید اور اسفند دونوں شاکہ ڈرہ گئے۔

”اتنا غلط قدم اٹھانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”بہت مجبور ہو گیا تھا۔ لیکن اگر تم لوگوں نے بھی نہیں رکھنا تو بتا دو، میں دوسرا ٹھکانہ ڈھونڈ لیتا ہوں۔“

سمجھ سکتے تھے وہ کہ اس وقت بلال کی کیا کنڈیشن ہوگی۔

”کیوں نہ کر اسفند کا ایسا کوئی مطلب نہیں تھا۔“

درید نے فریج سے جوس لا کر اسے اور مریم کو دیا تھا۔ بلال کو ریلیکس کیا۔

”بھابی کو اندر لے جاؤ، ریٹ کر لیں گی۔“

اسفند کے کہنے پر وہ اسے کمرے میں چھوڑ آیا تھا مگر خود واپس ان کے پاس آ بیٹھا تھا۔

”نہال اور طلال۔“

”وہ آئے نہیں اب تک۔“ گویا اسے خبر ہی نہیں تھی۔

”ہوا کیا تھا بلال کہ تم نے یہ انتہائی فیصلہ لیا۔“

”اسفند میں نہ مریم پر ظلم ہونے دے سکتا تھا نہ میں اس پندرہ سالہ بچی کے ساتھ زیادتی ہونے کے حق میں تھا۔ میں اٹھائیس

سال کا ہوں اور وہ مجھ سے عمر میں آدھی تھی۔ یہ ظلم نہ تھا۔“

بلال نے ان دونوں کو جواب طلب نظروں سے دیکھا۔

”بے شک یہ غلط تھا مگر طلال تم اپنے والد کو ہی بات سمجھاتے۔“

”کیا میں نے انہیں سمجھایا نہیں ہوگا۔ اسفند ان کی بے جاضر اور زبردستی نے ہی مجبور کیا۔ جب مجھے کوئی راستہ نظر نہیں آیا تو میں

نے اور مریم نے نکاح کر لیا۔ مگر اباجی نے یہ تسلیم نہیں کیا اور مجھے گھر سے نکال دیا۔ طلال اور نہال دونوں میرے ساتھ تھے۔ مگر شاید اباجی

نے انہیں زبردستی روک لیا ہو۔“

”اور بھابی کے والدین، ان کا رد عمل!“

”کیا رد عمل ہونا تھا۔ ماں تو اسکی مرچکی تھی، سوتیلی ماں نے اسے بھی جیتے جی مار رکھا تھا، اور چچاجی کو ہوش ہی نہیں تھا۔ تمہیں پتا ہے

اسفند اگر میں یہ قدم اٹھاتا تو سب سے زیادہ ظلم مریم کے ساتھ ہونا تھا۔ کیونکہ میرے گاؤں جانے سے پہلے ہی یہ بات سب کو پتا چل چکی تھی

کہ میں اور مریم ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ اور انہوں نے اس معصوم کو ادھ موا کر دینا تھا، صرف اس خطا کے لیے کہ یہ مجھے چاہتی ہے۔“

”بہت افسوس کی بات ہے بلال۔ تم جو کچھ بتا رہے ہو۔ اللہ پاک تمہارے والد کے مزاج میں نرمی پیدا کرے، مگر فکر مجھے طلال

اور نہال کی ہو رہی ہے۔“

اس کی آواز بھیگ گئی۔ اسفند نے اٹھ کر اسے گلے لگا کر حوصلہ دیا تھا۔

”او کے جسٹ ریلیکس! جو ہونا تھا ہو چکا، اور آگے جو ہوگا اللہ بہتر کرنے والا ہے۔ مگر تم یوں کمزور پڑو گے تو بھابی کو ہمت کہاں

سے ملے گی۔ بے شک یہ غلط انداز میں ہوا مگر اب پلیز خود کو پُر سکون رکھو۔ بے شک اللہ پاک ہی ہمارے لیے بہترین کرنے والا ہے۔“



اگلی صبح طلال اور نہال پہنچے تو بلال کو کچھ سکون ہوا ورنہ وہ یہ ہی سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ اس کی غلطی کی سزا اس کے چھوٹے بھائیوں کو سہنی پڑے گی۔

نہال اور طلال کم عمر تھے۔ ان کے چہروں پر ہونے والے واقعے کے اثرات واضح نظر آ رہے تھے۔ اسفند نے کافی دیر انہیں خود سے لگا کر حوصلہ دیا تھا۔

”اچھا سنو! آج کے بعد ہمارے درمیان یہ موضوع نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہم سب کچھ اس ذات پر چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ یقیناً ہمارے حق میں ہم سے بہتر فیصلہ کرتا ہے۔“ اسفند نے بڑے بھائیوں کی طرح دونوں کو سمجھایا۔

”جی بگ بی!“

طلال نے فوراً حامی بھری۔ خیر اس کی بات کا اتنا اثر ہوا کہ اگلی صبح سب کی بہت خوشگوار تھی۔ درید کی خاص کر کیونکہ اسے کچن سے چھٹی مل گئی تھی اور یہ چارج اب مریم بھابی نے سنبھال لیا تھا۔ جب سب نارمل تھا تو اب اسفند ضیاء کے چہرے پر بارہ کیوں بچ رہے تھے۔

”کیا ہوا تجھے؟“

”پتا نہیں درید، میرا دل عجیب سا ہو رہا ہے۔“

”وجہ؟“

”حریم کا نمبر مستقل ایک ہفتے سے بند ہے۔“

”گھر جا کر معلوم کر لے، پھر اس میں الجھنے کی کیا بات ہے۔“

درید اسے گھر کا رستہ بھی دکھا گیا تھا اور شام میں آفس سے واپسی پر اس کا رخ حریم کے گھر کی طرف تھا۔ مگر وہاں جا کے گھر لاکھ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی وہ پلٹ کر بائیک اشارٹ کرنے لگا تھا کہ اسے وہی نو عمر لڑکا مل گیا جو پہلی بار اسے حریم کے گھر ہی ملا تھا۔

”یہ گھر لاک کیوں ہے؟“

”باجی ہاسپٹل میں ہے ناں!“

اس کی بات تو اسفند کو سخت پریشان کر گئی۔

”کیوں.....؟“

”باجی نے خودکشی کر لی تھی۔ وہ تو اللہ نے زندگی رکھی تھی ان کی جو بی بی گئی۔“

اسفند ضیاء کے قدموں تلے سے دھرتی کھینچ لی تھی۔

”کیا؟ کون سے اسپتال میں ہے وہ؟“

اس نے اس لڑکے سے پتا پوچھا تھا اور بیس منٹ بعد وہ ہاسپٹل میں تھا، مگر جھٹکا اسے تب لگا تھا جب حریم نے اس سے ملنے سے



منع کر دیا۔

”خالہ! میں اس کی خیریت پوچھنے آیا ہوں۔“

”ابھی وہ بہت سہمی ہوئی ہے بیٹا۔ نہیں ملنا چاہتی کسی سے۔“

یہ حریم کی وہ ہی پڑوسن تھی جو اس کے پاس رہتی تھی۔

”ہوا کیا ہے حریم کو؟“

”اللہ جانے، میں تو اپنے سر کی فوٹنگی پر گئی ہوئی تھی، واپس آئی تو اس کی حالت بہت ابتر تھی۔ وہ تو سانسیں تھیں جو بچ گئی۔“

وہ بہت سادہ سی گھریلو خاتون تھیں۔ اس لیے اپنے اندازے میں بتا رہی تھیں۔

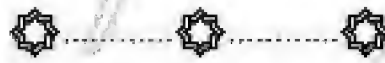
اس نے بہت کوشش کی تھی مگر حریم ملنے پر تیار نہ ہوئی۔

اس رات وہ پوری رات کرسی پر بیٹھا رہا۔ نیند تو دور کی بات، وہ لیٹ بھی نہ پایا تھا۔ آخر اسے کیوں ایک غیر لڑکی کی اتنی فکر ہے!

درید صبح جاگا تو حیران رہ گیا۔

اسفند کا بستر خالی تھا۔ حالانکہ فجر پڑھ کر وہ لازمی لیٹتا تھا۔ مگر آج صحن میں بیٹھا جانے کیا سوچ رہا تھا۔ درید نے فی الوقت چھیڑنا

مناسب نہ سمجھا۔



آج بھی آفس سے سیدھا وہ ہاسپٹل گیا تھا۔ خالہ نہیں تھیں اور حریم گھٹنوں میں سر دیے ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ وہ لب بھینچ کر کئی

لمحے کھڑا رہا۔

”حریم!“

اس کے پکارنے پر وہ بری طرح چونکی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار تھے، جو اسفند نے شدت سے محسوس کیے تھے۔ وہ

آہستگی سے چلتا اس کے قریب آیا تھا۔ حریم ہم کر پیچھے کھسکی تھی۔

”حریم! تم ٹھیک ہو اب۔“

اسفند نے پوچھا۔ جواباً حریم کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں اور لب لرز رہے تھے۔ اس کی یہ حالت شدید تکلیف دہ تھی۔ آخر کیا ہوا

تھا جو حریم اس حال تک پہنچ گئی۔

”حریم پلیز ڈر کیوں رہی ہو، میں ہوں اسفند۔“

وہ اس کے بیڈ کے پاس ہی کونے پر بیٹھ گیا تھا۔ حریم کئی لمحے اسے آنکھیں پھاڑے دیکھتی رہی۔ پھر جانے کیا ہوا وہ خود سمجھ نہ سکا

کہ حریم پاگلوں کی طرح آ کر اس کے سینے سے لگی تھی اور ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر رونے لگی تھی۔ اس پر ہذیانی کیفیت طاری تھی۔

”سرجی، مجھے مر جانے دیں، مجھے نہیں جینا۔“

وہ اسے بری طرح جھنجھوڑ رہی تھی۔ اسفند کی اپنی حالت اس وقت بہت عجیب ہو رہی تھی۔ وہ کیا کرے، کیسے اسے سنبھالے۔ کیا کہے۔ اس نے بہت ہمت کر کے کافی وقت اسے رونے دیا۔ پھر مضبوطی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

”زندگی اللہ پاک کی سب سے بڑی نعمت ہے حریم، ایسے نہیں کہتے۔ اور تم تو بہت بہادر ہونا! تم نے یہ کیوں کیا.....؟“

اس نے سوال کیا۔

وہ لمحہ بھر کوچپ ہوئی تھی۔ اس کے لب پھر لرزے تھے۔ خوف کی وہ ہی کیفیت پھر سے اس پر طاری ہوئی تھی اس کا زرد ہوتا چہرہ یکدم لٹھے کی مانند سفید ہوا تھا۔

”جس زندگی کو میں سراٹھا کر نہ جی سکوں اسے ختم ہو جانا بہتر نہیں ہے سر!“

حریم کو جانے اس پر اتنا اعتبار کیوں تھا کہ اس نے جو لب سی لیے تھے صرف اسفند کے سامنے کھول دیے اور اسفند اس کے لرزے لبوں سے نکلنے والے لفظ سن کر جیسے پتھر کا ہو گیا تھا۔

ضبط کی انتہا تھی اس کی۔ ورنہ جو حقیقت حریم نے اسے بتائی تھی وہ ناقابل معافی تھی۔

”ایک بار مجھے بتاتی تو سہی یہ قدم اٹھانے سے پہلے۔“

”کتنے فون کیسے تھے آپ کو.....؟؟ حریم کے بتانے پر اس کو مس کا لڑکا دھیان آیا۔ اس وقت وہ درید کے گھر میں تھا۔

میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ ہمیں پولیس کو بتانا چاہیے۔“

”نہیں۔“

وہ یکدم چیخی تھی۔

”آپ کو قسم ہے اس ذات کی جو ہماری جان و آبرو کا مالک ہے۔ یہ بات آپ کے اور میرے بچ رہے گی۔ اگر آپ مجھے زندہ

دیکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ سراٹھا کر جینے کے قابل نہیں رہی میں۔“

وہ بے بسی سے لب کچل کر رہ گیا۔ مگر حریم.....

”انصاف اس رب سے بہتر کوئی نہیں کرتا۔ میں نے اپنا مقدمہ اس کی عدالت میں چھوڑ دیا ہے۔ مجھے تماشہ نہیں بننا سرجی، پلیز!“

اس نے دونوں ہاتھ اسفند کے سامنے جوڑے۔ ضبط سے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔

”وہ اتنے عرصے تمہیں تنگ کر رہا تھا حریم اور تم نے ایک بار بھی مجھے نہ بتایا۔ مجھ سے شیر تو کرتیں شاید آج۔“

وہ بولتے بولتے لب بھینچ گیا۔

”اگر مجھے اندازہ ہوتا تو میں کبھی تمہیں اکیلے نہ رہنے دیتا وہاں۔“

”کچھ نہیں بچا سر۔ کاش میں مرجاتی۔ مجھ سے یوں نہیں جیا جائے گا۔ مجھے ماردیں پلینز مجھے ماردیں۔“

اسفند نے اس کے جڑے ہوئے ہاتھ تھام لیے تھے اور اسے خود سے لگالیا۔ وہ کتنے ہی وقت روتی رہی اس کے سینے سے لگی۔

”ایسے نہیں کہتے حریم، تم اب تنہا نہیں ہو۔“

اس نے حریم کو تسلی دی تھی۔ ڈاکٹرز سے بات کر کے پتا چلا کہ ابھی مزید دو تین دن اسے یہاں رکنا ہوگا۔ اس کا معدہ اچھی طرح واش کرنا تھا۔

وہ گھر لوٹ تو آیا تھا مگر دل وہیں اس معصوم لڑکی میں اٹکا ہوا تھا۔ سب کے درمیان بیٹھا بھی وہ جیسے یہاں تھا ہی نہیں۔

’خیرت ہے بگ بی، آج سے پہلے کبھی آپ کو اتنا زیادہ پریشان نہیں دیکھا۔‘

طلال کے کہنے پر وہ چونکا تھا۔ سب اس کی طرف متوجہ تھے۔

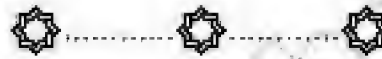
”کچھ نہیں یار، بس سر میں درد ہے۔“

”سر کا مساج کروں بھائی جان۔“

نبال نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا تھا مگر وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”چائے پی لوں گا تو سکون ہو جائے گا۔“

”کہاں جا رہے ہیں، مریم بنادے گی۔“



بلال نے فوراً ہی ہاتھ پکڑ کر روکا تھا۔

”نہیں یار وہ پریشان ہوگی۔“

”اسفند یہ غیروں والی بات نہ کیا کر۔ ہم سب ایک گھر میں رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کے چھوٹے چھوٹے کام بھی نہیں کر

سکتے۔ پہلے ہم بچن میں خود کام کرتے تھے۔ ہماری مجبوری تھی مگر اب جبکہ خاتون ہے بچن سنبھالنے کے لیے، پھر کیوں کریں.....؟“

”اسفند بھائی میں بنالاتی ہوں۔“ مریم نے جلدی سے کہا اور بچن کی جانب چل دی۔

وہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ چائے پی کر بھی اسے سکون نہیں آیا۔ سر میں جیسے جھکڑ چل رہے تھے اور یہ رات پھر اسے کرسی پر بیٹھ کر

گزاری تھی۔

قربا تین بجے درید کی آنکھ کھلی تھی۔ اسے چیئر پر بیٹھا دیکھ کر وہ بہت حیران سا اس کے پاس آیا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ

پوچھتا، اسفند نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے سر پر رکھ دیا۔

”تجھے قسم ہے میری، کچھ پوچھنا مت، کیونکہ تیرے آگے کمزور پڑ جاؤں گا اور میں نے کسی سے وعدہ کیا تھا کچھ نہ کہنے کا۔“

درید اسکی سرخ ہوتی آنکھیں دیکھتا رہ گیا۔ وہ شروع سے کم بولتا تھا ان سب میں مگر اس نے آج سے پہلے اسفند کو اتنا پریشان، اتنا بکھرا ہوا نہیں دیکھا تھا۔

”اچھا، نہیں پوچھتا مگر تو سو جا، ورنہ مجھے بھی نیند نہیں آئے گی۔“

”لیٹ جاتا ہوں مگر نیند نہیں آئے گی۔“ اور وہ کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔

صبح وہ تیز بخار میں پھنک رہا تھا۔ یہ صورتحال درید کے لیے پریشان کن تھی۔ اس پریشانی میں ناشتہ بھی بڑی خاموشی سے کیا جا رہا تھا۔ تب ہی وہ اٹھ کر آ گیا۔

”کہاں؟؟ ریٹ کر، میں نے تیرے آفس فون کر دیا ہے۔“

اس نے اسفند کو روکا۔

”آفس نہیں جا رہا کچھ ضروری کام ہے جلدی آ جاؤں گا۔“

”اسفند تجھے اتنا تیز بخار ہے کہ تیرا چہرہ بھی سرخ ہو رہا ہے بخار سے اور تو کہتا ہے جانا ضروری ہے۔“

”درید پلینز میں میڈیسن لے لوں گا۔“

اس نے فٹ سے کہا تھا۔ درید بے بسی سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

اس کی فکر ان سب کو ہو رہی تھی جسے آج کل اپنی تو فکر تھی ہی نہیں۔

دو دن بخار رہا مگر اسے جیسے پرواہ نہیں تھی۔

”کہاں ہے تو.....!!“

”میں آؤٹ آف شٹی ہوں، کل آؤں گا۔“

درید کے لیے یہ خبر کسی جھٹکے سے کم نہ تھی۔ اسفند فون کاٹ چکا تھا۔ وہ حریم کو لے کر جس در پر آیا تھا وہاں اسے یقین تھا کہ حریم کو

مکمل محفوظ پناہ ملی تھی۔ امی اور یا سر اس کی اچانک آمد اور اس کے ساتھ لڑکی دیکھ کر حیران ہوئے تھے مگر اس نے حریم کے سامنے کوئی بات نہیں کی۔ اسے ڈاکٹرز کی تجویز کردہ میڈیسن دی تھی۔ جب وہ سکون نیند میں چلی گئی تو وہ امی کے پاس آیا تھا۔

”امی! حریم بے سہارا ہے۔ اس کے والدین اس دنیا میں نہیں رہے ہیں۔ گھر کے پیچھے اس کے رشتے داروں نے حریم کی جان

لینے کی کوشش کی ہے۔ یہ وہاں بالکل محفوظ نہیں تھی اس لیے میں یہاں لے کر آیا ہوں۔“

”اس کی حالت دیکھ کر میں سمجھ گئی تھی کہ بچی کسی صدمے کے زیر اثر ہے۔“

”جی، بہت گہرا اثر لیا ہے حریم نے۔“

اس نے جھوٹ کہا تھا۔ مگر اللہ سے معافی بھی مانگی تھی۔ امی نے اسے یقین دلایا تھا، وہ حریم کا بہت خیال رکھیں گی۔ آتے وقت



حریم رو پڑی تھی۔

”پلیز حریم.....! تم یہاں بالکل محفوظ ہو اور ہاں پلیز اپنا خیال رکھنا۔“

”میں بوجھ بن گئی ہوں آپ پر بھی اور میری وجہ سے آپ بھی مشکل میں آ گئے۔“

”یہ کیا فضول سوچ ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ تم مجھ پر بوجھ نہیں۔ میری ذمہ داری ہو۔“

وہ کہہ تو گیا..... مگر آخر کیا رشتہ تھا ان میں کہ وہ اس کی ذمہ داری بن گئی تھی۔ محض انسانیت کے ناطے وہ اتنا کچھ کر رہا تھا۔

”یہ ساتھ میں میرب رہتی ہے۔ امی تمہیں اس سے ملو ادیں گی۔ وہ بھی ماسٹرز کر رہی ہے۔“

”مجھے نہیں پڑھنا، مجھ میں دنیا کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے۔“

”مت سوچا کرو ایسا..... تم معصوم ہو، پاک ہو۔“

”ایسا صرف آپ سوچتے ہیں یا پھر محض مجھے تسلی دیتے ہیں..... مجھ سے پوچھیں کہ مجھے اپنے وجود سے کتنی گھن آتی ہے۔“ وہ

ایک بار پھر رو پڑی۔

”نہیں حریم، میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں اپنے دل سے تمہیں معصوم اور پاکیزہ مانتا ہوں۔ تمہارے ساتھ جو ہوا، اس میں

تم بے قصور ہو۔ ایسا کبھی نہ سوچنا کہ میں صرف تمہیں تسلی دیتا ہوں۔“

”آپ کو دیکھ کر رب کی قدرت پر یقین پختہ ہوتا ہے کہ ابھی بھی اس دنیا میں اچھے لوگ ہیں۔“

”تم صرف اپنا خیال رکھنا حریم۔“ وہ آخری وقت تک اسے سمجھا کر واپس آیا تھا مگر روز اس سے بات کرنا اس کے معمول میں

شامل ہو گیا تھا۔

جو چہنچ درید عباس کو اس میں نظر آیا تھا وہ بہت پوزیٹو تھا۔ اسفند واپس آ کر درید کو بتا رہا تھا کہ وہ حریم کو فیصل آباد چھوڑ آیا

ہے۔ یہ خبر درید کے لیے حیران کن تھی مگر وہ خوش تھا کہ اسفند نے اس گھر کو اور وہاں رہنے والوں کو واقعی اپنا مانا۔



چار ماہ گزر گئے تھے۔ درید اور یاسر کی شادی سر پر آ گئی تھی۔ اور رات ہی حریم نے اسے کہا تھا کہ آئی ناراض ہو رہی ہیں کہ اتنے

کام ہیں یاسر اکیلے کیسے کرے گا۔ اس نے درید کو بتا دیا تھا۔ سوتے یہ پایا تھا کہ وہ سب اکٹھے جائیں گے۔ یوں بھی درید عباس کی شادی کو

لے کر سب بہت ایکساٹینڈ تھے۔ خاص کر طلال اور نہال۔ وہ لوگ ایک ہفتہ پہلے ہی فیصل آباد پہنچ گئے تھے۔ امی ان سب کو دیکھ کر بہت

خوش ہوئی تھیں۔ مریم کو بھی بہت پیار سے گلے لگا کر پیشانی چومی تھی۔ رہی بات اسفند کی تو اسفند سے انہیں محبت بالکل درید کی طرح تھی۔

اسے دیکھ کر انہیں دل میں ٹھنڈک اترتی محسوس ہوتی تھی۔

”اب قدرے فکر کم ہوئی ہے، درندائے کام باقی ہیں کہ دل ہول رہا تھا۔“ انہوں نے پیار سے اسفند کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ بس ریلیکس ہو جائیں۔ کام یوں ختم ہوں گے کہ آپ کو پتا بھی نہیں چلے گا۔“ اسفند نے انہیں ساتھ لگا کر کہا تھا اور اسفند کی بات پر انہیں بھروسہ بھی تھا۔ وہ مسکرا دی تھیں۔

”حریم کا سنائیں..... خوف کی کیفیت سے نکلی۔“ وہ سب اپنی باتوں میں مصروف تھے اور اسفند نے بہت ہولے سے ان سے دریافت کیا تھا کیونکہ جب سے وہ آئے تھے حریم محض سلام کرنے آئی تھی۔ اس کے بعد سے دوبارہ نظر نہیں آئی۔

”اللہ کا شکر ہے بچے، اب بہت نارمل ہے۔ پہلے تو گیٹ کی آہٹ پر یوں سہم جاتی تھی جیسے سفید لٹھا ہو۔ مگر اب یقین کرو، پورے اعتماد سے گھر کے سارے کام میرے ساتھ کرواتی ہے۔ تمہارے ابو اور یاسر سے پہلے بات تک نہیں کرتی تھی۔ مگر اب اکثر شام کا وقت ابو کے پاس بیٹھ کر گزارتی ہے۔ کبھی میرب کے پاس چلی جاتی ہے۔“ انہوں نے تفصیلاً بتایا تو اس نے گہری سانس لی اور دل میں رب العزت کا شکر ادا کیا۔

”مگر اسفند..... گھر سے باہر نکلتے اب بھی گھبراتی ہے۔ لوگوں کو فیس نہیں کرتی۔“ یاسر بھی اس کے ساتھ ہی آ بیٹھا تھا۔

”کئی بار بازار جانا پڑا۔ بلیوی اتنی خوفزدہ رہتی تھی۔ سارے وقت کہ امی کا ہاتھ نہیں چھوڑتی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اس کے اندر کا اعتماد لوٹے.....“

”وقت لگے گا یاسر..... جہاں اتنا کور کیا ہے، ان شاء اللہ یہ بھی دور ہو جائے گا۔“ اسے اللہ پر بھروسہ ہے۔

شادی کے اتنے کام تھے۔ کچھ وہ لوگوں کے باعث گھر کے کسی کونے میں گھسی رہتی تھی۔ اسفند اب تک اس سے بات نہیں کر پایا تھا۔ درید اور یاسر کی مہندی والے دن بھی یاسر زبردستی اسے باہر لایا تھا۔

”ایک ہی بہن ہو تم ہماری، اور تم ہی مہمانوں کی طرح چھپی بیٹھی ہو، ہمارے ساتھ بیٹھو۔“

وہ آج بھی معمول کے حلیے میں تھی۔ ڈریس ضرور نیا تھا مگر چہرہ ہمیشہ کی طرح سادہ اور شفاف تھا۔ بلیک اسکارف اسی طرح سر اور پیشانی تک لپٹا ہوا تھا۔ اتنے دن میں آج وہ دکھائی دی تھی۔ یہ بات خوشگوار تھی کہ وہ کم از کم گھر کے افراد سے بہت انچ ہو گئی تھی۔

یاسر نے تمام وقت اسے اپنے ساتھ بٹھا کر رکھا تھا۔ مگر رسم کے فوراً بعد وہ ہٹ گئی۔

”آپی پلیز! ایک فوٹو تو بنوالیں۔“ طلال نے پکارا تھا مگر اسفند نے اس کے کندھے پر ہاتھ دھر کے روک دیا۔

”وہ نہیں بنوائے گی۔“ طلال نے بڑی حیرت سے دیکھا تھا اسفند کو، کیونکہ وہ ہرگز نہیں جانتا تھا اسفند حریم کو یہاں لایا ہے۔

شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ ویسے کے بعد جب تمام کام ختم ہو گئے اور وہ لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے تو اچانک سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

”مجھے آپ کے ساتھ واپس جانا ہے۔“ اس نے سیدھا اسفند کو مخاطب کیا تھا۔

”بیٹھو!“ اسفند نے سکون سے کہا۔ وہ درید کے ساتھ ہی چار پائی پر بیٹھ گئی تھی۔

”یہاں تمہیں کوئی پرابلم ہے؟“ اس نے حریم کی طرف دیکھ کر سوال کیا تھا۔ وہ جزیزی ہاتھوں کی انگلیاں مروڑنے لگی۔ دریدائٹھ کھڑا ہوا۔

”میں آتا ہوں۔“

اسے لگا کہ شاید اس کی موجودگی میں وہ کھل کے بات نہ کرے، اس کے جانے کے بعد اسفند نے سوال پھر دہرایا تو اس نے پانی سے بھری آنکھوں سے اسفند کو دیکھا تھا۔

”میں مزید کسی پر بوجھ بننا نہیں چاہتی۔ میرے اکاؤنٹ میں اتنا پیسہ ہے کہ میں اپنا خرچ بخوبی چلا سکتی ہوں۔“

”تم نے خود کو بوجھ کیوں کہا۔“ ساری بات نظر انداز کر کے اسفند نے سوال کیا تھا۔

”سر..... برا وقت جو تھا بیت گیا۔ اب میں ٹھیک ہوں۔ پھر مجھے جہاں جو پرابلم ہوئی میں آپ سے کانٹیکٹ کر لیا کروں گی۔“

پہلے آنی تنہا تھیں مگر اب یا سر بھائی درید بھائی دونوں کی وائف ہیں۔ مجھے مزید یہاں نہیں رہنا پلینز.....“

”وہاں جا کر کیا کرو گی حریم! اکیلے رہنا تمہارے لیے ٹھیک نہیں ہے۔“

”اکیلا پن عمر بھر کا ہے۔ میں عارضی سہاروں کی عادی ہو گئی تو پھر کیسے رہ پاؤں گی۔“

”مگر ابھی میں تمہیں وہاں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔“

”پلینز.....“ وہ گڑ گڑائی۔

وہ مزید بات کرتے مگر امی آگئیں اور انہوں نے بات کو وہیں چھوڑ دیا مگر اس کے چہرے پر جو پریشانی اتر آئی تھی وہ درید دیکھ

چکا تھا۔

”کب تک..... اسفند ضیاء، کب تک خود کو کسی کی بے وفائی کی آگ میں جھلساؤ گے۔ جس نے کبھی تمہیں چاہا ہی نہیں، اس کے لیے اپنا آپ برباد کر رہے ہو۔ اور جو تمہیں چاہتی ہے.....!“ اس کی آخری بات پر اسفند نے بے یقینی سے دیکھا تھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو۔ بھلا تمہیں کسی اور کی آنکھوں میں محبت نظر کب آتی ہے۔ تمہیں تو وہ ہی آنکھیں سچ لگتی ہیں جو دھوکہ

تھیں۔“

”وہ میری عزت کرتی ہے، بہت احترام ہے اس کی نظروں میں میرے لیے۔“

”تو.....! جہاں عزت کی جائے وہاں محبت نہیں ہو سکتی۔ کب تک خود کو دھوکہ دو گے اسفند..... صرف عزت اور احترام کے لیے

وہ آنکھیں بند کر کے تمہارے ساتھ آگئی تھی۔ کیوں کرتی ہے وہ تم پر اتنا اندھا اعتماد، میں بتاتا ہوں۔ پیار کرتی ہے وہ تم سے، تبھی اپنی زندگی

کے ہر فیصلے کا اختیار تمہیں سونپ دیا ہے۔ مگر تم..... تمہاری طرف سے اسے کیا ہمیشہ کا انتظار ملے گا۔“

”یہ فقط تمہاری سوچ ہے درید۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھامنا تھا اور خود کو ریلیکس کرنے کے لیے کچھ دیر طلال اور نہال

کے پاس جا بیٹھا۔

کل ان سب کی واپسی تھی سوائے درید کے، جس نے چند دن بعد آنا تھا۔

”مریم بھابی! انجوائے کیا آپ نے.....؟“ درید نے پوچھا۔

”جی، بہت انجوائے کیا.....“

”بھابی! درید بھیا دوسرے لفظوں میں پوچھنا چاہ رہے ہیں کہ آپ کو میرب بھابی کیسی لگیں؟“ طلال نے اسے چھیڑا تھا۔ درید

ہنس دیا۔

”جی نہیں..... مجھے پتا ہے کہ میرب بہت اچھی ہے۔“

”ہاں واقعی میرب بہت اچھی ہے۔“ مریم نے مسکرا کر کہا تھا۔ حریم سب کے لیے چائے اور ناشتہ لے کر آئی تھی اور سب کو سرو کر

کے خود بھاگنے کے چکر میں تھی کہ درید نے ٹوک دیا۔

”بیٹھو سب کے ساتھ بیٹھ کر چاؤ پیو۔“

”بھیا، مجھے امی کے ساتھ کام کرنا ہے۔“

”ہو جائیں گے کام بھی..... یونیورسٹی سسٹر، مہمانوں کو ٹائم دینا بھی آپ کے فرائض میں شامل ہے اور بعد میں آپ ہمیں یاد

کریں گی۔“ طلال نے اسٹائل مارتے ہوئے کہا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دی۔

”حریم! یہ سب ہماری فیملی کا حصہ ہیں۔ ان کے ساتھ وقت گزارو بلیو می، تمہیں اچھا لگے گا۔“

”میں جانتی ہوں.....“ وہ کچھ کہتے لب پہنچ کر اسفند کو دیکھنے لگی۔ بس پل بھر کو دونوں کی نگاہیں ملی تھیں۔ پھر حریم ہی سر جھکا گئی۔

”کیوں کر رہی ہو تم اس طرح سے۔“

”کیونکہ میں واپس جانا چاہتی ہوں۔ میں مزید احسان کا بوجھ نہیں سہہ پاؤں گی۔“ موقع ملتے ہی وہ پھر اس کے سامنے آ کھڑی

ہوئی تھی۔

”تمہیں یہاں کوئی مسئلہ ہے؟“ اسفند نے گھور کر اس کو دیکھا۔

”نہیں..... مگر مجھے اچھا نہیں لگتا، میں ساری عمر بوجھ نہیں بن سکتی۔“

”حریم! پھر وہی بات۔ تم بوجھ نہیں ہو کسی کے لیے بھی اور میں نے تمہیں یہاں اس لیے بھیجا تھا تا کہ تمہیں تنہا نہ رہنا پڑے۔ مجھ

سے کوئی غلطی ہوئی، کس بات پر تمہیں اعتراض ہے؟“

”آپ کو نہیں لگتا کہ میرے یہاں رہنے پر سب کو اعتراض ہو سکتا ہے۔ امی کب تک جھوٹ بولیں گی اور اب تو رشتہ داری بڑھ گئی

ہے۔ یا سر بھائی کے سسرال والے آئیں گے، ہر شخص جانتا ہے کہ اس گھر میں لڑکی نہیں ہے پھر میرا وجود؟ آخر کب تک چپ رہ سکیں گے



سب.....“ وہ چیخ پڑی۔

”پاگل ہو گئی ہو تم.....“ پہلی بار اسے حریم پر غصہ آیا تھا۔

”ہاں.....! شاید مگر میں کل آپ کے ساتھ جا رہی ہوں۔“ وہ حتمی فیصلہ سنا کر مڑ گئی تھی۔

”تم نہیں جاؤ گی۔“

”کیوں؟ آپ مجھے عمر بھر سوالیہ نشان بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ میں مانتی ہوں کہ آپ کا بہت بڑا احسان ہے مجھ پر.....“

”میں نے جو کیا، اپنا فرض اپنی ذمہ داری سمجھ کر کیا۔ کبھی بھی تم پر احسان جتانے کو نہیں کیا۔“

”کس حق سے ذمہ داری ہوں میں آپ کی؟“ کس قدر غیر متوقع سوال تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھنے لگا۔

”آج یہ سوال صرف میں نے کیا، آنے والے وقت میں سب کریں گے۔ اس دور میں انسانیت کے ناطے کی جانے والی نیکی

کوئی تسلیم نہیں کرتا۔“ وہ آج پھٹ پڑی تھی۔ اسفند ضیاء اس کے چہرے پر ضبط اور غصے سے پھیلنے والی سرنخی دیکھ رہا تھا۔ بس ایک لمحہ لگا تھا اسے سوچنے میں، اس کے بعد وہ مطمئن تھا۔

”تمہیں اور لوگوں دونوں کو تمہارے سوال کا جواب مل جائے گا کل تک..... او کے!“ اتنے سخت لہجے میں پہلی بار مخاطب ہوا تھا وہ

حریم فاطمہ سے مگر جو لفظ حریم نے اسے کہے تھے، وہ اس کے دل پر لگے تھے۔ وہ واقعی اب تک حقیقت سے نگاہیں چرا رہا تھا۔ سو فیصلہ ہو گیا

اور فیصلہ ہوا تو..... دیر بھی نہ لگی تھی۔ اگلے دن بہت سادگی سے بالکل شرعی انداز میں اس نے حریم فاطمہ سے نکاح کر لیا تھا۔ یہ بات سب

کے لیے باعث حیرت تھی۔ مگر دریدہ تو منتظر تھا، اسے یقین تھا جلد یا بدیر یہ ہی ہونا تھا۔

نکاح کا دو گھنٹے کے بعد انہیں واپس جانا تھا۔ تب ہی وہ اس سے مل کر بات کرنا چاہتا تھا۔

”مجھے یقین ہے کہ آج کے بعد تم خود کو بوجھ ہیں سمجھو گی۔ تم میری ذمہ داری ہو کس حق سے؟ اب تمہیں یہ بھی خود یا لوگوں کو بتانا

نہیں پڑے گا۔“ وہ بہت سنجیدہ تھا۔ آج بھی اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ جیسے اکثر وہ حریم سے بات کرتے وقت کرتا تھا مگر حریم کو لگا وہ

غصہ میں ہے۔

”آپ میرے لفظوں سے ہرٹ ہوئے تھے۔“ اس کی بہت دھیمی سی آواز آئی تھی۔

”میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی تعلیم مکمل کرو۔ تمہارے والدین کا خواب تھا کہ تم اسلامک ہسٹری میں ماسٹرز کرو اور مجھے بھی خوشی ہوگی

اگر تم ایسا کرو گی۔ میرب بھابی تمہیں ایڈمیشن وغیرہ میں ہیلپ کر دیں گی۔ اور تم کو کوئی بھی پرابلم ہو، کسی بھی قسم کی مجھے فون کر دینا۔ مجھے

یقین ہے کہ اب تمہیں مجھ سے کچھ کہتے اپنا وجود بوجھ محسوس نہیں ہوگا۔“

وہ اپنی بات مکمل کر کے اٹھ گیا تھا مگر کمرے سے باہر نکلنے لگا تو اس کی آواز پر قدم رک گئے۔

”آئی ایم ریلی سوری! میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں اسی شخص کو ہرٹ کرنے کا باعث بنوں گی جو میرا محسن ہے۔ میرے

لفظوں سے آپ کو تکلیف ہوئی، اس کے لیے میں سخت شرمندہ ہوں۔“

اس کے لفظوں پر اسفند نے پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔ جس کی ساری توجہ اس کی طرف ہی تھی۔ مگر اس کے لیے حریم فاطمہ بالکل نئی تھی۔ اس نے آج تک اس کو بنا اسکارف کے نہیں دیکھا تھا مگر اس وقت وہ سر پر صرف دوپٹہ لیے ہوئے تھی۔ یقیناً نکاح کے وقت اسے تیار کیا گیا تھا۔ وہ ڈریس چینج کر چکی تھی مگر چہرے پر میک اپ اب بھی موجود تھا۔ کئی لمحے وہ نگاہ نہیں ہٹا سکا تھا۔ اس کے پاکیزہ اور معصوم حسن کو دیکھ کر.....

”میں ناراض نہیں ہوں۔ اس بات کو لے کر پریشان نہ ہونا۔ ہاں جو کچھ ہوا یہ میرے اور یقیناً تمہارے لیے بھی غیر متوقع تھا۔ مگر میرا ایمان ہے کہ بنا اللہ کی مرضی کے کچھ بھی ممکن نہیں۔“ اسفند نے نظریں اس کے چہرے پر ہی جمائی ہوئی تھیں اور اپنی بات مکمل کرتے ہی وہ باہر چلا گیا۔



”اگر تیری یہی حالت رہی تو تیرے آفس والے تجھے فارغ کر دیں گے۔“ محض پندرہ دن بعد پھر وہ فیصل آباد کے لیے تیاری کر رہا تھا۔ جب اسفند نے ٹوکا تھا۔

”کیا کروں..... دل نہیں لگتا اب.....“ اس کے لہجے میں سچائی تھی، محبت تھی۔ اسفند کئی لمحے اسے دیکھتا رہا۔

”میری مانو، میرب کو یہیں لے آؤ۔“

”کہا تھا میں نے اسے، وہ نہیں مانی۔ کہتی ہے کہ امی کے پاس رہے گی۔“ اس نے بیگ بند کرتے ہوئے اسفند کو جواب دیا تھا۔

”اس نے ایم ایڈ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ محترمہ کی شادی ہو گئی ہے مگر پڑھائی کا جنون نہیں گیا۔“

”اچھا ہے ناں۔“

”تو بھی چل ناں..... حریم خوش ہو جائے گی۔ پچھلی بار میں گیا تو اس کی نظریں کتنی دیر گیٹ کی طرف رہیں کہ شاید تم بھی آئے ہو۔“

”تم پاگل ہو درید عباس۔“ وہ آنکھیں چرا کر بولا۔

”تو کیا تم نے صرف ذمہ داری نبھانی ہے۔ تمہیں حریم سے محبت نہیں ہے۔ بول..... چپ کیوں ہے۔ درید پوچھ رہا تھا۔“

ٹھیک ہی تو سوچ رہا تھا کیونکہ وہ جس دن سے آیا تھا مڑ کر اس نے نہیں دیکھا تھا۔ حتیٰ کہ پہلے خود روز فون کرتا تھا اور اب کبھی حریم ہی کال کر لیتی تو ٹھیک وگرنہ اس نے کال تک کرنا چھوڑ دی تھی۔

”تجھے دیر ہو رہی ہے..... جا.....“ وہ سنجیدگی سے اس کا کاندھا تھپک کر اٹھ گیا تھا۔

”موڑ لو..... سچائی سے جب تک منہ موڑ سکتے ہو موڑ لو اسفند ضیاء، مگر ایک دن تمہیں احساس ہوگا۔“

دو ماہ گزر گئے تھے اسے آئے۔ ان دو ماہ میں درید کا تیسرا چکر تھا اور وہ جیسے بھول گیا تھا کہ کسی کی آنکھوں میں اپنے نام کے دیے

جلا کر آیا تھا۔

”تقریر کرتا رہا تو ٹرین مس ہو جائے گی تیری۔“ اس نے مسکرا کے مزید جلا یا تھا اسے۔  
”تجھے تو واپس آ کر پوچھوں گا میں۔“

اس نے بیگ کا ندھے پر ڈالا اور اسفند نے بایک کی چابی اٹھائی تاکہ اسے اسٹیشن چھوڑ آئے۔  
ٹرین چلنے سے پہلے اس نے کچھ رقم درید عباس کو تھمائی تھی۔

”میرب سے کہنا اسے ایڈمیشن میں ہیلپ کر دے۔ مزید کسی بھی طرح کی ضرورت ہوئی تو مجھے بتا دینا۔“

”اسفند اسے صرف ان روپوں کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے سنہری کانچ سی آنکھوں میں دیکھا تھا جن میں یکدم ہی بے چینیوں تیرنے لگی تھیں۔

”خیانت کر رہا تھا تو حریم کے ساتھ..... جس دل میں جن نظروں میں اسے ہونا چاہیے وہاں اب تک کسی بے وفا ہرجائی کی یادیں ہیں اور اس کے ٹوٹے وعدوں کی کرچیاں لگا ہوں میں لیے بیٹھا ہے تو..... مجھ سے زیادہ تجھے علم ہے اسفند کہ حریم کے کتنے حقوق تم پر واجب ہیں۔“

”دعا کیا کر درید، اللہ پاک میری مشکل آسان کر دے۔“ درید کے پہنچتے ہی حریم کی کال آ گئی۔

”تھینکس..... آپ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔“ وہ دھیمی سی آواز میں کہہ رہی تھی۔

”مزید ضرورت ہو تو بتا دینا اور تھینکس کی کیا بات ہے، یہ تو میرا فرض ہے۔“

”مجھے پیسوں کی ضرورت نہیں..... جس کی ضرورت ہے وہ تو شاید بھول ہی گیا۔“ مگر وہ ایسا کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

اس سے کہیں بہتر وقت تو وہ تھا جب ان میں کوئی رشتہ نہیں تھا مگر وہ اس کی ہر خوشی کی کیمر کرتا تھا۔ روز فون کرتا تھا اور اب..... وہ خود کبھی دل کو کڑا کر کے اسے فون کرتی تھی۔ کیونکہ اب اس کا لہجہ بھی ویسا نہیں تھا۔ اکثر ہی وہ اس انداز میں بات کرتا جیسے زبردستی کر رہا ہو اور یہ بات حریم کو شدید تکلیف دیتی تھی۔

”آپ سے بات کرنی ہے۔“ کئی لمحے خاموشی کے بعد اس کی آواز گونجی تھی۔

”کہو، سن رہا ہوں۔“

”میرے تمام ڈاکومنٹس، تمام پیپرز وغیرہ تو وہیں ہیں..... مجھے ایک بار تو اپنے گھر آنا ہو گا ناں!“ اس کی بات پر کئی لمحے وہ چپ

رہا تھا۔

”حریم! میں خود تمہیں رات میں فون کروں گا۔ اس وقت میں تھوڑا بڑی ہوں۔“ وہ کتنی دیر منتظر رہی تھی اس کے جواب کی اور اس

نے جواب دیا بھی تو کیا۔ حریم نے بنا کچھ کہے لائن کاٹ دی تھی۔

وہ رات بھر انتظار کرتی رہی لیکن کال نہیں آئی تھی۔ اس کی بے جا چپ میرب سے چھپ نہ سکی۔  
”اتنی اُداس کیوں ہو؟“

”نہیں تو..... بس یوں ہی۔“ وہ گھٹنوں میں سر دیے سوچوں میں گم بولی تھی مگر میرب کو لگا اس کی آواز بھیگ رہی تھی۔

”تم رو رہی ہو حریم.....!“ مگر جواب میں وہ بولی نہیں تھی جس سے میرب کا شک یقین میں بدل گیا تھا۔ وہ اٹھ کر اس کے پاس آ گئی۔ خاموش تو کل دوپہر سے ہی تھی مگر صبح سے تو چہرہ بہت اُترا ہوا تھا۔

”حریم! کیا ہوا ہے؟“ اس نے حریم کو کندھوں سے تھام کر ساتھ لگایا۔ وہ حقیقتاً رو رہی تھی۔ میرب نے اس کے آنسو صاف کیے۔

”کیا بات ہوئی..... گھر میں کسی نے کچھ کہا۔“ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”پھر اسفند بھائی نے کچھ کہا ہے۔“

”اول ہوں۔“

”بس آج مما بہت یاد آ رہی ہیں میرب..... میری ممانے میرے لیے کتنی جدوجہد کی کہ میں معاشرے میں کمزور عورت بن کر زندگی نہ گزاروں بلکہ ان کی طرح ڈٹ کر حالات سے مقابلہ کروں اور کامیاب زندگی گزاروں۔ لیکن شاید میرے نصیب میں کمی تھی۔ یا میں ان کی طرح بہادر نہیں تھی۔“

”پاگل ہو تم بالکل، اچھے بُرے حالات زندگی کا حصہ ہیں اور اسفند بھائی بھی تو یہ ہی چاہتے ہیں کہ تم خود میں اعتماد پیدا کرو۔ پھر سے وہی زندگی جیو.....“ اس نے ہولے سے اس کا سر تھپکا تھا۔

”مگر زندگی اب وہ نہیں رہی میرب..... سب کچھ بدل گیا۔“ وہ بہت دل شکستہ اور ٹوٹی ہوئی تھی۔

”کچھ بھی نہیں بدلا۔ ان شاء اللہ پہلے کی طرح ہو جائے گا سب کچھ۔“ درید جانے کہاں سے ٹپک پڑا تھا۔

”آنسو صاف کرو اور پکینگ کرو جا کے اپنی، سیاں جی کی کال آئی تھی رات آپ کے، آپ کو ساتھ لانے کا حکم دیا ہے۔“ وہ رات بھر منتظر رہی اور اس نے درید بھیا کو فون کر دیا تھا۔ مگر اتنے عرصے بعد اپنے شہر جانے کا سن کر ہی اس کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ درید اور میرب دونوں مسکرا دیے۔

”مجھے تو لگتا ہے میرب..... حریم کو سیاں جی ہی یاد آ رہے تھے۔“

”جی نہیں۔“ اس کا چہرہ گل رنگ ہوا تھا۔ مگر بس اک پل کو اور اس کی وجہ درید عباس جانتا تھا۔

اگلے دن وہ دونوں شام میں ملتان پہنچ گئے تھے۔ اسفند اب تک نہیں لوٹا تھا مگر باقی سب نے پرتپاک استقبال کیا تھا حریم فاطمہ کا۔ وہ عشاء پڑھ کر لوٹا تھا..... مگر اس وقت وہ نماز ادا کر رہی تھی۔ اسفند سب کے ساتھ لیونگ روم میں بیٹھ گیا تھا۔

”کیسے تھے سب..... امی ابو ٹھیک تھے۔“



”ایک دم زبردست امی تجھے یاد کر رہی تھیں۔“ وہ سر ہلا کے مسکرا دیا تھا۔

”میرب ٹھیک تھی، اسے بھی لے آتے۔“ سوچا تو تھا، چلو پھر کبھی سہی۔ درید ہولے سے مسکرا کر بولا۔

”السلام علیکم!“ وہ اندر داخل ہوئی تھی۔ اسفند نے اس کے سلام کا جواب بہت اچھے موڈ میں دیا تھا۔ اس کی خیریت دریافت کی

تھی۔ حریم کے دل پر جو بوجھ تھا کہ شاید وہ اب تک ناراض سا ہے، کم ہوا تھا۔

”چلو گی ابھی اپنے گھر.....!“

”اسفند! ساڑھے نو ہو رہے ہیں، صبح چلے جانا۔“ درید نے فوراً ٹوکا تھا۔

”صبح یار میں بہت بڑی ہوں۔“ اس نے درید کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر ناگوار سے تاثر تھے۔

”چلیں حریم!“

”جی.....“ وہ تبھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

بہت خاموشی کے ساتھ سفر گزرا تھا۔ نہ اس نے کچھ کہا اور نہ ہی حریم کو کوئی بات کی تھی۔ بائیک گھر کے عین سامنے روکی تھی اس نے۔

اپنے گھر کا لاک کھول کر قدم اندر رکھتے ہی اس کا دل بری طرح لرزا تھا۔ ایک خوفناک حادثہ اس کی ساری زندگی پر محیط ہو گیا

تھا۔ وہ اس گھر سے جڑی ساری خوشگوار یادیں جیسے بھول گئی تھی۔ بس وہ ہی دل دہلانے والا منظر یاد رہا تھا۔

اسفند نے یقیناً اس کی حالت نوٹس کی تھی تب ہی تو اس کا رخ ہوتا ہوا تھا اپنے مضبوط ہاتھ میں تھام کر قدم آگے بڑھائے تھے۔

حریم کا یہاں آتے ہی جیسے دم گھٹنے لگا تھا۔ جانے کیوں وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ حتیٰ کہ اسفند جیسے گھنے سایہ سے بھی

یکدم ہی خوف آنے لگا۔ بمشکل اس نے اپنی ضرورت کا سامان نکالا تھا اور چھوٹے سے بیگ میں ڈالا تھا۔

”اور کچھ چاہیے۔“ اسفند کی آواز پر وہ جیسے چونک گئی۔ اس کا پسینے میں شرابور چہرہ اسفند کی نگاہ سے اوجھل نہیں تھا۔ حریم نے نفی

میں سر ہلایا۔

”اوکے، چلو.....“ اس نے حریم کا ہاتھ تھاما۔ دوسرے ہاتھ میں بیگ اٹھایا تھا۔ رستے میں اس نے حریم کی حالت کے پیش نظر

اسے کولڈ ڈرنگ پلائی تھی۔

”ناؤ ریلیکس پلیز.....! تمہارے چہرے پر جو آثار ہیں اگر گھر جا کر بھی رہے تو سب کے سوالوں کی زد میں آ جائیں گے ہم.....“

”اور خاص کر میں..... درید نے تو میری بات پر یقین بھی نہیں کرنا۔ اس نے فوراً کہہ دینا ہے کہ میں نے تمہیں کچھ کہا ہوگا۔“

گھر پہنچے تو سب ہی سونے جا چکے تھے۔ درید لیونگ روم میں لیٹا تھا۔ حریم بیگ لے کر اندر چلی گئی۔

”تُو یہاں سوئے گا.....؟“ وہ درید کے پاس آ گیا۔

”تو کیا تمہارا حریم کو یہاں سنانے کا ارادہ ہے تاکہ ساری دنیا کے سامنے اپنا اور اس کا تماشا بنوا سکوں۔“ درید نے پلٹ کر بولا تو

اسفند کو گنگ کر گیا۔

”اگر تم میرے اچھے دوست ہو تو وہ مجھے بہنوں کی طرح عزیز ہے اسفند..... مجھے کم از کم اس طرح کے بی ہیویئر کی امید نہیں تھی۔“

”کیا کیا ہے میں نے؟“

”ایک شخص اپنی وائف کو دیکھ کر اتنا روڈ کیسے ہو سکتا ہے۔ حریم کی آنکھوں کے سارے خواب بکھر گئے ہوں گے۔“ وہ تو جیسے تلا ہی بیٹھا تھا کہ اسفند کو خوب سنائے گا۔

”فارگاڈ سیک درید! میں نے ایسا کیا کہہ دیا ہے اسے.....“

”ابھی عصر کے بعد ہم یہاں پہنچے تھے۔ تم صبح بھی تو لے جاسکتے تھے اسے..... کیا ہو جاتا اگر تمہاری ایک چھٹی ہو جاتی۔ وہ بیوی ہے تمہاری، اسکا تم پر اتنا بھی حق نہیں ہے۔“

اندازہ تھا اسے کہ درید بھڑکا بیٹھا ہوگا۔ سو وہ بھی موڈ آف کیے وہاں سے اٹھ کر کمرے میں آ گیا جہاں حریم شاید اس کی منتظر بیٹھی تھی۔

”بیٹھی کیوں ہو..... سو جاؤ۔ سفر کی تھکن ہے..... ریٹ کرو۔“ وہ نہیں چاہتا تھا کہ درید کے غصہ کا ذرا سا بھی تاثر حریم پر ہو، سو بہت نارل لہجے میں مخاطب ہوا تھا وہ۔

مگر شاید وہ اس کی جھجک نہیں سمجھ پایا تھا۔ یہ ٹھیک تھا کہ ان کا نکاح ہو چکا تھا، مگر یوں ایک روم میں سونا.....

اسفند اسے کہہ کر چیخ کر کے سونے کے لیے لیٹ گیا تھا۔ اور اسے جانے کیسے آج نیند بھی جلدی آ گئی تھی۔ مگر رات کے دوسرے پہر جب اس کی آنکھ کھلی تو بھک سے اس کی ساری نیند اڑ گئی تھی۔

حریم نیچے چادر بچھا کر سوئی ہوئی تھی۔ وہ یکدم اٹھ بیٹھا تھا۔ اسے جگانے لگا مگر پھر رُک گیا۔ اس کی نیند خراب ہونے کے خیال سے۔

لیکن اس کے بعد وہ رات بھر سونہ سکا تھا۔



”دو سال ہونے کو ہیں ہمیں یہاں آئے، انہوں نے پلٹ کر خبر نہ لی ہماری، پھر ہم کیسے جائیں۔ کیا ضمانت ہے کہ وہ ہمیں ہاتھ پکڑ کر باہر نہیں نکالیں گے گھر سے۔“ بلال صبح صبح بول رہا تھا۔ اسفند فجر کی نماز کے بعد لوٹا تو درید کے ساتھ بیٹھا تھا۔

”اپنی پرابلم.....“

”اس کے بڑے بھائی کا فون آیا ہے۔ ان کے اباجی کی طبیعت خراب ہے اور انہوں نے ان تینوں کو بلایا ہے۔“

”ریٹلی..... یہ تو اچھی بات ہے تمہیں جانا چاہیے۔“

”کیا گارنٹی ہے اسفند کہ جمال بھائی نے جو کہا وہ سچ ہے۔ اباجی کبھی ہمیں نہیں بلا سکتے۔ جمال بھائی نے اپنے پاس سے آنے کا کہا ہوگا؟“ بلال کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔

”دیکھو بلال! اگر جمال بھائی نے اپنے پاس سے بھی کہا ہے تو تمہیں جانا چاہیے۔ میں نے مانا کہ تمہارے ابا جی نے غلط فیصلہ کیا تھا مگر وہ تمہارے بڑے ہیں۔ ان کا مان اُن کا وقار قائم رکھنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ ضروری ہے کہ وہ بلائیں تب ہی تم جاؤ۔ وہ بیمار ہیں۔ تمہیں یہ خبر مل گئی ہے۔ تمہارا فرض ہے ان کی عیادت کے لیے جانا..... بے شک وہ ناراض بھی ہوں۔ مگر ان کے دل میں یہ خواہش ضرور ہو گی کہ ان کے بیٹے ان سے ملنے آئیں۔“ اسفند نے بہت خلوص سے اسے سمجھایا تھا۔

”اور اگر اب پھر انہوں نے ہمیں گھر سے باہر کھڑا کر دیا۔“

”سو اٹ..... تمہاری عزت تمہارے وقار میں کی نہیں آئے گی بلال، وہ بڑے ہیں..... ناراض ہو سکتے ہیں، لیکن تمہارا فرض ہے جانا۔“

”مجھے مریم کی فکر ہے، کہیں وہ مریم کے ساتھ زیادتی نہ کریں۔“

”نہیں کریں گے، کیونکہ اب وہ صرف ان کی بھتیجی نہیں ہے، ان کی بہو ہے۔ ان کے گھر اور بیٹے کی عزت ہے۔“

”نہال کو تو میں منالوں گا مگر طلال تو بہت ناراض ہے، وہ کبھی نہیں مانے گا۔“

”میری گارنٹی ہے۔ وہ کچھ نہیں کہے گا۔ تم تیاری کرو۔“ بلال سر ہلا کر اٹھ گیا تھا اور واقعی اسفند نے جانے کیسے منایا تھا طلال کو وہ

خاموشی سے ان کے ساتھ جانے کو تیار بیٹھا تھا۔

”مجھے یقین ہے بلال کہ تم ہر حالات میں برداشت سے کام لو گے۔“ بلال سے گلے ملتے ہوئے وہ بولا تھا۔ بلال نے مسکرا کر سر ہلایا۔

”اور طلال یہ ہی امید تم سے بھی ہے۔“

”آپ دعا کیجیے بگ بی..... ابا جی ٹھیک ہوں۔“ اسفند نے اسے سینے سے لگاتے ہوئے ان شاء اللہ کہا تھا۔ ان کو رخصت کر کے

وہ دونوں لاؤنج میں ہی بیٹھ گئے تھے۔

”اب تک خفا ہے۔“ اسفند نے بڑے لاڈ سے پوچھا تھا۔

درید کو اس کی یہ خوبی بھاتی تھی کہ اس کا غصہ ہمیشہ وقتی ہوتا تھا۔

”کیا ملے گا تجھ سے خفا ہو کر.....“ وہ بھی مسکرا دیا تھا۔



صبح وہ اتنی جلدی میں گھر سے نکلا تھا کہ بھول گیا کہ حریم گھر پر اکیلی ہے اور وہ اب تک تمہارے گھبراتی ہے۔ مگر لُنج ٹائم میں جیسے ہی خیال آیا وہ فوراً ہی گھر پہنچا۔ کئی بار دروازہ ناک کرنے پر نہیں کھلا تو اپنے پاس موجود چابی سے لاک کھول کر اندر آیا تھا۔ لاؤنج میں سناٹا تھا۔

”حریم.....“ اس نے آواز دی۔ مگر ایک کیا کئی بار پکارنے پر بھی کوئی رسپانس نہ پا کر اس کے دل میں انجانی سی فکر ابھری۔ وہ کمرے

میں دیکھنے کے لیے آیا تھا اور حیران رہ گیا۔ وہ دیوار کے ساتھ کمر کے کونے میں دبکی بیٹھی تھی۔ اور ہچکیوں سے اس کا سارا وجود ہل رہا تھا۔  
 ”حریم.....“ اس نے پکارا تھا اور وہ یکدم چیخ مار کر اسے دیکھ کر اس سے لپٹ گئی تھی۔ اسفند کو شدت سے افسوس ہوا کہ وہ فراموش کیسے کر گیا۔ حالانکہ رات اپنے گھر جا کر اس کی حالت دیکھ چکا تھا۔ وہ اب تک مکمل طور پر اس حادثے کو نہیں بھولی تھی۔  
 اسفند نے اس کے گرد بازو پھیلا کر اس کو سمیٹ لیا۔

”بس حریم ریلیکس.....!“ دھیرے دھیرے اس کا سر تھپک کر اس نے تسلی دی۔  
 ”دیکھو تم تنہا نہیں ہو، میں آ گیا ہوں ناں.....“ اس نے حریم کو خود سے الگ کر کے اس کا چہرہ تھام کر کہا تھا۔ رورو کر برا حال کر لیا تھا اس نے۔ اس کی سوجی آنکھیں اسفند کو مزید شرمندہ کر گئیں۔ اس نے حریم کو تھام کر بیڈ پر بٹھایا۔ اسے پانی پلایا تھا۔ کچھ وقت گزرا تو وہ سنبھلی تھی۔

”بھول جاؤ حریم وہ جو بیت گیا..... مت دو خود کو یہ تکلیف۔“  
 ”وہ رات میری پوری زندگی پر محیط ہو گئی ہے۔ میں کیا کروں۔ وہ خوف، وہ وحشت میرے اندر سے نہیں نکلتی۔“ اب تک کسی معصوم بچے کی مانند سہمی ہوئی تھی وہ۔

”اللہ کی ذات پر یقین نہیں ہے تمہیں، اس پر ایمان کامل رکھو۔ صبر کرو وہ یقیناً ہمیں صبر عطا کرتا ہے۔ بھول جاؤ اسے اب تم تنہا نہیں ہو۔“ اسفند نے اس کے چہرے پر پھیلنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا تھا۔

”صرف اسی ذات پر تو یقین ہے جو اب تک سانس چل رہی تھیں۔ میں تو گناہ گار ہوں۔ یہ اس کا ہی تو کرم ہے کہ اس نے آپ جیسا مسیحا سو نپا ہے مجھے۔ میں آپ جیسے نیک سچے انسان کے نام سے منسوب ہوں وگرنہ میری کیا بساط ایک داغدار ذات ہے جسے خود اپنے ہی وجود سے نفرت.....“ اسفند نے اسکے لبوں پر ہاتھ دھر دیا۔

”اگر میری سچائی کو سمجھتی ہو، میری زبان پر اعتبار کرتی ہو تو سنو حریم فاطمہ، میرے لیے تم کائنات کی تمام عورتوں سے زیادہ پاکیزہ..... معصوم ہو۔ تمہارا کردار اور تمہارا وقار اُجلا ہے۔ آئندہ اپنے لیے پھر ایسے الفاظ استعمال نہ کرنا۔“

وہ حیران آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی جو اس کے قریب بیٹھا پہلی بار اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مخاطب تھا اس سے، اور اسے آج علم ہوا تھا کہ اس شخص کی آنکھیں کس قدر خوبصورت ہیں اور ان میں سچائیاں صاف جھلکتی نظر آتی ہیں۔ بے اختیار ہی اس کا دل زوروں سے دھڑکا تھا۔ اور یکدم وہ نگاہیں جھکا گئی۔ اپنی بدلتی کیفیت سے وہ خود خائف ہوئی تھی۔ اس نے دھیرے سے اسفند کا ہاتھ اپنے لبوں سے ہٹایا تھا اور خود بھی قدرے پیچھے کھسکی تھی۔ اسفند نے اس کی جھجک محسوس کر لی تھی تبھی اٹھ کر سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کا مطلب وہ اب بالکل نارمل تھی۔ تبھی اسفند کی قربت اس کو پریشان کر رہی تھی۔

”اماں بی نہیں آئی تھیں۔“ اس کے سوال پر وہ ہونق سی دیکھنے لگی تو اس نے سر پٹا۔



”ایک بار دروازہ ناک ہوا تھا مگر مجھ میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ باہر نکلتی۔“ سچائی سے اعتراف کیا۔

”اٹس اوکے..... اچھا یہ بتاؤ لنچ میں کیا کھاؤ گی۔“ اندازہ تھا اسے کہ وہ کمرے سے نہیں نکلی تو اس نے کھایا کچھ نہیں ہوگا۔  
”مجھے بھوک نہیں ہے۔“

”لگ جائے گی۔ میرے ہاتھ سے بنا لنچ دیکھ کر خود بخود لگ جائے گی۔ آؤ تمہارے لیے لنچ بناتے ہیں۔“  
”آپ نے کر لیا؟“

”اوں ہوں.....“ تمہارا خیال آگیا تھا سو فوراً گھر آ گیا۔ شرٹ کی آستین فولڈ کرتا ہوا وہ ایمانداری سے بولا تھا۔  
”میں بنالیتی ہوں، آپ رہنے دیں۔“

”تم بھول رہی ہو کہ تم ہماری مہمان ہو۔“ وہ یقیناً اس کا موڈ اچھا کرنا چاہتا تھا۔ وہ بھی مسکرا کے اس کے پیچھے کچن میں آئی تھی اور مہارت سے اس کے چلتے ہاتھ دیکھنے لگی۔  
”آپ کو کوکنگ آتی ہے۔“

”تنہائی انسان کو سب کچھ سکھا دیتی ہے۔ میں نے زندگی اکیلے گزاری ہے حریم فاطمہ۔“ وہ مصروف انداز میں بتا رہا تھا۔ وہ لب بھینچے اسے دیکھ رہی تھی۔ جانے کیوں اسے آج یہ شخص بہت پیارا لگ رہا تھا۔



آج درید جلدی آگیا تھا۔ تھکا تھکا سا، اس کے پاس صوفے پر آ کے گرا تھا جو نیوز پیپر دیکھ رہا تھا۔  
”حریم کہاں ہے؟“ اس نے ادھر ادھر نگاہیں گھمائیں۔

”کچن میں چائے بنا رہی ہے۔ تھوڑا دھولے اپنا وہ چائے لے آئے گی۔“  
”آج تھکن سی ہو رہی ہے یار.....“

”خیریت.....“ اس بار اسفند نے اخبار رکھ کر درید کو دیکھا تھا۔ وہ واقعی بہت نڈھال سا لگ رہا تھا۔

’جب حریم نے فیصل آباد میں ہی رہنا ہے تو یہاں جو اس کا گھر ہے، اس کا کیا کرنا ہے..... تم نے اس سے اس ٹاپک پر بات کی۔“ درید نے پوچھا۔

”یار میں کیوں کروں، وہ اس کے پیرٹس کی نشانی ہے۔“  
”مگر.....“

”شی.....“ درید کچھ کہہ رہا تھا کہ اس نے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ حریم چائے بنا لائی تھی اور ان دونوں کو سروکر کے واپس کچن میں چلی گئی۔

”آج پھر اس کی طبیعت بگڑ گئی۔ بمشکل خاموش کرایا تھا۔ صبح میں بھول گیا کہ وہ تنہا نہیں رہتی۔ مجھے ایسے ہی یاد آیا۔ میں گھر آ گیا اور یہاں آ کر دیکھا تو حریم کی بہت بری حالت تھی۔“

”اوگا ڈ.....“

”اب تو آ گیا ہے، میں اسے لے کر ڈاکٹر کے پاس چلتا ہوں۔“

”ہاں تو اسے لے جا۔“ درید نے فکر مندی سے کہا۔ اسفند نے حریم کا چیک اپ کرایا تو ڈاکٹر نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

”کوئی ایسی ناخوشگوار بات ہوئی ہے ان کی لائف میں جو ان کے ذہن میں چپک کر رہ گئی ہے اور جب تک کہ یہ خود اسے بھولنے کی کوشش نہیں کریں گی، نارمل نہیں ہو سکتیں۔ پھر بھی انہیں خوش رکھنے کی کوشش کریں کیونکہ ان کا خوش رہنا ہی ان کی صحت کی ضمانت ہے۔“

”اگر واقعی آپ چاہتے ہیں کہ وہ سب میں بھول جاؤں تو آپ وہ گھر بیچ دیں کیونکہ جب تک اس گھر سے لنک رہے گا مجھے وہ رات نہیں بھول سکتی۔“ واپسی پر حریم نے اسفند سے کہا۔

”اسفند نے تعجب سے اسے دیکھا۔ مگر وہ تو تمہارے والدین کی نشانی ہے، پھر کیوں؟“

”میں مانتی ہوں میرے مہیاپا کی نشانی ہے وہ..... میرا بچپن وہاں گزرا، میری ہر یاد اس گھر سے جڑی ہے۔ لیکن میری تمام خوش گوار یادوں پر وہ ایک رات محیط ہو گئی ہے، جو اسی گھر سے وابستہ ہے۔ وہاں قدم رکھتی ہوں تو میری روح لرز جاتی ہے، مین کرنے لگتی ہے۔“ اس کے چہرے پر پھر وہی اذیت جھلکنے لگی۔

”اوکے، جیسے تم چاہو گی وہی ہوگا۔ لیکن ریلیکس ہو جاؤ.....“

”مجھے واپس گھر بھیج دیں۔ میرا یہاں دل نہیں لگتا۔“ کتنی ہی دیر کی خاموشی کے بعد وہ بولی تو اسفند سر ہلانے لگا۔ شاید ابھی یہاں رہنا اس کا مناسب نہیں تھا۔ آج دوپہر کی حالت کے بعد خود اسفند کو بھی یہی لگا تھا تب ہی وہ اگلے ہی دن اسے خود چھوڑ آیا تھا۔

واپس آیا تو طلال بھی آچکا تھا۔ بلال اور نہال ابھی وہیں تھے۔ طلال بھی اپنے فاضل ایگزام کی وجہ سے آیا تھا۔ مگر اس میں بہت تبدیلی آ گئی تھی۔ بہت سنجیدہ سا رہتا تھا۔

”نماز پڑھ کر اپنے ابا جی کے لیے دعا کیا کرو طلال..... ان شاء اللہ وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔“ اس نے طلال کا سر تھپک کر کہا تھا اور اس نے مان بھی لی تھی اس کی بات۔ فجر میں وہ اسفند سے پہلے اٹھ کر مسجد گیا تھا۔

”تھینک یو بگ بی..... بلیوی کی، جس دن سے نماز باقاعدگی سے شروع کی ہے، دل کو بہت سکون ہے۔“ آج شام طلال نے اسے کہا تھا اور کتنی حیرت کی بات تھی کہ اس کے دل کا سکون جانے کہاں کھو گیا تھا۔

امی نے اسے فون کیا تھا۔ درید بتا رہا تھا۔ ”اچھا“ وہ جیسے خیالوں میں بولا۔

”اسفند تم نے کیا صرف دنیا دکھاوے کے لیے اس کو اپنا نام دیا ہے۔ اسے صرف نام کی نہیں تمہاری توجہ اور محبت کی ضرورت ہے۔“

تم مسیحا بن کر اس کا ہر درد بانٹتے رہے۔ پھر اب کیوں یہ گریز جب تمہارا ایمان ہے کہ ہر فیصلہ اللہ کی رضا سے ممکن ہے تو کیوں حریم کو دل سے اپنی بیوی تسلیم نہیں کر رہے ہو۔ درید بہت الجھا الجھا پوچھ رہا تھا۔

”یار تو کیوں نہیں مانتا میں نے پورے ہوش و حواس میں اس سے نکاح کیا ہے۔ اللہ کی ذات کو حاضر ناظر مان کر وہ میری بیوی ہے۔ میں پورے دل و دماغ سے یہ تسلیم کرتا ہوں۔“ اسفند نے یہ کہتے ہوئے اپنا سر صوفی کی پشت پر ٹکا دیا۔

”پھر وہ کیا چیز ہے جو اس کے اور تیرے درمیان حائل ہے۔“ آج تو جیسے درید سب کچھ جان لینا چاہتا تھا۔ یہاں وہ لا جواب ہو جاتا تھا۔

”یہ ہی سوال تو وہ خود سے کر رہا تھا کہ اگر میں حریم کو اپنی تمام حقیقت بتا دوں تو کیا وہ قبول کر پائے گی اس سچ کو..... کہ جس دل میں صرف اسے ہونا چاہیے وہاں کوئی اور تھا۔“

”وہ تمہارا ماضی تھا اور حریم تمہارا حال تمہارا مستقبل ہے۔ اگر واقعی تیرے دل میں اب کچھ نہیں ہے تو.....“ درید نے جملہ ادھورا چھوڑا۔

”درید! انسان شاید پہلی محبت عمر بھر نہیں بھول سکتا۔“

”کیا کیجیے ان کا اسفند ضیاء جو خود بھولنا نہ چاہتے ہوں۔ کب تک فرار پاسکو گے اس حقیقت سے ایک معصوم لڑکی کی ذمہ داری قبول کی ہے تم نے۔ وہ شرعی بیوی ہے تمہاری..... اس کے کچھ حقوق ہیں جو تم پر واجب ہیں۔ میرے نزدیک اگر اب بھی تم اپنے دل میں عینی کنول کی یادیں لیے بیٹھو گے تو تم خیانت کے مرتکب ہو گے۔ وہ تلخ ہونا نہیں چاہتا تھا مگر حریم اسے سگی بہنوں کی طرح عزیز تھی۔ اس کی وجہ سے اب اکثر وہ اسفند سے بحث کرتا تھا۔

اور پھر وہ اسفند سے خفا ہو گیا اور بہت سارے دن اسی ناراضگی میں گزر گئے۔

آج وہ بہت دنوں کے بعد پھر قاری صاحب کے سامنے دوزانو بیٹھا تھا۔

”ایک بار پھر میری زندگی کشن موڑ پر ہے قاری صاحب، اور میری حالت ایسی ہے کہ میں خود کو کسی بھی فیصلے پر آمادہ نہیں کر پا رہا۔“ اور پھر وہ سب بتاتا چلا گیا۔

”کیا تمہیں اس پاک ذات پر یقین نہیں رہا، جو بک کل ہو، بے قرار ہو۔ اور اس کے کیے گئے فیصلے کو ماننے سے انکاری ہو۔“

”نہیں قاری صاحب اس پر ایمان تو بچتا ہے۔ دل اس پر بھی راضی ہے کہ یہ فیصلہ صرف اس کا ہے۔“

”پھر..... شکر ادا کرو اس رب کا جس نے تمہیں چننا ہے ایک بے سہارا لڑکی کو سہارا دینے کے لیے۔ وہ رحیم ہے کریم ہے۔ بے

شک وہ بہتر جانتا ہے تمہیں تو اس نے تمہارا انتخاب کیا ہے۔“

”شکر گزار ہوں میں اس رب کا جس نے مجھے اتنی توفیق دی۔ مگر قاری صاحب یہ بے کلی یہ بے سکونی کیا ہے۔“

”تم بھول گئے بچے کہ میں نے تمہیں کیا سمجھایا تھا۔ صبر کرو۔ اس پر جو تمہیں نہ ملا اور ہو سکتا ہے اس صبر سے اللہ پاک تمہارے

لیے خیر کثیر پیدا فرمادے۔ یہ اس کی رضا تھی کہ تم اس شہر سے اس شہر جاوے۔ یہ راستہ اس نے تمہارے لیے منتخب کیا کیونکہ وہ جانتا تھا جو تمہارے لیے اچھا ہے۔ تم نہیں سمجھ سکتے، نہیں جان سکتے اس کی حکمت، اس کی مصلحت۔“

ان کی باتیں اس کے دل کو یوں قرار دے رہی تھیں، جیسے پیاسی دھرتی کو بارش کی بوندیں قرار دیتی ہیں۔

”ایک نیک و فاشعار پر ہیزگار بیوی عطا کی ہے اللہ پاک نے تمہیں۔ وہ رب تم سے خوش ہے تبھی اس نے تم پر یہ کرم کیا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ جس کے لیے تم تڑپتے رہے وہ تمہارے قابل نہ تھی۔ اور اس نے تمہیں وہ عطا کیا جس کے تم قابل ہو، جو تمہارے لیے نیک ہے۔ وہم میں نہ پڑو، شکر بجالاؤ اس ذات کا۔ آغاز کرو اپنی نئی اور خوشگوار زندگی کا.....“

”میرے لیے دعا کیجیے گا قاری صاحب کہ میں حرم کو اس کے تمام حقوق دے سکوں اور خوش رکھ سکوں۔“

”ان شاء اللہ تمہارا آنے والا وقت بہت اچھا ہے۔ اور میری نیک دعائیں تمہارے ساتھ ہیں ہمیشہ.....“

آج اس کے ذہن پر دھرا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا اور دل خود بخود ہی حرم کی طرف مڑ گیا۔ اس سے پہلی ملاقات سے آخری ملاقات کا سفر اس کے ذہن میں تو اتر سے آ رہا تھا۔

سچ کہتے ہیں قاری صاحب۔ یہ رستہ اللہ نے چنا تھا اس کے لیے تبھی اس نے عینی کے دل میں میری محبت نہ ڈالی کیونکہ عینی کو نہیں اس نے میرے لیے حرم کو منتخب کیا تھا۔ وہ میرا نصیب تھی پھر بھلا میں کیسے عینی کنول کو پاسکتا تھا۔ ہاں عینی نے انجانے میں سہی مجھے جو راہ دکھائی، میرے اللہ کی وہ ہی میری نجات ہے۔

”بے شک وہ خوش قسمت تھا کہ اللہ پاک نے اسے اپنی پسند اپنی رضا عطا کی۔ بے شک وہ انسان غلط تھا۔ وہ اپنے لیے وہ مانگ رہا تھا جو اس کے لیے بہتر نہیں تھا۔“

جانے حرم میرے بارے میں کن وسوسوں کا شکار ہوگی۔ وہ رات بھر سوچتا رہا۔ کہیں حرم غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائے کہ میں اس سے دور ہوں تو اس اذیت ناک واقعہ کے باعث، نہیں میرا اللہ گواہ ہے میرے ذہن و دل میں ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں حرم کے پاس جاؤں گا پورے دل کی خوشی اور آمادگی کے ساتھ اسے اپنی زندگی کا ہر کچ بتاؤں گا۔

کیونکہ آنے والی زندگی کا آغاز کرنے کے لیے اسے تمام حقیقت بتانا ضروری ہے۔ وہ تو جانے کا محکم ارادہ کیے بیٹھا تھا کہ اس ویک اینڈ پر امی اور حرم خود ہی آ گئیں۔ ان کے یہاں آنے کے بعد اسے علم ہوا کہ درید نے انہیں بلایا ہے۔ چونکہ وہ اسفند سے خفا تھا، اس لیے اس کے سامنے ذکر نہیں کیا۔

”ڈش گنڈ..... چند دن اچھے گزر جائیں گے۔“ وہ خوش تھا اور اس کے چہرے پر سکون مسکراہٹ نے درید کو دنگ کیا تھا۔ حرم کو دیکھ کر اس پر کوفت نہیں چھائی تھی۔

بلکہ آج وہ عام دنوں سے زیادہ فریش تھا۔ اب جانے یہ ڈرامہ وہ امی کو دکھانے کے لیے کر رہا تھا یا.....“



”وہ تینوں بچے کہاں گئے۔“

”امی ان کے ابو کی طبیعت خراب ہے، گاؤں چلے گئے ہیں۔“

”ہمیشہ کے لیے۔“

”ہاں شاید..... بلال تو جاب چھوڑ کر جا چکا ہے۔ طلال کا باہر جانے کا ارادہ ہے۔ رہا نہال..... تو مے بی وہ آ جائے۔“ درید نے تفصیل بتائی جو رات ہی بلال نے اسے فون پر بتائی تھی۔

”جہاں بھی رہیں خوش رہیں۔“

”آمین..... مگر یہ تو طے ہے کہ ہمیشہ اچھی یادوں میں رہیں گے۔“ اسفند نے کہا تھا۔

”اور میرب اسٹڈیز کا سناؤ۔“

”کیا سناؤں! آپ کی وائف تو یہاں سے جانے کے بعد انکار پر اڑ گئی کہ اس نے نہیں پڑھنا..... پھر میں بھی چپ کر گئی۔“

میرب نے بتایا تو وہ حیران نظروں سے حرم کو دیکھنے لگا جو سر جھکا گئی تھی۔

”وائے حرم؟“ اب وہ براہ راست اس سے مخاطب تھا جس سے لفظ ادا کرنا مشکل ہو رہے تھے۔

”ہاں تو پڑھ لے گی آگے کچھ دن ٹھہر کے لے گی داخلہ.....“

امی اس کی فیور میں بولی تھیں۔ اور موقع ملتے ہی امی اس سے سوال جواب کر رہی تھیں۔

”کیا مسئلہ ہے تمہارا..... نکاح کر کے عمر بھریوں ہی رہنا ہے۔ کس بات کی سزا دے رہے ہو اسے۔“

”نہیں امی ایسا کچھ نہیں ہے یقین کریں اس دیک اینڈ پر میرا گھر جانے کا ارادہ پکا تھا۔“

”بس تمہارا ہر ہفتے یہ ہی بیان ہوتا ہے۔ دیکھو اسفند اس معصوم کے ساتھ جتنا کچھ بیت چکا ہے وہ ہی کم ہے کیا جو اسے مزید دکھ

دے رہا ہے۔“

”امی میں نے کیا کہہ دیا.....“

”تمہاری لا پرواہی، بے توجہی سے کیا اندازہ لگائے گی وہ..... کہ تم نے احسان کر دیا اس پر..... اگر واقعی تو چاہتا ہے کہ حرم خوش

رہے تو اسے اپنی توجہ دو، محبت دو، تمہارے رویے سے جانے اس کے ذہن میں کیا کیا وہم آتے ہوں گے کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ خاموش

رہنے لگی ہے۔ نکاح سے پہلے تو وہ ہنس بول بھی لیتی تھی۔“

”اوکے آئی ایم سوری! مگر یقین کریں اب آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔“ اس نے امی کو یقین دلایا تھا۔

اب اسے حرم کو یقین دلانا تھا۔ اس کے وہموں کو دور کرنا تھا۔ اور یہ موقع اسے رات میں مل گیا۔

”کیوں پڑھنا نہیں چاہتی ہو تم آگے.....“

”میرا دل نہیں چاہتا۔“ اس نے دھیرے سے سر جھکا کر کہا تھا۔  
”مگر کیوں؟“

”میں نہیں چاہتی آگے پڑھنا۔“

”اور اگر میں کہوں کہ یہ میری خواہش ہے۔“ اس نے حریم کے چہرے پر نگاہیں فوکس کی تھیں۔

”آپ کا حکم تو مان سکتی ہوں۔“

”حریم میں نے حکم نہیں خواہش ظاہر کی ہے۔“

”میرے لیے آپ کی ہر بات حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ کیونکہ میرے نزدیک آپ عام انسان نہیں ہیں۔“

”خدا کے لیے مجھے عام انسان رہنے دو، اگر تمہارا یہ ہی رویہ رہا تو.....! ہمارے بچ کے فاصلے ختم نہیں ہو سکتے۔“

”مگر میرے دل میں آپ کا جو مقام، جو احترام ہے وہ مجھے اجازت نہیں دیتا کہ میں آپ کو عام انسان مانوں۔“

”میں اپنے اور تمہارے بچ کے فاصلے مٹانا چاہتا ہوں حریم ضیاء۔ نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اکیلے رہ کر میں بھی

تھک چکا ہوں اور تم بھی.....“

وہ خاموش تھی، بالکل چپ، صرف اسفند بول رہا تھا۔

”مجھے اپنا نام دے کر جو احسان آپ نے کیا ہے وہ میں کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔“

”فارگا ڈسک حریم، تم میری بیوی ہو اور کوئی احسان نہیں کیا تم پر.....“

”میں بالکل عام انسان ہوں تمہاری طرح سب کی طرح.....“ اس کی جھنجھلاہٹ پر حریم نے تعجب سے دیکھا تھا۔

”میں تو بہت گنہگار انسان ہوں حریم..... ایک عمر لاعلمی میں گزاری۔ اب اگر اس پاک ذات نے ہدایت دی، اپنی محبت اس دل

میں ڈالی ہے تو اپنے تمام پچھلے گناہوں کی ان کوتاہیوں کی جو جانے انجانے میں ہوئیں ان کی معافی طلب کرتا ہوں۔ تم پلیز مجھے میری ہی نظروں میں شرمندہ مت کرو۔“ وہ آزرده سا ہو گیا۔

”جتنا میں آپ کو جان سکتی ہوں آپ بہت اچھے نیک انسان ہیں۔“

”تم مجھے جانتی ہی کتنا ہو حریم، کچھ بھی تو نہیں جانتیں تم میرے بارے میں مگر میں آج تم سے اپنی ہر حقیقت شیئر کرنا چاہتا ہوں

تاکہ تمہیں آنے والی زندگی کے بارے میں فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔“ اس نے پوری سچائی سے کہا تھا اور حریم کو اپنے بارے میں ہر ہر

بات بتادی۔ اس کی تمام عمر جس طرح گزری، جس ماحول میں گزری اور وہ شدت بھی جس انتہاؤں پر جا کر اس نے یعنی کنول سے محبت کی

تھی۔ اور وہ مجھے زندگی کا سب سے بڑا دکھ دے کر بھی مجھ پر احسان کر گئی۔ میرے رب کے قریب کر گئی۔ جس ذات سے جس ذات کی

سچائیوں سے میں لاعلم تھا۔ پھر انسان کی محبت میں ڈوب کر جب میں اس رب کے آگے جھکا، دل کا سکون مانگا تو مجھے علم ہوا کہ یہ محبت تو

دھوکہ ہے، محبت تو وہ ہے جو اس کی ذات سے کی جائے۔ بس وہ ہی حقیقت ہے باقی سب فانی ہے، فریب ہے۔“ اس کی نگاہوں کی نمی میں سچائیاں جھلک رہی تھیں۔

”بہت غلیظ زندگی گزار رہا تھا میں، غم کو دور کرنے کے لیے حرام چیز کا سہارا لیتا تھا۔ مجھے لگتا تھا شراب میں سکون ہے۔ مگر میں غلط تھا حرم، سکون صرف اس کے سامنے جھکنے میں، اسے واحد ماننے میں ہے۔“

”جب مجھے اس سچ کا ادراک ہوا تو میں نے اپنی زندگی کا ہر فیصلہ اس کے سپرد کر دیا اور مطمئن ہو گیا۔ اور تم..... اسی کی رضا ہو، اسی کی مرضی سے میری زندگی میں شامل ہو۔“

وہ دھنک نظروں سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ جس کے تاثرات الفاظ کے ساتھ بدل رہے تھے۔ مگر ماضی میں جا کر اس کے چہرے پر جو کرب نمایاں تھا وہ حرم کو بھی دکھی کر گیا۔

”تمہیں یہ سب بتانے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ تم اپنی زندگی کا فیصلہ آسانی سے کر سکو ج میرا ماضی جاننے کے بعد تمہارے ذہن میں کئی سوال اُبھرے ہوں گے۔ مگر میرے پاس تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں۔ میری ذات میرا سچ سب تم پر عیاں ہے۔ اب فیصلہ تم نے کرنا ہے۔“

”حد ہو گئی یار میں پریشان ہو گیا کہ آخر تم دونوں کہاں چلے گئے۔“ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آتے ہی درید نے کہا تھا اور حرم کے دل کی باتیں..... من میں ہی رہ گئی تھیں۔



تمہارا گھر سیل ہو گیا ہے بس کچھ کاغذات پر تمہارے سائن چاہئیں۔“ اگلے دن وہ سب کے ساتھ بیٹھا اسے بتا رہا تھا۔

”کیوں، گھر کیوں بیچا، اب تمہارے رشتہ دار پھر سے پیچھے لگ جائیں گے۔“ امی بولیں تو اس نے پلٹ کر اسفند ضیاء کا چہرہ دیکھا کہ اب کیا کہیں۔

”امی! اسی مسئلے کو حل کرنے کے لیے تو گھر بیچ رہے ہیں۔ ان کو ان کے حصے کی رقم دے دیں گے اور اس طرح حرم بھی پُر سکون اور با اعتماد زندگی گزارے گی۔“

”یوں بھی حرم نے رہنا تو فیصل آباد میں ہے۔“

درید بولا تو لمحہ بھر کو اس کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں لہرائی تھیں۔

”امی! میں چاہتا ہوں کہ حرم یہیں رہے میرے ساتھ۔ ایک تو ہمیں گھر سنبھالنے کے لیے گھر میں خاتون کی اشد ضرورت ہے کیونکہ بلال تو جا چکا اور میں یا درید..... ہم گھر نہیں سنبھال سکتے۔ دوسرا میں حرم کو یہیں یونیورسٹی میں ایڈمیشن دلوانا چاہتا ہوں۔“ اس کے فیصلے پر درید اور امی بہت خوش تھے۔ کیونکہ ان کی بھی یہی خواہش تھی کہ وہ دونوں ساتھ رہیں۔

”میرب اگر تم بھی ایم ایڈ کرنا چاہتی ہو تو یہیں ایڈمیشن لے لو۔“ وہ اب میرب سے مخاطب تھا۔ جو یکدم سر جھکا گئی۔ وہ اسفند کو کیا بتاتی اس نے کیوں ترک کر دیا ہے یہ ارادہ۔“

”بس اسفند بھائی پڑھ لیا..... جتنا پڑھنا تھا۔“ اس کے انداز میں جھجک تھی اور اس کا راز تب کھلا جب درید نے تنہائی میں اسے بتایا تھا کہ وہ پاپا بننے جا رہا ہے۔

”ارے یار تجھے بہت مبارک ہو۔“ وہ خوشی سے چیخا۔ درید بھی مسکرا دیا۔

”مجھے بھی موقع دے یار اس طرح خوش ہونے کا۔“ درید بولا تو وہ سمجھ نہ سکا تھا۔ مگر جب درید کے چہرے پر کمینہ سی ہنسی دیکھی تو اسے اس کی بات کا مطلب بھی سمجھ آ گیا اور اس نے زوردار مکہ اس کے پیٹ میں مارا۔

”بے شرم، بے حیا انسان۔“

”ایویں..... میرا حق نہیں کوئی مجھے چاچو کہے۔“

”یاسر ہے ناں، یہ فرمائشی پروگرام وہاں چلا دے۔“ وہ اسے بری طرح لتاڑ کر آگے بڑھ گیا تھا۔

”حریم اگر یہاں رہنا چاہتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے اسفند مگر میں ابھی یہاں اسے چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ میں نے اسے بیٹی کہا ہے اور اپنی بیٹی کی رخصتی میں اپنے گھر سے کروں گی۔“

”اور میں آپ کا بیٹا نہیں۔“ اسفند نے دکھی ہونے کی ایکٹنگ کی۔

”ہے ناں! اسی لیے تو خواہش ہے کہ تیرا ولیمہ دھوم دھام سے کروں۔“ انہوں نے اس کا مان بھی نہیں توڑا تھا۔

سو فیصلہ ہو گیا۔ وہ سب فیصل آباد جا رہے تھے تاکہ حریم کی رخصتی کر سکیں۔ مگر وہ حریم کے منہ سے ایک بار اس سوال کا جواب چاہتا تھا، جو اس نے اس پر چھوڑ رکھا تھا مگر ایسا نہ ہو سکا۔

فیصل آباد آ کر محض دو دن بعد کی تقریب رکھی تھی امی نے۔ اسفند کی خواہش پر سادہ سی تھی تقریب مگر پھر بھی سب نے اچھے سے مزہ کیا تھا۔ اور امی نے حریم کو دلہن کے روپ میں سجا کر اس کے کمرے میں منتقل کر دیا تھا۔

”تو خوش ہے ناں اسفند، کوئی ملال کوئی گزرے وقت کی یاد.....“ درید نے پوچھا۔

”میری آنکھیں پڑھنے کا ہنر آتا ہے ناں تجھے..... پڑھ لے۔“ اسفند اسے لا جواب کر گیا کیونکہ سنہرے چمکتے کانچ میں صرف خوشی اور اطمینان جھلک رہا تھا۔ درید عباس نے گلے لگا کر اسے وش کیا تھا۔

کمرے میں داخل ہونے کے بعد وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ کنفیوژ تھے۔ مگر پھر بھی اسفند مضبوطی سے قدم اٹھاتا اس کے قریب آیا تھا۔ اور بہت دلچسپی اور غور سے اس نے حریم کا سجا سنورا سراپا دیکھا تھا۔

”مجھے تم سے اپنے سوال کا جواب اب بھی درکار ہے۔“ اس کے سوال پر حریم ساری جھجک فراموش کر کے اسے دیکھنے لگی۔



”مجھے آپ کے ماضی سے کوئی سروکار نہیں کیونکہ وہ گزر چکا ہے۔ میرا مستقبل آپ سے وابستہ ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ میرا مستقبل بہت مضبوط ہے۔“

”اتنے دن سولی پر ٹانگ رکھایہ ہی بات پہلے نہیں کہہ سکتی تھیں۔“ اس نے ہلکے پھلکے لہجے میں شکوہ کیا۔

”آئی ایم سوری!“

”آج بھی.....؟“

”تم میرا نام کیوں نہیں لیتیں؟“ اس بار وہ سنجیدہ ہو گیا تھا اور بھرپور خفگی سے اسے دیکھا جو گردن جھکا گئی۔

”مجھے مجبور مت کریں میں آپ کا نام نہیں لے سکتی۔“ اس کے لفظوں میں جو احترام تھا، اسفند کو دنگ کر گیا۔

”گویا تم اپنے اور میرے درمیان کے تعلق کو یوں ہی رکھنا چاہتی ہو۔ فاصلے قائم رکھنا چاہتی ہو۔“

”میں آپ جیسے اعلیٰ صفات رکھنے والے انسان کے قابل ہی کب ہوں۔ مجھ میں جو عیب ہے جو داغ ہے وہ لاکھ دنیا سے چھپا

لوں مگر آپ کے سامنے تو اپنی ذات بہت چھوٹی اور بدنما محسوس ہوتی ہے۔“ جھلمل کرتی آنکھیں اسفند پر سکتہ طاری کر گئیں۔ وہ کیا کیا سوچتی تھی، کن وسوسوں میں گھری تھی۔

”تم ایسا سوچتی ہو حریم۔“

”غلط کیا ہے، میں نہیں ہوں آپ کے قابل۔“

”تم کس قابل ہو، یہ میرے دل میں جھانک کر دیکھو حریم ضیاء.....“ وہ جب اس کے نام کے ساتھ اپنا نام جوڑتا تھا حریم کو اپنا نام

بہت بڑا وقار لگتا تھا۔

”یہ احسان کم ہے کہنا نام دیا ہے اپنا مجھے آپ نے، میں عمر گزار سکتی ہوں آپ کے نام کے ساتھ مگر یہ سچ ہے کہ میں خود کو آپ کی

محبت آپ کی قربت کے لائق نہیں سمجھتی۔“

اس کی باتیں اسفند ضیاء کی کشادہ پیشانی پر کئی شکنیں نمودار کر گئیں۔ اس کے چہرے پر جو تاثرات آئے تھے لہجہ بھر میں ڈری گئی تھی۔

”قابل تو میں بھی نہیں تمہارے، کیونکہ جو تمہارے ساتھ ہوا وہ تمہارا ماضی ہے اور میرا ماضی بھی کوئی اچھا نہیں رہا حریم فاطمہ.....

اور سب سے بڑی بات..... جو تم پر مبنی اس میں تم پر صرف ظلم ہوا جبر کیا تمہاری مرضی تمہاری رضا نہیں تھی۔

مگر میرے ماضی میں میں نے جو بھی کیا اپنی مرضی سے کیا۔

میں نے یعنی کنول کے ساتھ محبت میں ڈوب کر بہت قربت کے لمحے گزارے ہیں۔ وہ بھی میرے لیے غیر محرم تھی۔ مجھے اس

وقت یہ احساس نہیں تھا۔ اس کا تلخ لہجہ کوز لا گیا۔

”مجھے میرے رب کے سامنے سرخرو ہونا ہے حریم، تمہیں میں نے بے شک اس کی رضا سے پایا ہے مگر اس میں میری مرضی بھی

شامل ہے۔“

اس نے روتی ہوئی حریم کا چہرہ مضبوط ہاتھوں میں تھام کر کہا تھا۔

”اپنے دل سے یہ وہم نکال دو حریم پلیز..... تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ میرے دل میں تمہارا مقام بہت اونچا ہے۔ میری نظر میں تم دنیا کی ہر عورت سے زیادہ پاکیزہ اور معصوم ہو۔ بخدا میرے لیے تم انمول موتی ہو جو قدرت نے مجھے میری کسی نیکی کی صورت عطا کیا ہے۔“

”پھر آپ کا خشک رویہ“ اس کے لب تھر تھرائے اور اسفند ضیاء سخت شرمندہ ہوا تا۔ بس یہ ہی خوف تھا اسے۔

”میرے دل کی بے چینی کو اتنا غلط نام نہ دو حریم۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ تمہیں سب بتاؤں یا نہیں..... مگر میرا اللہ گواہ ہے کہ

تمہارے لیے میرے دل میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

”بلکہ میں تو شکر گزار ہوں اس رب کا جس نے مجھے تم جیسی معصوم اور نیک شریک حیات عطا کی۔“

”آپ سچ کہہ رہے ہیں ناں..... کیا واقعی آپ کے نزدیک میں پاکیزہ ہوں۔“ ڈبڈباتی آنکھیں جب سنہرے کانچ سے ٹکرائیں تو لمحہ بھر کو جیسے کائنات تھم سی گئی تھی۔

”کیسے ثابت کروں کہ تمہیں یقین آ جائے۔“ بوجھل سا لہجہ تھا۔ حریم کی دھڑکنیں ساکت ہو گئیں۔

”میری آنکھیں ہمیشہ میرے دل کی سچائیاں بیان کرتی ہیں۔ کیا تمہیں میری آنکھوں میں سچ نظر نہیں آتا حریم۔“

اسفند ضیاء نے اب بھی اس کا چہرہ تھام رکھا تھا اور وہ پوری توجہ سے حریم کی پانیوں سے بھری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

پھلا وہ کہہ سکتی تھی کہ اس میں اتنی ہمت کہاں کہ ان کی آنکھوں میں دیکھ سکے۔ وہ کبھی بھی اس کی نگاہوں میں لمحہ بھر بھی نہیں دیکھ

پاتی تھی۔ کیونکہ ان آنکھوں میں وہ کشش تھی جو اس جہاں کی تمام خوبصورتی میں بھی نہیں تھی۔

اللہ پاک کی قدرت کا سب سے انمول گفٹ تھیں وہ آنکھیں جن میں بس اک پل کو وہ دیکھ سکتی تھی مگر سنہرے کانچ میں شفاف

چمکتا اپنا ہی چہرہ نظر آتا تھا۔

”آئی ایم سوری! میں نے آپ کو غلط سمجھا۔“

”آپ میرے استاد ہی ہیں جنہوں نے زندگی کی تمام تکلیفوں کو سہہ کر مجھے جینے کا ہنر سکھایا، ورنہ میں تو مایوسی کے اندھیروں میں

ڈوب چکی تھی۔

”یہ اعتماد صرف آپ نے دیا ہے۔ میرے دل میں تمام دنیا کے لیے خوف اور نفرت تھی مگر مجھے محبت کرنا آپ نے سکھائی ہے۔“

”محبت کرتی ہونا مجھ سے!“ اسفند نے سرشار سے لہجے میں پوچھا اور حریم کی جان پر بن آئی۔ کیسے اقرار کرے کیسے بیان

کرے کہ روز اول سے اس کی محبت دل کے نقش پر روشن ہے مگر شاید وہ لاعلم تھی۔

لیکن نکاح کے بعد اس پر آگئی ہوئی تھی کہ یہ شخص محض مسیحا نہیں ہے، یہ تو اس کی رگ و جان میں بسا ہوا ہے۔

اس کی سانسیں بھی صرف اس کا نام پکارتی تھیں۔

”بس کرو جان چکا ہوں کتنی محبت ہے تمہیں مجھ سے۔“

”تمہاری آنکھوں میں تمہارے دل کی داستان رقم ہے حریم ضیاء، جو با آسانی پڑھ لی ہے میں نے۔“

اور وہ فوراً ہی نگاہیں جھکا گئی۔ لرزتی پلکیں چہرے پر کھلتا حجاب اور یا قوتی لیوں کی تھر تھراہٹ اسفند ضیاء کو مدہوش سا کر گئیں اور اس نے حریم کو اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا۔

”اپنی محبت کا یقین دلانے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا۔“ اس کے لہجے میں شوخی تھی۔ حریم جیسے خود میں سمٹنے لگی۔

”بولو ناں حریم ضیاء، کیسے اعتبار کرو گی!“

”خود سے زیادہ اعتبار ہے مجھے آپ پر..... اور.....!“

”اور.....!“ اسفند نے ادھورہ جملہ دہرایا۔

”آپ کی محبت پر.....“ اس کے لہجے میں حیا تھی مگر اس نے لمحہ نہیں لگایا تھا بات مکمل کرنے میں۔“

”بس یہ ہی یقین درکار تھا مجھے، زندگی کے اس نئے سفر کو شروع کرنے سے پہلے، جو تم نے مجھے دیا ہے۔“ اس نے حریم کا نازک وجود دونوں بانہوں میں سمیٹ کر اس کے بالوں پر لب رکھ دیے تھے۔

شکر گزار تھا وہ اس خالق کائنات کا جس نے اسے یہ انمول موتی عطا کیا ورنہ شاید وہ کبھی اپنے لیے ایسا جیون ساتھی تلاش نہ کر پاتا۔ جس کی نگاہوں میں پاکیزگی اور حیا تھی۔

وہ اسی حیا کی تلاش میں بھٹک رہا تھا اور جانے کب تک بھٹکتا کہ اس کے رب کو اس پر رحم آ گیا۔

”بے شک انسان بے صبرا ہے۔ وہ نہیں سمجھ پاتا کہ اس کا رب اس کے لیے کیا سوچتا ہے۔ وہ ہمیں وہ عطا کرتا ہے جو اس کی

چاہت ہو۔ اس کی پسند ہو اور کیا..... اس سے بڑھ کر کچھ ہے کہ وہ پاک ذات ہم سے خوش ہے۔

اس رب کو راضی کرنا ہی انسان کی سب سے بڑی عبادت ہے۔ بے شک وہ اب ہم سے راضی ہو گیا تو ہم نے دونوں جہاں پالے۔





## من کے درتچے

زندگی کی راہ میں اے سوچتے ہیں ہم  
 محبتوں کی چاہ میں اے چاہتے ہیں ہم  
 وہ نگاہ جس کا التفات کبھی بھولتے نہیں  
 اسی اک نگاہ سے ہر شام گچھلتے ہیں ہم

اس خوبی نما گھر کی طرز تعمیر پرانی سہی، مگر اس کے بڑوں کی سوچ اتنی پرانی ہرگز نہیں تھی جتنا کہ اس کی ممانے بنا رکھی تھی۔ رسم و رواج کے پابند، پردہ و پرہیز، ایک دوسرے سے محبت اور لحاظ، دوسروں کے لیے ہمدردی اور خلوص اور بزرگوں کے حکم کی پاسداری۔ ہاں شاید انہی چیزوں کو ممانے پرانی سوچ اور گھٹیا ذہنیت کا نام دیتی تھیں۔ کیونکہ ان کے گھر کے ماحول میں تو یہ سب تھا ہی نہیں۔ ڈیڈ اور بھیا کو اپنے بزنس سے فرصت نہ تھی، ممانے ہی مشاغل تھے۔ رات کو سونا، دوپہر کو اٹھنا، پھر یوگا، ناشتہ اور پھر پارلر، انہیں رات میں روز ہی کسی پارٹی میں جانا ہوتا تھا۔ ممانے کی اتنی ساری فرینڈز تھیں، روزانہ ہی کسی کے گھر میں پارٹی ہوتی تھی۔ کبھی ڈیڈ کی بزنس پارٹیاں، جن میں وہ بڑے شوق سے شرکت کرتی تھیں۔ اس کی ممانے ایک الزماؤرن خاتون تھیں۔ بچوں کے لیے ان کے پاس کبھی وقت نہیں رہا اور ڈیڈ! ممانے کے مقابلے میں کچھ خیال رکھنے والے بچوں کو توجہ دیتے تھے اپنی مصروف زندگی میں سے..... ہاں یہ ضرور تھا کہ ڈیڈ چھٹی والے دن کہیں نہیں جاتے تھے۔ سارا نام گھر پر رہتے، شاید اسی لیے ان دونوں بہن بھائیوں کے دل میں ماں باپ کی طرف سے بدگمانی نہیں تھی، جو اکثر بچوں میں ہوتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈیڈ بنیادی طور پر اس چھوٹے سے گاؤں سے تعلق رکھتے تھے، شہر کی دنیا میں جا کے بڑی طرح خود کو مگن کر کے ممانے جیسی ماؤرن بیوی کے ہوتے بھی ان کے اندر وہ تمام تر تہذیب و تربیت موجود رہی جو اس گاؤں کی خاصیت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اپنی ممانے کہیں زیادہ وہ ڈیڈ کے قریب تھی، البتہ اس کا بھائی بالکل ممانے پر گیا تھا لیکن احراز شاہ کے مزاج میں ڈیڈ کی تربیت ضرور موجود تھی۔ اپنے بھائی کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کے لب مسکرا دیئے۔

”خیریت مس کشف نواز! خود بخود مسکرایا کیوں جا رہا ہے؟“ مدیحہ کی آواز پر یکدم وہ چونکی، پھر ہنس دی۔

”یونہی فارغ بیٹھی تھی سوچا اچھی اچھی باتیں یاد کر لوں۔“

”اوکے! لوچائے.....“ یہاں شام کی چائے بہت کم لوگ پیتے تھے۔ خاص طور پر بزرگ سوائے دادی جی کے مگر اس کا شام کی



چائے کے بنا گزارا نہیں تھا۔ مدیحہ، حماد احسن وہ اور دادا جی، صرف چار بندے تھے ایسے جو اس وقت چائے پیتے تھے۔ دادی ماں خلاف تھیں اس جان جلانے والی بیماری کے.....

”آج حماد نہیں آیا اب تک.....؟“

”وہ تو آج شہر گیا ہے، صبح ہی آئے گا۔ میرے پیپر شروع ہونے والے ہیں ناں، ڈیٹ شیٹ لینے گیا ہے۔“

”مدھو! تم کالج میں ایڈمیشن لے لو نا!“

”تو بہ کرو یا! تمہیں نہیں پتا اماں کو میرا میٹرک کے بعد پڑھنا بہت بُرا لگا ہے۔ حماد بھائی نے صرف اپنی ضد پر مجھے بی اے کرایا ہے۔“

”کیا.....؟ دادی اماں تعلیم کے خلاف ہیں؟“

”نہیں! اعلیٰ تعلیم کے خلاف ہیں۔ یہاں گاؤں میں کئی سال پہلے دو لڑکیوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی مگر بعد میں ان کے غلط قدم اٹھانے پر اب لوگ لڑکیوں کو زیادہ پڑھانے سے ڈرتے ہیں، صرف میٹرک تک اسکول ہے یہاں اور اتنی ہی ہمیں اجازت ہے۔“

”یار مدھو! یہ ہمارے معاشرے کا بہت بڑا المیہ ہے۔ چند لڑکیوں کے غلط فیصلوں کی سزا ہم معاشرے کی تمام لڑکیوں کو دیتے ہیں۔“

”سو تو ہے کشف! مگر غلط بھی تو ہم جیسی لڑکیاں کرتی ہیں۔ پھر چاہے عمر بھرا اپنے فیصلے پر پچھتاتی رہیں۔“

”مدھو! تم لومیرج کے خلاف ہو؟“ کشف نے سوال کیا۔

”پتا نہیں کشف! مگر میرے خیال سے محبت صرف شادی کے بعد بہتر ہے۔ اس سے پہلے صرف جذباتیت ہوتی ہے اور

بس.....!“

”یعنی ہمارے ماں باپ اگر کسی ایسے بندے سے ہمارا رشتہ جوڑ دیں جس کے بارے میں ہم جانتے تک نہ ہوں اور اس کا

مزاج، خاندانی پس منظر یہ سب تمہارے نزدیک بہتر ہے؟“

”نہیں کشف! میں اس چیز کے خلاف نہیں ہوں۔ ہر انسان کی اپنی سوچ ہوتی ہے، اپنا نکتہ نظر ہوتا ہے۔ ہمارے ماں باپ

ہمارے لیے کوئی فیصلہ کرتے ہیں تو یقیناً ہر طرح سے جانچ کر ہمارے اچھے بُرے کا سوچ کر کرتے ہیں۔ کیونکہ ہر ماں باپ کو اپنے بچوں

کے مستقبل کی فکر ہوتی ہے۔ لڑکیاں جب پیدا ہوتی ہیں تب سے ہی ماں باپ کو ان کی فکر سنا شروع ہو جاتی ہے۔“

”مدھو! تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ بالفرض میں تمہاری ہر بات مان بھی لوں مگر تمہارے اندر بالکل بھی یہ خواہش نہیں ہے کہ اگر

تمہارے والدین تمہارے لیے جو لڑکا منتخب کرتے ہیں، تم اسے دیکھو، اس سے بات کرو تا کہ اس کا مزاج، سوچ اور طبیعت کا تمہیں اندازہ

ہو جائے، اس کی پسندنا پسند معلوم ہو جائے، اس طرح آنے والی زندگی سہل ہو جاتی ہے۔“

”کشف! میرے نزدیک زندگی کی خوبصورتی اسی چیز میں ہے، بالفرض میرے والدین میری شادی ایسے انسان سے کرتے ہیں

جسے میں شروع سے جانتی ہوں، اس کی سوچ، پسندنا پسند ہر چیز کا مجھے علم ہو تو پھر شادی کے بعد کی اور شادی کے پہلے کی زندگی میں کیا فرق رہ

جائے گا؟ ایک ایسے انسان سے رشتہ جڑنا، جس کی ہر بات ہر سوچ میرے لیے نئی ہو، دھیرے دھیرے اس کے مزاج کے ہر موسم سے مجھے آشنائی ہو، ہر گزرتے دن میں اس کی پسند مجھے پتا چلے تو زندگی کتنی اچھی لگے گی کہ اس شخص کے ساتھ بھلے عمر گزارنی ہے، پرت در پرت دھیرے دھیرے ہم ایک دوسرے کو سمجھیں اور جانیں اور جب مزاج آشنائی ہوگی تو زندگی خود سہل ہو جائے گی۔“

”اور اگر پسند ناپسند پر روز تکرار ہو، چھوٹی چھوٹی باتوں پر روز ہی بحث یا جھگڑا ہو تو پھر.....؟“

”یہ تو زندگی کا حصہ ہے کشف! لڑائی جھگڑے تو ان لوگوں میں بھی ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کو جان کر سمجھ کر شادی کرتے ہیں۔“

”اُف خدایا! مدیحہ تم بہت حیرت انگیز بات کر رہی ہو۔“ کشف سر تھام کر بولی۔

”دراصل کشف! تمہارے اور میرا حوال اور سوچ میں جو فرق ہے اس وجہ سے شاید ہم ایک دوسرے کو اپنی بات نہیں سمجھا سکتے۔“

”تو کیا ہوا مدھو! تب بھی میری بس یہ ہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری ہر خواہش پوری کرے اور تمہیں ایسا ہی انسان ملے جس کے

ساتھ تم خوش رہو۔“ ان اختلافات کے باوجود مدیحہ اسے بہت پسند تھی، تب ہی تو صرف ایک ہفتہ میں دونوں میں اچھی دوستی ہو گئی تھی۔

اسے لگتا تھا کہ یہاں آ کر اس نے اپنا جیون ساتھی چن لیا ہے۔ حماد احسن کی صورت میں اس نے اپنے خوابوں کی تعبیر پالی ہے، اب صرف

گھر جا کے ڈیڈ اور ماما سے بات کرنا باقی تھی۔

”بہت یاد کروں گی میں تمہیں کشف! تمہارے آنے سے میری بوریت دور ہو گئی تھی۔ اچھی دوست مل گئی تھی اب جانے کب

ملاقات ہو؟“

”ان شاء اللہ بہت جلد ملیں گے مدھو! اور کبھی نہ بچھڑنے کے لیے.....“ اس کی آنکھوں کی چمک اور لبوں کی کھلتی مسکراہٹ پر

مدیحہ بھی مسکرا دی۔

”مگر کیا انکل آنٹی مان جائیں گے؟“

”ڈیڈ تو بخوشی مان جائیں گے مگر ماما اور بھائی تو تھوڑا ناظم لگے گا لیکن ہونا تو وہی ہے نا جو میری خواہش ہے۔“

”اللہ کرے!“ مدیحہ نے دل سے دعا کی۔ اگر کشف نواز کے روپ میں اسے اچھی بھابی مل جائے تو اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔

”چلو کشف! ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔“ حماد اسے چھوڑنے جا رہا تھا۔ وہ سب سے مل کر اس کے ہمراہ چل پڑی۔ اس کے آنے

سے سب جتنے خوش تھے، اس کے جانے پر دکھی بھی تھے۔ اسٹیشن تک وہ خاموش رہے تھے مگر ٹرین میں بیٹھتے ہی وہ حماد احسن کی اتری صورت

دیکھ کر ہنس دی۔

”تمہیں کیا ہوا ہے؟“

”کشف! مجھے نہیں لگتا ہم دونوں نے مل کر زندگی گزارنے کے جو خواب دیکھے ہیں وہ کبھی حقیقت ہوں گے؟ تمہارے اور

ہمارے درمیان ماحول کی یہ دوری.....“

”حماد احسن پلیز! میں نے خواب نہیں دیکھے، سوچ سمجھ کر کھلی آنکھوں سے تمہارے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ ڈیڈ میرا ساتھ دیں گے۔ باقی مجھے کسی کی پروا نہیں۔ میں اپنی زندگی ماما کے سر پر ہرے بے ہودہ لڑکوں کے ساتھ نہیں گزار سکتی۔ ساری عمر اس ماحول میں رہنے کے باوجود حماد مجھے وہ ماحول نہیں بھاتا۔ میں وہاں سے دور جانا چاہتی ہوں، پُر سکون اور صاف ستھرے ماحول میں..... بناوٹ اور جھوٹ کے اس ماحول میں جہاں صرف ایک دوسرے سے بازی لے جانے کے لیے لوگ ہر اچھے بُرے کام کر گزرتے ہیں۔“ وہ جذباتی ہو گئی۔

حماد نے اس کے نرم نازک ہاتھ پر مضبوط ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔ ”میرا مقصد یہ نہیں تھا۔“

”مجھے پتا ہے تمہارے دل میں خوف ہے لیکن حماد! کم از کم میرے ارادوں کو یوں کمزور مت کرو۔ مجھے پتا ہے شہر کے اور یہاں کے ماحول میں فرق ہے لیکن تم تو یہاں کے عام لوگوں کی طرح نہیں ہونا! تم ایک ڈاکٹر ہو، سمجھ بوجھ رکھتے ہو۔ میرے ڈیڈ کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ ان کی تو خود یہ خواہش تھی میرا ہاؤس جاب مکمل ہو جائے تو وہ میری شادی کسی اچھے ڈاکٹر سے کر دیں۔ اس چیز سے کیا فرق پڑتا ہے کہ تم کسی شہر کے بڑے اسپتال کے بجائے یہاں گاؤں کے لوگوں کی خدمت کر رہے ہو۔“ کشف نہیں چاہتی تھی کہ حماد احسن اور اس کے درمیان کوئی بھی چیز وجہ اختلاف بنے۔ وہ ایک حقیقت پسند لڑکی تھی اور تمام تر حقیقتوں کو سمجھ کر اس نے یہ فیصلہ کیا تھا۔



”کشف بیٹا! اگر تم نے یہ فیصلہ صرف میری ذات کے سبب کیا ہے تو میں خوش ہوں، مگر میں اتنا خود غرض نہیں ہوں بچے! میں سمجھتا ہوں تمہاری تربیت اور پرورش جس ماحول میں ہوئی ہے وہ گاؤں کے ماحول سے بالکل الگ ہے۔ محض پندرہ دن گزار کر تم اتنا بڑا فیصلہ کر رہی ہو؟ یہ محض جذباتی فیصلہ ہے۔“

”نو ڈیڈ! حماد احسن کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ محض وقتی یا جذباتی نہیں ہے۔ میں نے تمام تر حقیقتوں کو مد نظر رکھا ہے اور پھر ڈیڈ وہ بھی تو ڈاکٹر ہے میری طرح۔ یہ ہی خواہش تو تھی آپ کی..... ڈیڈ زندگی بھر پیسہ کمانا ہی تو مقصد حیات نہیں ہوتا۔ پیسے کی کمی مجھے نہ یہاں ہے اور نہ وہاں ہوگی۔ حماد احسن انسانیت کے لیے وہاں کے لوگوں کی ہمدردی میں ان کی خدمت کر رہا ہے اور میں بھی چاہتی ہوں کہ میں ان لوگوں کے لیے کچھ کروں اور رہی اس ماحول میں ایڈ جسٹ کرنے کی بات تو مجھے وہاں کا پُر سکون ماحول یہاں سے اچھا لگتا ہے۔ یقین کریں ڈیڈ! یہ فیصلہ میں نے سوچ سمجھ کر کیا ہے اور اس امید پر کہ آپ میرا ساتھ دیں گے۔“

”بچے! مجھے صرف تمہاری خوشی عزیز ہے اور بس! اگر تم خوش ہو تو وہی ہوگا جو تمہاری خواہش ہے۔“ ڈیڈ نے اسے تسلی دی تو وہ مسرور ہو گئی لیکن دھماکا تو ہونا تھا۔ جب ماما کو یہ بات پتا چلی تو وہ فوراً ہی اس کے سر پر آکھڑی ہوئیں۔ اتفاق سے بھیا بھی گھر پر تھے۔

”تم پاگل ہو گئی ہو کشف! اس گندے ماحول میں پندرہ دن گزار کر میری ساری تربیت پر پانی پھیرنا چاہتی ہو؟ کیا چاہتی ہو تم کہ تمہاری ماما عمر تمہاری شکل نہ دیکھیں؟ میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی، ویسے بھی میں نے مسز بخاری سے کہہ دیا ہے دانیال بخاری کے لیے۔“



”مما! یہ ہرگز نہیں ہوگا۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں، میں صرف حماد احسن سے شادی کروں گی۔“

”آخر ان پست ذہن لوگوں نے تم پر کیا جادو کر دیا ہے جو تم ہماری بیٹی ہی نہیں رہیں؟“

”خدا کے لیے ممما! اتنی الزما ڈرن ہیں آپ، اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے، شہر کے جدید ماحول میں رہتی ہیں، ہائی سوسائٹی میں آپ کا

نام ہے اور سوچ آپ کی کیا ہے؟ جادو ٹوٹنے..... خدایا! ممدوہ لوگ پست ذہن ہوں نہ ہوں مگر اس طرح کی باتیں نہیں سوچتے۔“

”بس یہ ہی ڈرتا مجھے اتنی دیر تمہارے باپ کو اس گندے ماحول سے الگ کرنے میں لگی تھی اور اب تم چار دن رہ کر آئی ہو تو

تمہاری زبان پر بھی ان کا ہی اثر ہے۔ لیکن کان کھول کر سن لو، میں ہرگز تمہاری شادی وہاں نہیں کروں گی۔ میں ابھی مسز بخاری کو فون کرتی

ہوں کہ وہ وانیال اور تمہاری منگنی کی تیاری کریں۔“ ان کا انداز ایسا فیصلہ کن تھا کہ ڈیڈ کو مخالفت کرنی پڑی۔

”دسلٹی پلیز! ہر بات کو ضد اور آنا کا مسئلہ مت بنایا کرو۔ ہمارے لیے ہمارے بچوں کی خوشیاں سب سے اہم ہیں۔“

”اگر وہ کنویں میں چھلانگ لگانا چاہیں تو لوگانے دوں شاہ نواز احمد!“ وہ تلملا کر بولیں۔

”ساری عمر تمہاری میرے خاندان سے نفرت برقرار رہی ہے لیکن آج میں اپنی بچی کی خوشیاں تمہاری نفرت کی بجائے نہیں

چڑھنے دوں گا۔“ ڈیڈ کو شدید غصہ آ گیا اور وہ دونوں بہن بھائی جانتے تھے کہ ڈیڈ دل کے مریض ہیں، غصے سے ان کی طبیعت بگڑ جاتی ہے سو

جہاں کشف لپکی وہیں احزاب شاہ بھی اٹھ کر آیا تھا۔

”ڈیڈ پلیز! آپ غصہ نہ کریں اور ممما! اگر کشف نے اپنی مرضی سے یہ فیصلہ کیا ہے تو آپ کو کیوں اعتراض ہے؟ وہ بچی نہیں ہے

اپنا اچھا برا سمجھتی ہے۔“ وہ پہلی بار اس سارے معاملے میں بولا تھا۔

”احزاب تم بھی؟ ارے یہ دونوں باپ بیٹی پاگل ہو گئے ہیں، کم از کم تم تو میرا ساتھ دو۔“

”ہاں ہیں ہم پاگل..... لیکن دسلٹی بیگم! اب تم بھی کان کھول کر سن لو، جو کشف چاہتی ہے وہی ہوگا۔ میں دیکھتا ہوں کون مجھے منع

کرے گا۔“ ڈیڈ چیخ کر بولے مگر اگلے ہی پل سینہ تھامنے لگے۔ ماما پیر پختی اندر چلی گئیں اور وہ دونوں بہن بھائی ڈیڈ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

آرام سے ان کے کمرے میں لٹا کر انہیں دوائیں دے کر جب وہ باہر آئے تو احزاب شاہ بولا تھا۔

”کشف! یہ ساری زندگی کا معاملہ ہے، کیا تم نے اچھی طرح سوچ لیا ہے، تم وہاں لائف گزار سکتی ہو؟“

”یس برادر! میں نے بہت اچھی طرح سوچ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔“ اس کا لہجہ اٹل تھا۔

”اوکے، تمہاری مرضی! میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔“ احزاب یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا اور وہ مسکرا دی۔ یعنی بھیا بھی مان گئے،

مما بھی مان ہی جائیں گی۔



ڈیڈ کی طبیعت سنبھل نہیں رہی تھی کیونکہ روز ہی اسی مسئلے کو ڈسکس کیا جاتا تھا۔ افسوس کشف کو ممما کے توہین آمیز رویے پر ہوتا



تھا۔ ماما تو ان لوگوں کو انسان ہی نہیں سمجھتی تھیں۔ اپنے سرال سے ہر عورت کو ہی شکایت ہوتی ہے۔ مگر ماما کو تو ان سے نفرت تھی، وہ بھی انتہا درجے کی اور اس کی وجہ اسے سمجھ نہیں آتی تھی۔ اگر ان سے اتنا چڑتی تھیں تو ڈیڈ بھی ان میں سے ہی تھے، پھر ماما نے انہیں کیسے قبول کر لیا تھا۔ ٹھیک ہی کہتا تھا حماد احسن۔ ”کشف! جتنا آسان تم سمجھ رہی ہو یہ سب اتنا آسان ہے نہیں۔“ اب واقعی اسے سمجھ آیا تھا کہ حماد احسن نے اپنی پوری تعلیم شہر میں مکمل کی مگر کبھی ان کے گھر کیوں نہیں آیا حالانکہ وہ ان کا سگا پھوپھی زاد تھا۔ ماما نے کتنے پیار بھرے رشتے ان سے ہمیشہ دور رکھے تھے۔ پھوپھو، اماں، بڑے ابا، چاچو..... صرف بڑے چاچو تھے جو ان کے گھر آتے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بھی اپنی حقیقت بھول کر شہر کے اس دو غلے ماحول میں رچ بس گئے تھے۔

وہ بظاہر ناشتہ کر رہی تھی، آج اس کی ڈیوٹی آف تھی اور کچھ اپنی ذہنی پریشانی کی وجہ سے وہ کمرے سے ہی نہیں نکلی تھی مگر ذہن کہیں اور ہی الجھا ہوا تھا۔ ڈیڈ اور بھیا بھی ناشتے کے بعد اخبار دیکھ رہے تھے۔ ماما اب تک سوکر نہیں اٹھی تھیں۔ ناشتے کے بعد وہ ڈیڈ کے پاس آ بیٹھی جو اس کا مرجھایا چہرہ دیکھ چکے تھے۔

”کشف! بچے تم ٹھیک تو ہو؟“

”لیس ڈیڈ!“ بظاہر بے پروائی سے کہہ کر اس نے ٹیبل پر دھرا اخبار اٹھا لیا۔

”مجھے پتا ہے بیٹا! تم اداس ہو، مگر فکر مت کرو، تم جیسا چاہو گی وہ ہی ہوگا۔“

”مگر ڈیڈ! میں ماما کی مرضی کے بنایہ کیسے کر سکتی ہوں؟ میری خواہش ہے کہ میری اس خوشی میں تمام لوگ دل سے شامل ہوں لیکن ماما.....؟“

”ایک بات کہوں اگر اپنی ماما کی رضا مندی کی فکر کرو گی تو یہ خواہش چھوڑ دو۔ جس عورت نے مجھ سے میرا ہر رشتہ چھڑا دیا، میری ماں، باپ، بیوی، بہن، چھوٹا بھائی..... اور اسے اس چیز پر زرا پشیمانی نہیں تو وہ تمہیں بھی ان لوگوں سے ملنے نہیں دے گی۔“ ڈیڈ آزر وہ لہجے میں بولے۔ احزاز نے کبھی ان باتوں پر غور نہیں کیا تھا پر آج وہ بھی سن رہا تھا۔

”ڈیڈ! ماما کیوں اتنا برا سمجھتی ہیں ان لوگوں کو؟“

”کیونکہ تمہارے گریڈ فادر یعنی نانا اور میرے بابا دونوں گئے بھائی ہیں۔ تمہاری ماں شروع سے اسی ماحول کی عادی تھی۔ اس کے والد نے اس کی مرضی کے خلاف اس کی شادی مجھ سے کر دی مگر وہ ہمارے گھر میں اور وہاں کے سادہ ماحول میں نہ رہ سکی۔ کوشش کرتی تو شاید رہ بھی سکتی تھی مگر تمہاری ماں کو تو یہ لگتا تھا کہ اس کی زبردستی شادی کر کے سب نے اس سے دشمنی نکالی ہے، وہ نا صرف اپنے والدین سے بلکہ میرے گھر کے ہر فرد سے خفا تھی۔ مجھ سمیت میرے تمام گھر والوں سے نفرت کرتی تھی، ہمیں جاٹل، اجڈ، گنوار، اُن پڑھ جانے کن کن لفظوں سے نوازتی۔ اماں بی نے سب سہہ لیا کیونکہ وہ ان کے جیٹھ کی بیٹی تھی لیکن تمہاری ماں کی دن بدن بڑھتی نفرت نے میرے اندر لاوا بھردیا اور ایک دن میں غصے میں اسے لے کر شہر آیا اور اس کے ماں باپ کے گھر چھوڑ گیا۔ میرے تایا مجھے روکتے رہے مگر میں نہیں رکا۔

گھر پہنچا تو میرے ماں باپ الگ مجھ پر برس پڑے کہ میں نے غلط کیا بلکہ اگلے دن ہی وہ مجھے لے کر بھائی کے گھر شہر آ گئے۔ ان سے معافی مانگی اور تمہاری ماں کو منایا کہ گھر چلے لیکن تمہاری ماں نے صاف انکار کر دیا۔ بیٹا! ہمارے بزرگ یہ رشتہ ختم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ دو بھائی الگ ہونا نہیں چاہتے تھے، اس لیے اباجی نے تمہاری ماں سے پوچھا کہ وہ کیا چاہتی ہے اور اس نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ ”اگر وہ اپنے بیٹے کا گھر بسانا چاہتے ہیں تو اس کو یہاں شہر میں رہنے کی اجازت دیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ میرے گھر کے کسی فرد کو مجھ سے ملنے آنے کی اجازت نہیں ہوگی، میں چاہوں تو خود گاؤں جا کے مل سکتا ہوں۔“ مجھے یہ شرط قطعاً منظور نہ تھی مگر اباجی نے ان کی یہ بات بھی مان لی کہ میرا گھر نہ اجڑے، وہ نہیں سمجھ سکے کہ گھر دل سے بستے ہیں اور جب دلوں میں جگہ نہ رہے تو گھر نہیں بستے..... میں نے ان کی بات تو مان لی مگر ان سے شدید خفا ہو گیا، جب تک تیار رہے، مجھے سمجھاتے رہے، سلمیٰ سے بھی باز پرس کرتے رہے۔ مگر ان کے گزر جانے کے بعد سلمیٰ کو کسی کی پروا نہیں رہی۔ مجھے تو پہلے ہی کچھ نہ سمجھتی تھی، تایاجی کے بعد ان کا کاروبار میرے کندھوں پر آ گیا اور یوں میں بھی اس مصروف ترین زندگی کا حصہ بن گیا۔ تم دونوں نہ ہوتے تو شاید میں کب کا چلا جاتا کیونکہ تمہاری ماں کو نہ گھر کی فکر ہے نہ شوہر اور نہ بچوں کی..... وہ صرف اپنی ذات کے لیے جیتی ہے۔ ایسے میں اگر میں کوئی غلط فیصلہ کرتا تو تم دونوں کی زندگی تباہ ہو جاتی اور میں اپنے بچوں کو کوئی دکھ نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے تمہاری ماں کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اور اپنے آپ کو کاروبار اور بچوں میں مگن کر لیا۔ ماں باپ سے خفا تھا سو مز کر وہاں بھی نہیں گیا۔ لیکن تم نے خواہش کی جانے کی تو تمہیں منع بھی نہیں کیا۔“ پہلی بار ایسا ہوا کہ اس نے ڈیڈ کو اتنا کمزور شکست خوردہ دیکھا تھا۔ ان کی آنکھوں کے گوشے نم تھے۔ ہاں یہ سچ تھا کہ ڈیڈ کی توجہ اور محبت پا کر ہی وہ بڑے ہوئے تھے، ماما کی اپنی مصروفیت تھی، ان کے پاس تو شاید اپنے بچوں کے لیے وقت نہیں تھا۔

”ڈیڈ پلیز.....!“ احزاز اٹھ کر ان کے پاس آ گیا۔ ”آپ کیوں دکھی ہو رہے ہیں، ماما کو ان کے حال پر چھوڑ دیں اور آپ کشف کی شادی کی تیاری کریں۔“

”احزاز! تم چلو گے میرے ساتھ گاؤں کشف اور حماد کی شادی کرنے کے لیے.....؟“

”ڈیڈ میری ایک ہی بہن ہے، ہم اس کی شادی دھوم دھام سے کریں گے، یہیں اپنے گھر سے رخصت کریں گے۔“

”ہاں مگر بات کرنے کے لیے تو جانا پڑے گا نا!“

”جب آپ چاہیں میں تیار ہوں، مگر آپ ماما کی ٹینشن نہ لیں پلیز! آپ ٹھیک ہوں گے تو ہم جائیں گے نا!“

”میں بالکل ٹھیک ہوں، مجھے فکر یہ ہی تھی کہ کہیں تم بھی اپنی ماں کی طرح اڑ نہ جاؤ مگر..... مجھے خوشی ہے کہ تم میرے ساتھ ہو۔“

واقعی شاہ نواز احمد کو احزاز شاہ کی رضا مندی سے حوصلہ ملا تھا۔ وہ بہت پرسکون اور ہلکا پھلکا محسوس کر رہے تھے خود کو۔

”ڈیڈ!“ احزاز نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھاما۔ ”میں جانتا ہوں ماما کی طرح میں بھی اسی ماحول کا عادی ہو چکا ہوں اگر میں منع کرتا تو صرف اس لیے کہ کشف اس ماحول کی عادی نہیں ہے پر جب وہ ہی راضی اور خوش ہے تو بھلا مجھے کیا اعتراض.....“

”شکریہ برادر!“ کشف نے بھائی کو مشکور نظروں سے دیکھا تو وہ مسکرا دیا۔



نمانے تمام گھر والوں کا بایکاٹ کر رکھا تھا۔ کشف انہیں منانا چاہتی تھی مگر ڈیڈ اور احراز بھائی کا خیال تھا کہ فی الوقت یہ کوشش فضول ہے، سودہ بھی چپ ہو گئی۔ گاؤں جانے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ ڈیڈ نے ماما کو مطلع بھی کر دیا تھا اور اتوار کو ڈیڈ اور احراز دونوں ہی روانہ ہوئے تھے۔

گاؤں پہنچے تو لمحہ بھر کو شاہ نواز احمد کی دھڑکن تھم سی گئی تھی۔ برسوں بعد وہ گاؤں آئے تھے۔ اماں جی اور اباجی نے انہیں دہلیز پار کرتے ہی دیکھ لیا تھا۔ ان کی نکھیں ترس گئی تھیں اپنے بیٹے کو دیکھنے کے لیے..... اماں جی تڑپ کے آگے بڑھی تھیں اور شاہ نواز احمد نے ان کے شانوں پر سر رکھ دیا۔ اباجی بھی ان سے گلے لگے کافی دیر کھڑے رہے۔

”السلام علیکم ماموں جی!“ اس کی آواز پر وہ اباجی سے علیحدہ ہوئے تو اپنے سامنے خوبرو اور ذہانت سے بھرپور آنکھوں والے نوجوان کو دیکھ کر فوراً پہچان گئے کہ حماد احسن ہی ہو سکتا ہے۔

”وعلیکم السلام بچے!“ انہوں نے گرم جوشی سے اسے گلے لگا لیا۔ حماد احراز شاہ سے بھی تپاک سے ملا تھا۔

”اللہ کا شکر ہے کہ ڈیڈ کے علاوہ میں بھی کسی کو نظر آیا۔“ اس نے سنجیدگی سے گلے کیا کیونکہ ایک تو اتنا لمبا سفر گاڑی میں اس نے پہلی بار کیا تھا۔ دوسرا یہاں پہنچے تو ڈیڈ، ڈیڈ ہی ہو رہا تھا اب تک اس پر کسی نے نظر تک نہ ڈالی تھی۔

”ارے بگ برادر سوری بھئی.....“ حماد احسن نے مسکراتے ہوئے معذرت کی۔

”ماں صدقے جائے پڑ دے.....“ اماں جی نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ زندگی میں پہلی بار تو وہ پوتے کو دیکھ رہی تھیں۔ ڈیڈ کے بعد اب اس کی باری تھی۔ سب نے باری باری اسے پیار کیا، پھوپھو بھی آگئی تھیں۔

”عبدالجبار نظر نہیں آ رہا اماں جی.....“ کافی دیر گزرنے کے بعد ہی انہیں چھوٹا بھائی نظر نہیں آیا تو وہ پوچھ بیٹھے مگر جواب میں سب کے چہروں پر چھائی افسردگی انہیں فکر مند کر گئی۔ ”اماں جی! کیا بات ہے..... آپ لوگ اتنے چپ اور غمزہ کیوں ہو گئے؟“ ان کے استفسار پر اماں جی رو دیں۔

”شاہ نواز پٹر! کل تیرے دیر کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ بڑی بُری حالت ہے میرے بچے کی.....“

”اباجی..... اماں..... آپ لوگوں نے مجھے اطلاع بھی نہیں دی؟“

”پٹر! بہو کے ڈر سے.....“

”اماں! حد ہو گئی۔ صرف اس عورت کی وجہ سے آپ لوگوں نے مجھ سے میرا ہر رشتہ دور کر دیا ہے لیکن اس عورت کا غرور کم پھر بھی

نہ ہوا۔ کہاں ہے عبدالجبار! مجھے ملنا ہے اس سے.....“



”ماموں پلیز! آپ ابھی تھکے ہوئے آئے ہیں، کچھ دیر آرام کریں پھر میں آپ کو ہسپتال لے جاؤں گا۔“

”ہسپتال! مگر اس کے پاس وہاں ہے کون؟“

”پٹر! مدھو ہے وہاں..... اس کی دھمی.....!“

”حماد بیٹا! مجھے ابھی لے چلو، میں برسوں سے پھڑا ہوا ہوں اپنوں سے..... اب صبر نہیں ہوتا۔ میرا چھوٹا بھائی ہسپتال میں ہے،

میں کیسے آرام کر لوں؟ تم چلو بیچے!“

”شاہ نواز! کوئی چائے پانی تو پی لے۔ ابھی تو آ کے بیٹھا ہے۔“

”جی ڈیڈ! اللہ بہتر کرنے والا ہے، آپ پلیز اتنی فکر مت کریں۔ ابھی فریش ہو جائیں پھر چلیں گے۔“ احزاب ان کی طبیعت کے

باعث پریشان ہوا، وہ تو گھر سے ہی ٹینس تھے اور اب چاچو کا ایکسیڈنٹ..... شاید احزاب کے سمجھانے کا اثر تھا کہ وہ خاموش ہو گئے۔ فریش

ہو کر آئے تو کھانا تیار تھا۔ ابا جی کی خاطر انہوں نے انکار نہیں کیا۔ احزاب بھی فریش ہو کر آ گیا تھا۔ کھانے کے فوراً بعد وہ جانے کو تیار تھے۔

حماد انہیں اپنی گاڑی میں ہسپتال لے گیا تھا۔ عبد الجبار ابھی بھی انجکشن کے زیر اثر تھے لیکن ان کے وجود سے لپٹی پٹیاں انہیں رُلا گئیں۔

”مدھو! ماموں..... کشف کے ڈیڈ!“ حماد نے ہونق بنی مدیحہ کو بتایا۔

”السلام علیکم! تایا جی!“

”جیتی رہو بیچے!“ انہوں نے اس کا سر تھپکا تبھی عبد الجبار کے وجود میں جنبش ہوئی تو شاہ نواز ان کی طرف لپکے۔

”عبد الجبار میرے بھائی! دیکھ تو..... میں تجھ سے ملنے آیا ہوں۔“ ان کے لہجے میں بے تابی تھی، آنکھوں میں نمی تھی۔ ان کی

آواز پر عبد الجبار نے بمشکل آنکھیں کھولی تھیں۔

”بھائی جی..... آپ.....؟“ ان کی آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے۔

”آنکھیں ترس گئیں..... بھائی جی آپ کو دیکھنے کو..... میری آخری خواہش تھی کہ زندگی میں ایک بار آپ سے مل لوں پھر رب

چاہے سانس کی بھی مہلت نہ دے اور سو بنے رب نے پوری کر دی.....“ وہ بہت مشکل سے بول رہے تھے۔

”نامیرے جھلے بھائی! ایسا نہ کہہ، اللہ تجھے میری حیات بھی لگا دے، اللہ تجھے صحت دے۔“ وہ تڑپ اٹھے تھے۔

”ماموں.....!“ حماد نے انہیں پکارا اور آنکھوں کے اشارے سے زیادہ بات کرنے سے منع کیا۔

”اچھا! اب تو زیادہ باتیں نہ کر، جلدی سے اچھا ہو جا پھر باتیں کریں گے۔ میں یہیں ہوں ابھی تیرے پاس.....“ انہوں نے

بھائی کا ہاتھ تھام کر تسلی دی۔ ”دیکھ تیرا بھتیجا بھی آیا ہے، تجھ سے ملنے.....“ انہوں نے کہا تو احزاب نے آگے بڑھ کر سلام کیا، وہ خوش ہو گئے۔

”جنگ جنگ جیو بیچے! لمبی عمر اس پاؤ۔“ کافی دیر وہ ہسپتال میں رہے مگر عبد الجبار کو زیادہ بولنا نہیں تھا تو انہوں نے منع کر دیا کہ وہ

خاموش لیٹے رہیں۔ شاہ نواز نے مدیحہ کو اپنے پاس بلایا اور اس سے باتیں کرنے لگے۔ جب کہ حماد اور احزاب باہر نکل گئے۔ واپسی پر حماد



ہسپتال میں رہ گیا اور مدیخان کے ساتھ آگئی۔

”پتھر! نہالے، کل سے تُو نے اپنا کیا حلیہ بنالیا ہے، جا میری رانی.....“ اماں نے مدھوکا مٹھا چوما، وہ بھیگی آنکھیں لیے اٹھ گئی  
 ”ہاجرہ! میری رانی کے لیے کھانا گرم کر کے لا، بھوکی ہے وہ کل سے.....“ انہوں نے ملازمہ کو حکم دیا پھر بیٹے سے مخاطب  
 ہوئیں۔ ”شانواز! مدھو دو سال کی تھی جب ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا لیکن پھر کوثر بانو نے ماں بن کر اسے پالا۔ تیرے بہنوئی کی وفات کے  
 بعد اس کے سسرال والوں نے اسے حویلی سے نکال دیا، چار سال کا حماد لے کر یہ یہاں آ گئی پھر حماد اور مدیحہ دونوں کو اس نے یوں پالا  
 جیسے سگے بہن بھائی ہوں۔ مدھو اسے پھوپھو نہیں، امی کہتی ہے حماد کی طرح اور حماد کو بڑا بھائی..... کل سے بچی پریشان ہے اسپتال سے گھر  
 تک نہیں آئی۔“

”اماں جی! باپ کی حالت ایسی ہو تو اولاد کو کب سکون آتا ہے۔“  
 ”اللہ میری رانی کی دعائیں قبول کرے، میرا بچہ جلد ٹھیک ہو کر گھر آ جائے۔“  
 ”آمین.....“ شاہ نواز نے دل میں کہا۔ مدھو کے آنے کے بعد اماں جی نے اسے زبردستی تھوڑا سا کھانا کھلایا تھا پھر اسے اپنی گود  
 میں لٹالیا۔

”کچھ دیر سو جا پتھر!“  
 ”مجھے نیند نہیں آتی اماں! میرا دل ادھر بابا میں انکار ہے گا۔“  
 ”اللہ خیر کرے گانچے! اب کل سے تو بہتر ہے نا!“ وہ جواباً کچھ نہ بولی بس خاموشی سے آنکھیں موند گئی کیونکہ حماد احسن نے  
 انہیں تسلی دینے کے لیے یہی کہا ہو گا ورنہ وہ اور بھائی دونوں جانتے تھے کہ بابا کی حالت بہت سیریس ہے۔  
 ”احراز کہاں ہے شاہ نواز!“

”وہیں حماد کے ساتھ ہی ہو گا اماں جی!“ وہ بولے تبھی احراز اندر داخل ہوا تھا اور شاہ نواز کے برابر میں آ بیٹھا۔  
 ”ڈیڈ! یہ گاؤں ہے، یہاں سہولیات کی کمی ہے کیوں نا ہم چاچو کو شہر لے جائیں اپنے ساتھ..... کسی اچھے اسپتال میں ان کی دیکھ  
 بھال ہوگی تو وہ جلد سنبھل جائیں گے۔ میں نے حماد کو بھی یہ آئیڈیا دیا ہے کہ مزید دیر نہ کرے اور چاچو کو لے کر ہمارے ساتھ چلے۔“  
 ”بچے! کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو، حماد سے میں بھی بات کرتا ہوں۔“

”پر شاہ نواز! یہاں وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے تو ہمیں حوصلہ ہے۔ اتنی دور ہم کیسے جائیں گے؟“ اماں کا لہجہ بھرا گیا۔  
 ”دادی! ہمت رکھیں چاچو کو وہاں اچھی ٹریٹ منٹ ملے گی، بڑے ڈاکٹر ز ہوں گے، دیکھئے گا وہ بہت جلد اچھے ہو جائیں گے۔“  
 اس نے اپنی دادی کو تسلی دی۔

”چلو اللہ بہتر کرے گا۔“ فی الوقت سب خاموش ہو گئے، رات میں شاہ نواز اپنے بھائی کے ساتھ اسپتال میں رہے تھے۔ جب

کہ احزاب کو رات گزارنا مشکل ہو گیا۔ ایک نئے اور انجان ماحول اور جگہ پر نیند آنا بہت دشوار تھا۔ ساری رات اس نے سوتے جاگتے گزاری تھی۔ کچھ دیر آنکھ لگی تھی کہ اذان کی آواز پر پھر سے جاگ گیا۔ وہ لان میں آ گیا لیکن وہاں آ کر اسے شدید حیرت ہوئی تھی۔ گھر کے سب لوگ جاگ چکے تھے۔ خواتین نماز ادا کر رہی تھیں۔ دادا جی بھی شاید مسجد سے آئے تھے، ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ وہ انجانی سی شرمندگی کا شکار ہو گیا۔ ایک وہ لوگ تھے جو شاید سالوں نماز ادا نہیں کرتے تھے، صرف عید کی نماز تھی جو وہ لوگ ادا کرتے تھے۔ ڈیڈ واحد انسان تھے ان کے گھر میں جنہیں اس نے نماز ادا کرتے دیکھا لیکن وہ بھی باقاعدہ نہیں اور یہاں..... اُف خدایا! ہم کیسے مسلمان ہیں؟ اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ فریش ہو کر اس نے وضو کیا اور نماز ادا کرنے مسجد گیا۔ واپسی پر اس کے دل کو بہت سکون ملا تھا۔ حویلی کے اندر قدم رکھا تو دادا جی کی آواز میں قرآن پاک کی تلاوت اس کی روح تک میں اتر گئی۔ وہ ان کے پاس ہی پٹنگ پر آ بیٹھا۔ گھر کی خواتین بھی قرآن پاک پڑھ رہی تھیں لیکن دادا جی با آواز بلند تلاوت کر رہے تھے جو اس کے دل و دماغ کو بے سکون کر گئی تھی۔

”اور پتر! رات کو نیند تو اچھی آئی نا!“ قرآن پاک رکھ کر دادا جی نے پوچھا۔

”جی بس..... آئی گئی تھی۔“ حالانکہ وہ رات بھر سونہ رکھا تھا پھر بھی وہ انہیں تسلی دے گیا۔

”کشف تو ہمارے ماحول میں یوں رچ بس گئی تھی جیسے وہ ہمیشہ سے ہمارے ساتھ ہو۔ کئی دن اس کے جانے کے بعد حویلی میں

سونا پن رہا۔ بڑی پیاری دھمی ہے کشف.....!“ ان کے لہجے میں کشف کے لیے بہت پیار تھا۔

”وہ بھی آپ لوگوں کو بہت یاد کرتی ہے۔“

”اس سے مل کو یوں لگا جیسے شاہ نواز کی نوعمری لوٹ آئی ہو۔ وہ ہی عادتیں، ویسا ہی مزاج، دوسروں میں گھل مل جانے والی.....

مگر تیرا مزاج کچھ الگ ہے۔ لگتا ہے تجھے بھی ہم اچھے نہیں لگے نا!“

”تجھے بھی“ کا مطلب وہ اچھی طرح سمجھتا تھا۔

”ارے نہیں دادا جی! ایسا نہیں ہے، بس میری طبیعت ہی ایسی ہے۔ میں خاموش رہتا ہوں نا اس لیے۔“ یہ سچ تھا کہ وہ کشف کی طرح

جلد گھلنے ملنے والا بندہ ہر گز نہیں تھا۔ وہ تو اپنی ذات میں گن، سنجیدہ مزاج، کم گوسا بندہ تھا اور پھر ظاہر ہے یہاں تو وہ زندگی میں پہلی بار آیا تھا۔

”مجھے لگا شاید تجھے بھی ہم اور ہمارا ماحول اچھا نہیں لگا۔“

”ایسی کوئی بات نہیں دادا جی! آپ سب لوگ بہت اچھے ہیں، میں خوش ہوں آپ لوگوں سے مل کر۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ان

کی باتوں کے درمیان ہی ملازمہ نے نیبل وہاں رکھ کے ناشتا لگا دیا تھا۔

”چل پتر! ناشتا کرتے ہیں۔“ دادا جی نے کہا تو وہ بھی ناشتے کی طرف متوجہ ہوا۔ پراٹھے، لسی، مکھن اتنا سب کچھ ناشتے پر دیکھ کر

وہ چپ نہ رہ سکا۔

”دادا جی! میں اتنا بھاری ناشتا نہیں کرتا۔“

”ارے بچے! کچھ نہیں ہوتا۔ تُو نے کون سا روز آ کر کھانا ہے یہ..... چل کھالے!“ دادی بھی آ گئیں۔

”نو دادی اماں! پلیز مجھے صرف چائے منگوا دیں، میں مزید کچھ نہیں لوں گا۔“

”خالی پیٹ چائے مت پینا، نقصان دیتی ہے۔“ دادی ابھی اسے ہدایت کر رہی تھیں کہ ملازمہ ٹرے سنبھالے آئی اور اس کے

سامنے رکھ دی۔ سلاکس، آلیٹ اور چائے۔

”شکریہ!“ وہ مسکرا دیا۔ ناشتے کے بعد وہ حماد کے پاس اسپتال چلا گیا۔ چاچو کی وہ ہی حالت تھی۔

”حماد! تم ڈاکر ہو، سمجھدار ہو پلیز مزید دیر مت کرو، چاچو کو لے کر ہمارے ساتھ چلو۔“

”احراز! میرے اسپتال میں کسی بھی چیز کی کمی نہیں ہے اور رہی ڈاکٹرز کی بات تو ان شاء اللہ دس بجے تک ڈاکٹرز یہاں پہنچ رہے

ہیں ماموں کے آپریشن کے لیے، ملک کے بہترین ڈاکٹرز ہیں وہ۔“

”او کے! جیسی تمہاری مرضی!“ اس نے مسکرا کر کہا۔ اسپتال دیکھ کر وہ اندازہ کر چکا تھا کہ اس اسپتال میں شہر کے بڑے سے

بڑے اسپتال والی ہر سہولت موجود ہے۔ کہیں سے بھی یہ دیدیہات کا ایک عام اسپتال نہیں لگتا تھا جو حماد احسن کی محنت اور لگن کا منہ بولتا ثبوت

تھا۔ احراز کے دل کی خواہش تھی کہ اس کے چاچو صحت یاب ہو جائیں لیکن ڈاکٹرز کے پہنچنے کے ہی چاچو کی حالت بہت بگڑ گئی، انہیں سنبھالنا

مشکل ہو گیا۔ حتیٰ کہ حماد خود دُری طرح پریشان ہو گیا تھا، وہ مسلسل فون پر ڈاکٹرز سے رابطہ کر رہا تھا۔ ڈیڈ چاچو کے قریب ہی کھڑے تھے۔

”بھائی جی! میرا کوئی پتا نہیں..... میری بچی.....“

”حوصلہ رکھ عبدالبجبار! تجھے کچھ نہیں ہوگا۔“ انہوں نے بھائی کو حوصلہ دیا۔ ڈاکٹرز کے پہنچنے ہی چاچو کو آپریشن تھمیز لے گئے۔ ڈیڈ

کی حالت اس وقت بہت خراب تھی۔

”ڈیڈ! ان شاء اللہ چاچو ٹھیک ہو جائیں گے۔“ اس کے اپنے دل میں عجیب سی مایوسی تھی مگر پھر بھی اس نے ڈیڈ کو حوصلہ دینا چاہا۔

بہتر کرنے والا تو اللہ ہے زندگی اور موت بے شک اس کے ہاتھ تھی انسان صرف دعا کر سکتا تھا جو وہ کر رہے تھے۔ دو گھنٹے بعد چاچو کو آئی سی

یو میں منتقل کیا گیا تھا مگر اس وقت بھی ان کی حالت وہ ہی تھی۔ حماد احسن کے چہرے پر آنے والی مایوسی اور دکھ و اضطراب نے اسے فوراً ہی

سمجھا دیا تھا۔ شام کو کہیں جا کر انہیں ذرا سا ہوش آیا تھا تو انہوں نے صرف ڈیڈ سے ملنے کی خواہش کی تھی۔ حالانکہ اس لمحے ان کی بیٹی سب

سے زیادہ تڑپ رہی تھی ان کو دیکھنے کو..... پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔

”حماد بچے! دیکھ تو عبدالبجبار اب ٹھیک تو ہے نا!“ اس وقت تقریباً سب ہی وہاں موجود تھے۔

”نانو! آپ پلیز دعا کریں، ماموں بہت جلد اچھے ہو جائیں گے، میں دیکھتا ہوں۔“ اس سے پہلے کہ حماد اندر جاتا ڈیڈ باہر آ گئے۔

”حماد بیٹا! اما جی، مدیحہ اور اباجی کو اندر لے جاؤ“ عبدالبجبار سے مل لیں گے۔“ قبل اس کے کہ وہ لوگ ڈیڈ سے کچھ کہتے ڈیڈ خود ہی

بول پڑے۔ پھر وہ سب تو چاچو کے پاس چلے گئے مگر احراز اپنے ڈیڈ کو دیکھ رہا تھا۔

”کیا بات ہے ڈیڈ! آپ کیوں اتنے الجھ گئے ہیں؟“

”نو بیٹا! آپ کو ایسے ہی محسوس ہو رہا ہوگا۔ میں ٹھیک ہوں۔“ احراز خاموش ہو گیا مگر رات کی ٹکان کی الجھن و فکر مندی حد سے سوا ہو گئی۔ اسے علم بھی نہ ہوتا اگر اچانک ہی اس کی آنکھ نہ کھلتی۔ رات کا جانے کون سا پہر تھا آج اسے کچھ نیند آئی تھی مگر پھر آنکھ کھل گئی۔ ڈیڈ اس کے ساتھ ہی تھے آج گیسٹ روم میں مگر ڈیڈ کو بیڈ پر نہ پا کر وہ اٹھ بیٹھا۔ حیرت اور پریشانی تب ہوئی جب اس نے ڈیڈ کو جائے نماز بچھائے گڑگڑاتے ہوئے دیکھا۔ جانے وہ کیا مانگ رہے تھے اپنے رب سے..... مگر ان کا آنسوؤں سے تر ہوتا چہرہ احراز سے نہ دیکھا گیا۔

”ڈیڈ!.....!“ اس نے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک گئے۔ جلدی سے چہرہ صاف کیا۔ جائے نماز سمیٹ کر رکھی۔ ”آپ ٹھیک ہیں ناں ڈیڈ!“

”میں ٹھیک ہوں، بس یوں ہی دل پریشان سا ہو رہا تھا، سوچا اپنے رب کے آگے جھکنے سے دل کو سکون ملے گا۔ بس اس لیے.....“ اگر یہ سچ تھا تو پھر ڈیڈ نظریں کیوں چرا رہے تھے، جب سے وہ چاچو سے مل کر آئے تھے عجیب سے اضطراب میں تھے۔

”نہیں ڈیڈ! کوئی بات ضرور ہے جو آپ مجھ سے چھپا رہے ہیں۔ پلیز ڈیڈ! کیا مسئلہ ہے؟“ وہ ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ ان کا چہرہ اس لمحے بھی آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

”احراز! میں بد نصیب ہوں۔ میرے بھائی نے زندگی اور موت کی اس کشمکش میں مجھ سے صرف ایک خواہش کی ہے لیکن میں پوری نہیں کر سکتا۔ بس یہی تڑپ مجھے سکون سے نہیں بیٹھنے دیتی ہے، میں کیا کروں؟“

”ڈیڈ! ایسی کیا خواہش ہے جو آپ پوری نہیں کر سکتے؟“

”میں کسی کو بھی مجبور نہیں کرنا چاہتا بچے! مگر اپنے بھائی کی آس بھری نظروں کا سامنا کرنے سے بھی کتر رہا ہوں۔“

”ڈیڈ! کیا آپ کے بھائی کی خواہش سے بڑی ہے وہ مجبوری جو آپ مان نہیں سکتے؟ اس وقت صرف چاچو کی فکر کریں۔ ایسی کیا مجبوری ہے وہ..... مجھے بتائیں تو.....؟“

”احراز تم میری مجبوری سمجھ لو گے میری بات مان لو گے؟ صرف تمہارے بس میں ہے، ہماری خواہش پوری کرنا، میرے بھائی کی خواہش کا پاس رکھنا۔“ ڈیڈ نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر امید بھری نظروں سے دیکھا۔

”خدا کے لیے ڈیڈ! مجھے صاف الفاظ میں بتائیں نا کہ ایسا کیا کہہ دیا ہے چاچو نے اور میرے بس میں کیا ہے؟ میں ان کے کیا کام آ سکتا ہوں؟“ وہ شدید الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔

”احراز! عبد الجبار نے مجھ سے ہاتھ جوڑ کر درخواست کی ہے کہ وہ مرنے سے پہلے اپنی بیٹی کا گھر بتا دیکھنا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر نے صاف الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ اس کے پاس وقت نہیں ہے اور وہ چاہتا ہے کہ انہی دنوں میں مدیحہ کا نکاح ہو جائے۔“

”تو کیا ہوا؟ اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟“ اس نے ڈیڈ کو دیکھا۔



”احراز! صرف مجھے بلا کر یہ بات کہنے کا مقصد یہ تھا کہ اس کی خواہش ہے کہ مدیحہ کا نکاح تم سے کر دوں۔“ کتنی آس امید سے ڈیڈ نے اسے دیکھا تھا جو یہ سن کر ہی اچھل پڑا تھا۔

”کیا..... نہیں..... نہیں..... یہ ناممکن ہے۔ پلیز ڈیڈ!“

”میں جانتا ہوں احراز! تبھی تو اللہ کے حضور معافی طلب کر رہا تھا کہ میں اپنے مرتے بھائی کی ایک خواہش تک پوری نہیں کر سکتا کتنا لاچار ہوں میں.....“ وہ بڑی طرح رو دیئے۔

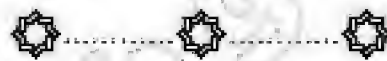
”اُف خدایا! پلیز ڈیڈ!“ اس وقت احراز شاہ کی حالت پاگلوں سے بدتر تھی۔ ایک طرف اس کا سارا مستقبل تھا تو دوسری طرف ڈیڈ اور چاچو کی خواہش۔ ”ایک انجان لڑکی..... دیہاتی سی..... میں ساری عمر ایسی لڑکی کے ساتھ کیسے گزار سکتا ہوں ڈیڈ!“

”احراز بچے! میں مجبور ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں تمہارے ساتھ زیادتی کر رہا ہوں، اللہ گواہ ہے کہ میں تمہیں ساتھ لایا تھا مگر میرا ایسا ارادہ نہیں تھا مگر اپنے بھائی کی خواہش کے لیے میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں، مجھے مایوس مت کرنا۔“

”ڈیڈ!“ اس کے پیروں تلے سے گویا کسی نے زمین کھینچ لی اور وہ خود کو گہری پستی میں ڈوبتا محسوس کرنے لگا۔ ”یہ کیا کر رہے ہیں آپ.....!“ ڈیڈ کے دونوں ہاتھ تھام کر اس نے لبوں سے لگائے۔ ”آپ کو اپنی پرورش پر اتنا بھی اعتبار نہیں ہے جو آپ مجھے یوں اپنی ہی

نظروں میں گرا رہے ہیں؟ پلیز ڈیڈ! میں لاکھ خود سر اور ضدی سی مگر اپنے ڈیڈ کا سر جھکنے نہیں دوں گا۔ آپ چاچو سے کہہ دیں۔ میں وہ ہی کروں گا جو آپ کی خوشی ہوگی۔“ اس لمحے اس کے سامنے صرف ڈیڈ تھے، صرف ڈیڈ اور ان کی محبت..... ڈیڈ نے اسے خود سے بھینچ لیا۔

اگلی صبح ہی اس کا اور مدیحہ کا نکاح ہو گیا۔ شاید چاچو اسی انتظار میں جی رہے تھے، شام میں ہی خالق حقیقی سے جا ملے اور حویلی میں کہرام مچ گیا۔ وہ چاچو کی وفات کے بعد دو دن رہا پھر ڈیڈ کو کچھ دن بعد آنے کا کہہ کر چلا گیا کیونکہ حویلی کے لوگوں کو ابھی ان کی ضرورت تھی۔



کشف اس کے کاندھے سے لگی رو رہی تھی اور جانے وہ کس الجھن میں تھا کہ اس کے کافی دیر رونے کے بعد اسے احساس ہوا کہ کشف کافی دیر سے رو رہی ہے اور وہ اسے تسلی تک نہ دے سکا۔

”کشف پلیز! خاموش ہو جاؤ، دیکھو زندگی موت تو اللہ کے ہاتھ ہے نا! ہم تو بے بس ہیں، اب رومت..... چاچو کے لیے دعا کرو۔“

”بھیا! ابھی تو ہم ملے تھے اپنوں سے..... پہلی بار میں نے اپنے چاچو کو دیکھا تھا اور دوبارہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔“ وہ پھر رو پڑی۔

”مجھے علم ہے کشف! تم نے تو پھر بھی ان کے ساتھ اچھے دن گزارے ہیں، ہنستے مسکراتے، تمہاری یادوں میں وہ دن رہیں گے مگر میں ان سے پہلی بار ملا بھی تو اسپتال میں۔ جب وہ شدید تکلیف میں تھے۔ میرے پاس تو ان کے حوالے سے کوئی مسکراتی یاد بھی نہیں ہے۔“

”بھیا! ہم کو اتنا بڑا دھچکا لگا ہے تو مدھو کی حالت کیا ہوگی؟ ماں بچپن میں ہی اسے چھوڑ گئی تھیں اور باپ کا سایہ بھی نہ رہا، وہ تو مر مر کر جی رہی ہوگی۔ کاش ان لمحوں میں میں اس کے پاس ہوتی۔ میرا دل پھٹ رہا ہے یہ سوچ سوچ کر کہ وہ کس حال میں ہوگی۔ بھیا! آپ

نے اسے تسلی دی تھی؟ وہ آپ کی کزن ہے، آپ نے.....“ اس لڑکی کے نام سے ہی اسے شدید الجھن ہونے لگی تھی۔

”اوہ کشف! میں نے ایسا کچھ نہیں کیا، تمہیں زیادہ شوق ہے نا اس سے ملنے کا تو ڈیڈ کے ساتھ آ رہی ہے وہ۔ کرتی رہنا اس سے ہمدردی!“

”بھیا.....!“ وہ سشدردہ گئی۔ شاید احزاز کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ جھنجھلاہٹ میں شاید وہ غلط زبان استعمال کر گیا ہے۔

”کشف پلیز! اس لڑکی کا ذکر میرے سامنے مت کرنا، میرا دماغ پھٹنے لگا ہے۔“ وہ غصے سے کہتا ہوا اٹھ گیا اور کشف کو حیران کر گیا لیکن یہ حیرت زیادہ دن نہ رہی۔ ایک ہفتہ کے بعد جب ڈیڈ آئے تو مدھو واقعی ان کے ساتھ تھی۔

”آ گیا تمہیں یاد..... اپنا گھر.....“ بجائے اس کے کہ مما کسی افسوس کا اظہار کرتیں، انہوں نے ڈیڈ کو دیکھتے ہی کاٹ دار لہجے میں کہا۔ ”اور یہ کون سا نیا تحفہ لائے ہو اب اپنے گاؤں سے.....؟“

”زبان سنجال کر بات کو سلٹی! یہ میری بھتیجی ہے۔“

”تو.....؟“ مما نے دوبارہ کہا پھر تنقیدی نظروں سے مدھو کو دیکھا۔ ”کتنے دن کے لیے لائے ہو یہ دیہاتی میم.....“

”یہ اب.....“ وہ ابھی بات مکمل کر رہی ہے تھے کہ کشف آ گئی اور مدیحہ کو دیکھتے ہی اس سے لپٹ گئی۔ مدھو کا دل پھر بھرا یا اور وہ رو پڑی۔ کشف خود بھی رو رہی تھی۔ ڈیڈ نے ان دونوں کو چپ کرایا۔ مما اب تک اسے یوں دیکھ رہی تھیں جیسے وہ انسان ہی نہ ہو۔

”کشف! مدیحہ کو اپنے ساتھ لے جاؤ تا کہ یہ فریش ہو جائے پھر اسے کھانا کھلاؤ۔“

”او کے ڈیڈ!“ کشف اسے اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے گئی۔

”کیا مصیبت پڑ گئی تھی تمہیں جو ایک اجڈ گنوار کو گھراٹھا لائے..... حویلی میں اس کے لیے جگہ تنگ پڑ گئی تھی کیا؟ باپ کے مرنے کے بعد؟“

”تم سے بات کرنا انتہائی فضول ہے سلٹی بیگم! بس ایک بات کان کھول کر سن لو کہ مدیحہ اب یہیں رہے گا ہمارے ساتھ.....“

”مگر کیوں شاہ نواز؟“

”اس لیے کہ اب وہ اس گھر کی بہو ہے، تمہارے بیٹے کی بیوی ہے۔“ یہ خبر کسی ایٹمی دھماکے سے کم نہ تھی۔ لمحہ بھر کو سلٹی بیگم کچھ بھی بولنے کی سکت کھو بیٹھیں۔ احزاز شاہ بھی تبھی سنگ روم میں داخل ہوا تھا اور اپنے ڈیڈ کی بات سن چکا تھا۔ مما کی پھٹی پھٹی نظریں اب اس پر رک گئی تھیں۔ جو اپنی جگہ جیسے چور بن گیا تھا۔

”احزاز! شاہ نواز نے کشف نے جو کیا سو کیا مگر تم سے مجھے یہ امید نہیں تھی۔“

”مجھے غلط مت سمجھیں مما! یہ نکاح میری خوشی یا خواہش نہیں، مجبوری بن گیا تھا۔“

ڈیڈ نے تاسف سے بیٹے کو دیکھا، وہ اتنا جانتے تھے کہ احزاز اس نکاح سے خوش نہیں ہے مگر اندازہ نہیں تھا کہ وہ اپنی ماں کے

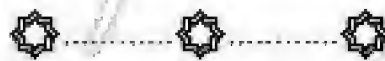
سامنے یوں خود کو بری الذمہ قرار دے گا۔

”یہ ڈیڈ اور چاچو کی خواہش تھی.....“ وہ مزید صفائی دے رہا تھا۔

”اس انسان نے پہلے میری اور اب میرے دونوں بچوں کی زندگی برباد کی ہے۔ میرے ہی باپ کی غلطی ہے یہ جو مجھے اب تک سہنا پڑ رہا ہے اور جانے کب تک اور سہنا پڑے گا۔ لیکن احزاز! میں تیری زندگی برباد نہیں ہونے دوں گی۔ اس لڑکی کو میں ہر گز اپنی بہو تسلیم نہیں کروں گی۔ میرا نام بھی سلسلی نہیں جو شاہ نواز تمہاری اس دیہاتی میم کو میں نے دھکے مار کر باہر نہ نکالا۔“ وہ بُری طرح چیخ رہی تھیں۔ احزاز انہیں خاموش کروا رہا تھا لیکن وہ ڈیڈ کو بھی دیکھ رہا تھا کہ وہ بھی زور سے بول پڑے تو ان کی طبیعت بگڑ جائے گی۔ مگر اس وقت اسے ڈیڈ کی آنکھوں میں صرف شکست نظر آئی تھی۔ انہیں احزاز سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ یوں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر کے اپنے باپ اور اس لڑکی کو بے مول کر دے گا۔ جس کی ساری زندگی اب اس سے وابستہ تھی۔

”مما پلیز! حوصلہ کریں۔“

”شکریہ بیٹا! تم نے کم از کم میرے مرحوم بھائی کے سامنے مجھے شرمندہ ہونے سے بچایا، تمہارا یہ احسان میں عمر بھر نہیں بھولوں گا۔ لیکن اب ساری عمر میں مدیحہ سے نظریں ملانے کے قابل بھی نہیں رہا کیونکہ میں تو اسے تمہارے نام کے حوالے سے اس گھر میں لایا تھا اور تم نے.....“ مزید کچھ کہے بنا وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔



”مدیحہ! یہ سچ ہے؟ اُف خدایا! میں بہت خوش ہوں۔“ یہ خبر سن کر وہ واحد انسان تھی گھر میں جو بہت خوش تھی۔ ”تم میری بھابی ہو؟ واہ.....!“ اس نے مدیحہ کو گھما ڈالا تھا۔ دو دن ہو گئے تھے مدیحہ کو یہاں آئے وہ اس بات کا اندازہ اچھی طرح لگا چکی تھی کہ آنٹی اور احزاز کے لیے اس کا وجود کتنا حقیر اور بے معنی تھا۔

”اگر وہ مجھے دل سے نہیں اپنا سکتا تھا تو منع کر دیتا..... پتا نہیں کیوں بابا نے..... یہ..... سب کیا.....“ اس نے گہری سانس خارج کی۔ کشف اس کی اس کشمکش سے واقف تھی۔

”فکرمات کرو مدھو! دھیرے دھیرے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بھیا! تمہارے لیے اور تم ان کے لیے قطعی انجان ہو مگر جب ایک دوسرے کے قریب رہو گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میرے بھیا بہت اچھے ہیں بس تھوڑا وقت لگے گا تمہیں.....“

”تم ٹھیک کہتی ہو کشف!“ اس نے پلکوں سے موتی صاف کیے۔

”پلیز مدھو! ماما کی باتیں دل پر مت لینا۔“

”کشف! میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ انہیں ہم سب سے کتنی نفرت ہے۔ پھر یہ تو ان کے لیے ایک شاک ہی ہے۔ میں اتنی نا سمجھ تو نہیں کہ سمجھ نہ سکوں۔ تم بے فکر رہو، جب میں نے یہیں رہنا ہے تو ہر روپہ اور ہر قسم کی بات سننے کا حوصلہ بھی پیدا کر لوں گی۔“ مدیحہ نے

سچائی سے کہا تو کشف کو شرمندگی نے گھیر لیا۔

”اچھا تم اٹھو..... اپنا حلیہ درست کرو پھر میرے ساتھ شاپنگ کے لیے چلو۔ مجھے تمہارے لیے تمہاری شادی کا گفٹ بھی لینا ہے۔“

”میرا دل نہیں چاہ رہا کشف!“

”ارے میں تم سے پوچھ کب رہی ہوں، میں تمہیں آرڈر کر رہی ہوں، اوکے.....؟ پانچ منٹ میں تیار ہو کر نیچے آ جاؤ۔“ کشف نے اسے زبردستی واش روم میں دھکا دیا۔ وہ مجبوراً تیار ہو کر جب باہر نکلی تو احزاب شاہ سے سامنا ہو گیا۔

”تم میرے روم میں..... کیا لینے آئی تھیں؟“

”وہ کشف نے مجھے زبردستی.....“ اس قدر سخت لہجہ اور لفظوں پر یکدم اس کا لہجہ اور آنکھیں بھر آئی تھیں۔ مگر شاہ نواز نے جو اسی وقت وہاں آئے تھے فوراً اس کا دفاع کیا۔

”تمہارا اور اس کا روم اب الگ تو نہیں ہے احزاب! وہ تمہاری بیوی ہے اور.....“

”مگر ڈیڈ.....“ اس نے درمیان میں ہی ڈیڈ کو ٹوکا۔ ”آپ جانتے ہیں کہ میں اپنی چیز انجان لوگوں سے شیئر نہیں کرتا۔“

”جس کے ساتھ زندگی شیئر کی ہے اس کے ساتھ ہر چیز شیئر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“

”پلیز ڈیڈ! یہ میرے بس سے باہر ہے۔“ اس نے ایک اچھتی نظر اس پر ڈالی اور ڈیڈ کو جواب دے کر کمرے میں چلا گیا۔

”آئی ایم سوری مدیحہ بیٹا! شاید میں ہی تمہارا قصور وار ہوں مگر بیٹا! مجھے یقین ہے دھیرے دھیرے سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

مدیحہ کی آنکھوں کی نمی ان سے چھپ نہیں سکی تھی۔

”نہیں بابا!“ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا پھر خود ہی لب کچل گئی۔

”مدھو!“ انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ دھرا۔ ”میں تمہارے لیے بابا ہی ہوں تمہارا..... مجھے خوشی ہوگی اگر تم مجھے بابا

کہوں گی۔“

”تھینک یو!“ وہ یک دم ان کے سینے سے لگ گئی اور بے اختیار رو پڑی۔



کچھ دن تو لگے مگر پھر وہ اس گھر کی روٹین کی عادی ہو گئی تھی۔ کشف کی پوری کوشش ہوتی کہ اسے بور نہ ہونے دے۔ بابا آفس کے بعد سارا وقت اس کے ساتھ ہی گزارتے تھے۔ آنٹی کی مصروفیات تمام گھر سے الگ تھیں۔ وہ رات کے دوسرے پہر گھر آتی تھیں اور دوپہر کو اٹھتیں، ناشتے کے بعد پارلر چلی جاتیں۔ فارغ ہوتیں تو ان کی فرینڈز گھر پر ہی آ جاتیں۔ ایسے میں وہ خود کو کمرے میں بند کر لیتی تھی۔ ویسے بھی اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ کم سے کم ان کے سامنے آئے۔ رہا احزاب تو وہ سامنے ہو تو اسے اس کے ہونے نہ ہونے سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ صبح ناشتے کے بعد وہ آفس جاتا، شام کو آتا چائے وغیرہ کے بعد باہر نکل جاتا پھر رات گئے لوٹا تھا۔ دھیرے دھیرے وہ



اس کی ساری روٹین سمجھ گئی تھی اور اب اس نے بوریٹ سے بچنے کا طریقہ بھی ڈھونڈ لیا تھا۔ وہ گھر کے مختلف کام اپنے ہاتھوں سے کرتی تھی۔ خاص کر احزاز کے سارے کام..... اس کے کپڑے پر لیں کرنا، پالش کرنا، اس کے کمرے کی صفائی، حتیٰ کہ اس کے لیے کھانا بھی وہ خود پکاتی تھی حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ سب کر کے بھی اسے کوئی صلہ نہیں ملے گا۔ احزاز کی نظر میں وہ آنٹی کی طرح تھی قابل نفرت..... احزاز اسے گھر میں ادھر ادھر نوکروں کی طرح کام کرتے دیکھ کر مزید چڑ جاتا تھا۔ لائف پارٹنر کے حوالے سے اس نے کیا سوچا تھا اور ڈیڈ نے یہ جاہل، گنوار اس کے لیے منتخب کی تھی۔ اسے تو پڑھی لکھی، قدم سے قدم ملا کر چلنے والی بیوی چاہیے تھی۔ با اعتماد اور اس کی تمام تر سوشل ایکٹیویٹیز میں حصہ لینے والی..... جس کو اگر اپنے فریڈز سے ملواتا تو شرمندگی نہ ہوتی اور اب وہ کس منہ سے بتائے گا سب کو کہ وہ شادی کر چکا ہے، وہ بھی ایک دیہاتی اجڈ گنوار سے۔ جسے نوکروں والے سارے کام آتے ہیں۔

”یہ ہے اس کی لائف پارٹنر.....!“ وہ شدید الجھن کا شکار ہو جاتا تھا مگر ڈیڈ کا کیا کرتا، صرف ان کی خاطر وہ اسے برداشت کرنے پر مجبور تھا اور اسی رات ڈیڈ نے اس سے کہا۔

”میں تمہاری شادی کا باقاعدہ اعلان کرنا چاہتا ہوں۔ تم خود دن سلیکٹ کر لو۔“

”ڈیڈ یہ ضروری ہے..... میرا مطلب ہے کہ اس سب کی کیا ضرورت ہے؟“ ڈیڈ نے حیرت سے اس کی شکل دیکھی۔

”احزاز تمہاری شادی کی پارٹی ضروری نہیں؟ تم اپنے دوستوں کو یہ بتانا نہیں چاہتے کیا؟“

”نو ڈیڈ! میرا مطلب ہے خود ہی سب کو پتا چل جائے گا۔“

”میں فیصلہ کر چکا ہوں احزاز تم اور تمہاری ماں سن لے، بہتر ہوگا کہ کوئی بھی بد مزگی نہ ہو۔“

”مما تو جرحہ کو اسلام آباد جا رہی ہیں۔“ اس نے اطلاع دی۔

”تو ٹھیک ہے، اتوار کو رکھ لیتے ہیں۔“

”جو آپ بہتر سمجھیں۔“ اسے ناچار ماننا پڑا۔

جب دل کی مرضی ہی نہیں تھی تو پھر..... مما کو پتا چلا تو انہوں نے مدھوکو بہو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

”تم تسلیم نہ کرو مگر حقیقت بدل نہیں سکتی، مدیحہ اب اس گھر کی بہو ہے۔“

”کم از کم میرے بیٹے کے قابل تو بہو لاتے شاہ نواز! لڑکی تو ہمارے گھر کے نوکروں سے بھی گئی گزری ہے۔“

”خاموش رہو سسلی بیگم!“ ڈیڈ نے انگلی اٹھا کر انہیں چپ کرایا۔

مما کی ناں ناں کے باوجود گھر میں پارٹی کی تیاریاں زور و شور سے ہو رہی تھیں۔ شاہ نواز نے اپنے تمام بزنس سے وابستہ

دوستوں کو مدعو کیا تھا اور احزاز کے حلقہ احباب کو بھی انہوں نے خود مدعو کیا تھا۔

اتوار کی شام ان کے گھر میں چہل پہل کا سماں تھا۔ مدیحہ کو کشف نے بہت خوبصورت دلہن کا روپ دیا تھا۔ ڈیڈ نے احزاز سے

پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ مہمانوں کے سامنے مس بی ہونے چاہیے۔ سو مجبوراً اسے اپنے ساتھ مدیحہ کو لیے ہر شخص سے تعارف کرانا تھا۔  
 ”واہ یار! بھابی تو بہت پیاری ہیں، تم تو بہت اسمارٹ لکے۔“

”بہت خوب!“

”حسین ترین!“

یہ الفاظ اس کے لیے حیران کن تھے، اس کے حلقہ احباب میں تمام لوگوں نے اس کی تعریف کی تھی۔ ماما کے لیے بہت مشکل ہو رہا تھا یہ سب کرنا۔ ان کی فرینڈ زان سے گلہ کر رہی تھیں۔

”سلمیٰ! ہم خفا ہیں تم سے، تم نے ہم سے چھپایا اپنی بہو سے ملوایا بھی نہیں؟“

”دراصل یہ سب بہت اچانک ہوا، کسی کو بتا بھی نہ سکے اور یہ پارٹی ہم نے اسی لیے تو دی ہے نا!“ انہوں نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

”ماشاء اللہ تمہاری بہو بہت پیاری ہے۔۔۔۔۔“ ان کی قریبی دوست نے دور کھڑے احزاز اور مدیحہ کو توصیفی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ”بہت خوب صورت جوڑا لگ رہا ہے۔“

”شکریہ!“ انہوں نے نظر گھمائی تو اس وقت وہ گنوار واقعی میک اپ کے باعث اچھی لگ رہی تھی۔ کشف بھی اسے بہت سراہ رہی تھی۔

”مدیحہ! آج تم بہت پیاری لگ رہی ہو۔“

”تھینک یو!“

”ہے نا بھیا! مدھو پیاری لگ رہی ہے نا!“ کشف نے احزاز کو شرارتی نظروں سے دیکھا۔ وہ لب بھینچ گیا۔  
 ”پتا نہیں!“ جہاں اس نے کشف کو حیران کیا تھا، وہیں اس کی ساری خوش فہمی بھی خاک میں ملا دی تھی۔ وہ جھنجلا کے دور کھڑے اپنے دوست کی طرف بڑھ گیا۔ پارٹی رات گئے تک جاری رہی مگر مدیحہ تھک گئی تھی۔ ایک تو اس نے اتنے بھاری کپڑے زندگی میں پہلی بار پہنے تھے، اتنی جیولری اور میک اپ سے اب اسے الجھن ہونے لگی تھی تب ہی جب اس نے دیکھا کہ سب ادھر ادھر مصروف ہیں تو وہ خاموشی سے اندر کی طرف بڑھی تھی مگر قسمت۔۔۔۔۔! راستے میں ہی احزاز مل گیا۔

”تم کہاں جا رہی ہو؟“

”وہ۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔“ وہ گڑ بڑا گئی۔ احزاز نے بے ارادہ نظر بھر کر اسے دیکھا تھا پل بھر کو وہ نظریں ہٹانا بھول گیا۔ سرخ اور گولڈن لباس اسکی سفید رنگت پر دمک رہا تھا۔ گہرا میک اپ اور جیولری پہنے وہ دلہن کے روپ میں کوئی اپسرا لگ رہی تھی۔

”میں تھک گئی ہوں، آرام کرنا چاہتی ہوں۔“

”یہ پارٹی ڈیڈ نے تمہارے اعزاز میں دی ہے میڈم! اور تمہیں نخرے سوجھ رہے ہیں۔“

”پلیز میں مزید اتنے بھاری ڈریس میں نہیں گھوم سکتی۔“ وہ التجا یہ انداز میں بولی شاید وہ خود بھی اندازہ کر سکتا تھا کہ کئی گھنٹے اتنا وزن اٹھائے گھومنا مشکل ہے۔

”او کے!“ سر جھٹک کر جیسے اس پر احسان کرتا وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا اور مدیحہ نے اندر جا کر سکھ کا سانس لیا۔ کپڑے تبدیل کیے، جیولری، میک اپ، صاف کر کے وہ سکون سے لیٹی تو پل بھر میں نیند آ گئی۔ جب تمام مہمانوں سے فارغ ہو کر وہ کمرے میں آیا تو اپنے بیڈ پر محترمہ کو سوتا پا کر جی جان سے جل گیا۔

”ڈیڈ بھی نا!“ اسے پتا تھا کہ یہ مدھو کی ہمت نہیں ہو سکتی تھی۔ صرف ڈیڈ کے کہنے پر وہ اس کے کمرے کی شکل دیکھتی تھی۔ وہ تیزی سے لپکا تو اسے اٹھانے تھا مگر بے سدھ سوتا دیکھ کر دل نہیں چاہا اور اس وقت تماشا کرنا بھی بے کار ہے۔ ڈیڈ سے کچھ کہوں گا تو ممالگ ہنگامہ کھڑا کر دیں گی۔ وہ تکیہ اٹھا کے صوفے پر آگرا۔



رات دیر سے سونے کے باوجود صبح انجانی سی آواز پر آنکھ کھل گئی تھی اس کی۔ مدیحہ جائے نماز بچھائے فجر کی نماز ادا کر رہی تھی اور اس کی چوڑیوں کی چھن چھن نے اسے ڈسٹرب کیا تھا نیند سے۔ وہ اٹھ کر بیڈ پر چادر تان کر لیٹ گیا، مگر پھر بھی اسے نیند نہیں آئی۔ نماز کے بعد اس نے قرآن پاک کی تلاوت کی، اس کے بعد کمرے میں بے ترتیب چیزیں درست کیں۔ احزاز کے کپڑے، جوتے، تولیہ..... ہر چیز تیار کر کے رکھی پھر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آنکھری ہوئی اور بال سلجھانے لگی۔ احزاز نے بنا دوپٹے کے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ اس کے بال بہت خوبصورت تھے، لمبے سیاہ بال جنہیں چوٹی کی شکل میں گوندھ کر اس نے پھر سے دوپٹا سر پر جمایا تھا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ سونا چاہتا تھا مگر نیند اڑ گئی تھی لہذا اٹھ کر واش روم میں گھس گیا۔ تیار ہو کر نیچے آیا تو وہ ڈیڈ اور کشف کے ساتھ بیٹھی ناشتا کر رہی تھی۔

”گلد مارنگ!“ کہتا وہ بھی ان کے ساتھ ناشتے کے لیے ڈائننگ ٹیبل پر آ گیا تھا۔

”ڈیڈ! آپ آفس نہیں جائیں گے؟“ ڈیڈ کو عام سے حلیے میں دیکھ کر اس نے پوچھا۔

”نو بیٹا! آج کچھ تھکن محسوس کر رہا ہوں، آرام کروں گا۔“

”ڈیڈ! پھر آپ آج مدھو کو لے کر اسپتال آجائے گا۔ میں اسے اپنے کولیکز سے ملواؤں گی اور وہیں سے ہم گھومنے جائیں گے۔ آج ڈنر باہر کریں گے۔ یہ بے چاری تو گھر میں بور ہو جاتی ہوگی۔“ کشف ڈیڈ سے مخاطب ہوئی۔

”نہیں بابا! میں گھر میں ٹھیک ہوں۔“ مدیحہ دھیمے لہجے میں بولی تھی۔ احزاز نے ایک نظر اسے دیکھا پھر سر جھٹک گیا۔

”کشف! تم کہاں اپنا ٹائم ضائع کرو گی۔ انہیں گھر کے کام کرنے کی عادت ہے اور بس.....“ وہ بھناتا ہوا اٹھا اور اپنا بیگ اٹھا کر باہر نکل گیا۔ مدھولب کچلنے لگی۔



”مدھو! تم ان کی بات کا بُرا مت مانا کرو۔“ کشف نے اس کی اُتری صورت دیکھی تو کہا۔

”کشف! تم جاؤ تمہیں دیر ہو رہی ہے، میں مدیحہ سے بات کروں گا۔“ ڈیڈ نے کہا وہ مدھو کا رخ سا تھپتھپاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

ناشتے کے بعد بابا اسے اپنے ساتھ اسٹڈی روم لے آئے۔ ”مدیحہ! یہاں بیٹھو.....“ اسے اپنے پاس بٹھایا، انہوں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر تھپکا۔ ”بچے! میں جانتا ہوں، تم دونوں کے درمیان آج جو رشتہ ہے، وہ صرف ہماری مرضی سے ہے۔ تم دونوں کی خوشی سے نہیں لیکن بیٹا! اب جو ہو گیا وہ ہو گیا۔ اب یہ تمہارے ہاتھ میں ہے کہ تم دونوں یہ فاصلہ کس طرح ختم کرتے ہو۔ یہ سچ ہے کہ گھر بسانے کے لیے عورت کو سب سے زیادہ قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ بچے! احزاز کے اور تمہارے مزاجوں میں بہت فرق ہے اور یہ فرق مٹانے کے لیے تمہیں خود کو بدلنا ہوگا۔“

”بابا! میں کوشش تو کرتی ہوں مگر مجھے لگتا ہے کہ میں ان کے معیار پر پوری نہیں اتر سکتی۔“

”نہیں میرے بچے! مایوس نہیں ہوتے۔ وہ بظاہر پتھر بنا رہتا ہے مگر اندر سے بہت نرم ہے۔ بیٹا دیکھو! وقت کے ساتھ ساتھ ہر چیز بدل جاتی ہے، مجھے امید ہے کہ اگر تم کوشش کرو تو احزاز بھی بدل جائے گا۔“ انہوں نے پیار سے سمجھایا۔ ”اسے یہ سادہ سی ہر وقت گھر کے کام کرنے والی بیوی نہیں چاہیے۔ تم جان گئی ہونا تو سب سے پہلے خود میں بدلاؤ، لاؤ۔ اپنا رہن سہن بدلو، ڈریسنگ بدلو۔ خود کو ہر وقت اس حلیے میں مت رکھا کرو۔ اپنی آنٹی کی طرح تیار رہا کرو۔ مصروفیت گھر کے کام میں نہیں ہوتی..... اپنے لیے کوئی تفریح ڈھونڈو، خود کو مصروف رکھو بس احزاز کا خیال رکھنا تمہاری ذمہ داری ہے، وہ مت بھولنا۔“

”پر بابا! میں یہاں کسی سے واقف نہیں ہوں، یہ شہر، یہاں کے لوگ میرے لیے نئے ہیں۔“

”مجھے پتا ہے، یہ ہی اعتماد تو میں چاہتا ہوں کہ تمہارے اندر پیدا ہو کہ تم نئے ماحول اور نئے لوگوں میں خود کو ایڈجسٹ کرو کہ لوگ تم پر رشک کریں۔ احزاز کو پانا مشکل ہے مگر ناممکن نہیں۔ اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم کیسے خود کو اس کی پسند کے مطابق ڈھال سکتی ہو اور جو تم چاہتی ہو کہ احزاز میں یہ کمی یا خامی ہے وہ دور ہو جائے تو وہ بھی تم کر سکتی ہو۔ اب تم میری باتیں دھیان سے سنو.....“ انہوں نے مدیحہ کو پیار سے سمجھایا۔ ساتھ ساتھ اسے وہ تمام باتیں بھی بتائیں جن سے ان کی زندگی بدل سکتی ہے۔



وہ رات گئے لوٹا تو تمام ملازم سونے جا چکے تھے اور بھوک سے اس کا بُرا حاق تھا۔ وہ خود کچن کی طرف بڑھا مگر تب ہی کچن کی لائٹ آن ہوئی۔ اس نے حیرت سے دیکھا، مدیحہ اس کے لیے کھانا نکال رہی تھی۔

”آپ ہاتھ دھولیں، میں کھانا گرم کر دیتی ہوں۔“ اس کی آواز پر اس نے وہیں سنک میں ہاتھ دھوئے اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

مدیحہ نے کھانا اس کے سامنے رکھ دیا، وہ خاموشی سے کھانے لگا۔

”کافی بنادوں؟“ وہ جان چکی تھی کہ اس وقت وہ کافی پیتا ہے۔



”تم رہنے دو، میں دودھ پی لوں گا۔“ یہ ہی وہ چاہتی تھی کہ رات کے وقت کافی چھڑو دے کیونکہ نیند خراب ہوتی ہے۔ وہ کھانا کھا کے کمرے میں چلا گیا اور برتن وغیرہ دھو کر جب وہ اوپر آئی تو اس کے لیے دودھ لانا نہیں بھولی تھی۔

”یہ دودھ.....“ وہ جو اس وقت فائل پھیلا دے جانے کیا کھوج رہا تھا، حیران رہ گیا۔ یعنی اسے یاد تھا۔ مدھونے تکیہ اٹھایا اور صوفے پر جا لیٹی۔ احراز نے ایک اچھتی نظر اس پر ڈالی پھر کام میں لگ گیا۔

صبح الارم کی تیز آواز پر اس کی آنکھ کھلی۔ مدیحہ خود الارم لگا کر واش روم میں چلی گئی تھی، غصے سے لال پیلے ہوتے ہوئے اس نے الارم بند کیا تب تک وہ باہر آ چکی تھی۔ جائے نماز بچھا کر نماز پڑھنے لگی شاید احراز کو اس کی یہ واحد خوبی بھائی تھی وہ عجیب سے احساس سے دوچار ہوا تھا۔ نیند بھک سے اڑ گئی تھی۔ وہ اٹھا، وضو کیا اور نماز کے لیے چلا گیا۔ یہ دیکھ کر مدیحہ کو بہت خوشی ہوئی تھی۔ یعنی بابا ٹھیک کہتے ہیں، کوشش کرنے سے ہر چیز بدل جاتی ہے۔ یہ اس کی پہلی کامیابی تھی اور وہ بہت خوش تھی۔ نماز کے بعد احراز کمرے میں آیا تو وہ غائب تھی البتہ کمرے کی صفائی حیران کن تھی۔ اس ایک ڈیڑھ ماہ میں اس کا کمرہ ہر وقت چمکتا تھا اور اسے ملازم کے پیچھے چیخنا بھی نہیں پڑتا تھا۔ ناشتے کے لیے آیا تو وہ ٹیبل پر ناشتا لگا رہی تھی۔ آج اس کے چہرے پر عجیب سی چمک تھی، مسکراہٹ بھی الگ تھی۔ ڈیڈ اور کشف شاید اب تک سوئے ہوئے تھے۔ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

”ڈیڈ اور کشف نہیں کریں گے ناشتا؟“

”کشف رات دیر سے آئی تھی۔ کسی آپریشن میں مصروف تھی اور بابا آفس جا چکے ہیں۔“ اس کے منہ سے ”بابا“ بہت بھاتا تھا اسے بنا جواب دیئے ناشتا کر کے وہ بھی چلا گیا اور مدیحہ جلدی جلدی کام ختم کرنے لگی کیونکہ آج اسے کشف کیساتھ پارلر جانا تھا۔ اس کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آ گئی۔

ہر دن احراز کو مدیحہ کا ایک نیا روپ دکھتا تھا۔ وہ اس پر توجہ دینا نہیں چاہتا تھا مگر جانے کیسے خود بخود وہ اس کی توجہ کا مرکز بن جاتی تھی۔ اس کے اندر آنے والا چیخ بہت انوکھا تھا۔ آج انہیں کسی بزنس پارٹی میں جانا تھا اور ڈیڈ کا حکم تھا کہ مدھو ساتھ جائے گی کیونکہ تمام لوگ ہی اپنی بیگمات کے ساتھ ہوں گے۔

”لیکن بابا.....!“ آج ڈیڈ کی جگہ بابا کہا تو خود ہی شپٹا گیا۔ شاہ نواز کے لیے بھی یہ حیران کن مگر خوشگوار تھا۔

”بہت خوبصورت لگتا ہے تمہارے منہ سے بابا کہنا..... ڈیڈ مت کہا کرو۔“

”وہ کہاں ہمارے ساتھ جائے گی، آپ جانتے ہیں ناکہ وہاں کس طرح کے لوگ آئیں گے اور.....؟“

”بابا میں تیار ہوں۔“ چمکتی آواز کے ہمراہ وہ آئی تھی اور پل بھر کو تو احراز نے اسے پہچانا تک نہیں۔

بلیوسا ڈھمی، خوبصورت ہیز کٹنگ، میک اپ اور میچنگ جیولری ہر لحاظ سے بہترین۔ وہ ایک لمحے کو سوچ میں پڑ گیا کہ یہ مدیحہ ہے۔

”احراز! تم تیار ہو جاؤ، میں تمہاری ماما کو دیکھتا ہوں۔ ان کی تیاری میں تو رات ہو جائے گی۔“ ڈیڈ اسے حکم دے کر چلے گئے اور

وہ اپنی حیرت چھپاتا کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی ہر چیز بیڈ پر رکھی اس کی منتظر تھی۔ پانچ منٹ لگے تھے اسے تیار ہونے میں..... جب وہ نیچے آیا تو ماما اور ڈیڈا اپنی گاڑی میں بیٹھ چکے تھے اور مدیحہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے بال بہت خوبصورت تھے اور اب اس نئی ہیئر کٹنگ نے ان کو مزید سنوار دیا تھا۔ کھلے بالوں میں وہ اچھی لگتی تھی۔ وہ دل کو روک رہا تھا مگر وہ خود ہی تعریف کرنے پر مجبور تھا۔

”چلو.....!“ بے نیازی کی اداکاری کرتا وہ گاڑی کی طرف بڑھ گیا اور مدیحہ بھی چپ چاپ اس کے ہمراہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔



دھیرے دھیرے اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کے تمام کام بہت اچھے طریقے سے ہونے لگے ہیں۔ شاید اس کے لیے مدیحہ اس کے تمام کام خود کرتی تھی اور اب جب وہ ان تمام چیزوں کا عادی ہونے لگا تو یک دم ہی پھر چیخ آ گیا۔ مدیحہ کے ہاتھ کا ناشتہ کرنے کی عادت پڑی تو اب اسے ملازم کے ہاتھ کا کھانا پسند نہ آتا اور آج جب ناشتہ ملا تو وہ چڑ گیا۔

”کیا مسئلہ ہے، آج نہ چائے میں ذائقہ ہے، نہ آلیٹ مزے کا ہے۔“

”بھیا جی! دراصل بھابی آج جلدی میں تھیں۔ ناشتا میں نے بنایا ہے۔“ یعنی آج مدیحہ کے ہاتھ کا بنا ناشتہ نہیں تھا مگر اسے کیا جلدی تھی۔ صبح کمرے میں بھی وہ اس کی افراتفری نوٹ کر رہا تھا۔

”پھر کھا بھی خود لینا۔“ وہ ناشتا چھوڑ کر اٹھ گیا۔ شاہ نواز احمد کے ہونٹوں پر آنے والی مسکراہٹ بہت جاندار تھی، یعنی ان کا بیٹا یہ تمام چیزیں نوٹ کر رہا تھا۔ اب وہ مدیحہ کے ہاتھ کے ذائقے کا عادی ہو چکا تھا اور اس کی کمی اب محسوس کرے گا، ضرور کرے گا۔

شام میں وہ آفس سے لیٹ آیا تھا چونکہ اب وہ بہت کم رات کو باہر جاتا تھا، کھانا اکثر اب ڈیڈے کے ساتھ کھاتا تھا پھر آفس کا کام جو ہوتا وہ دیکھ کر جلد سو جاتا تھا تا کہ فجر کی نماز مس نہ ہو۔ ہاں مدیحہ نے اسے یہ احساس دلایا تھا۔ بے شک زبان سے نہیں، اپنے عمل سے سہی، اس کی کوشش ہوتی تھی کہ ساری نمازیں باقاعدگی سے ادا کرے مگر چونکہ نئی نئی روٹین تھی تو عادی ہونے میں ٹائم تو لگنا تھا۔

رات کے کھانے پر صرف ڈیڈے تھے۔ اسے کشف اور مدیحہ کی کمی محسوس ہوئی مگر بولا نہیں۔ مگر کھانا شروع کرتے ہی چپ نہ رہ سکا۔

”آخر ہو کیا گیا ہے تمہیں مانی! تمہارا کام پر دھیان کیوں نہیں رہا۔“

”کیوں بھیا جی! کیا ہوا؟“

”کو فتنے تم نے بنائے ہیں نا! پچھلے ہفتے کتنے مزے دار بنے تھے مگر آج ان میں ذرا بھی مزا نہیں ہے۔“

”بھیا جی! پچھلے ہفتے کو فتنے بھابی جی نے بنائے تے آج انہیں کشف باجی کے ساتھ پارٹی پر جانا تھا نا! اس لیے کھانا مجھے بنانا پڑا۔“ مانی کی وضاحت سے اس کا دماغ گھوم گیا۔ نہ صبح ناشتہ کیا، نہ رات کا کھانا اچھا لگا۔

”ڈیڈ! آج کل آپ کی چیتتی کہاں مصروف رہتی ہیں؟“ شاہ نواز کے لیے یہ سوال خوشی کا باعث تھا یعنی مدیحہ کا وجود اس کے لیے بے معنی نہیں رہا۔ دھیرے دھیر وہ اس کی زندگی میں شامل ہو رہی تھی، چاہے وہ اس بات کا اظہار برملا نہ کرے مگر اس کے تئیں اس کا

ثبوت ہیں۔

”مائی سن! اس میں بھڑکنے کی کیا بات ہے؟ وہ بھی ہماری طرح جیتی جاگتی انسان ہے، بوریت سے تنگ آ گئی تھی سو اس نے جاب کر لی۔“

”جاب! گھریلو ملازمہ کی؟“ اس کے لہجے میں طنز اُٹا آیا۔

”وہ اسکول ٹیچر ہے احراز!“ شاہ نواز نے ٹوکا۔

یہ بات اس کے لیے جھٹکے سے کم نہ تھی کیونکہ ماما کے بقول گاؤں میں تعلیم کا تصور نہیں ہوتا اور لڑکیوں کی تعلیم کے تو وہ لوگ سخت خلاف ہوتے ہیں۔

”ٹیچر! کیا مطلب؟ وہ تعلیم یافتہ ہے؟“

”اس نے گریجویشن کر رکھا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں ہم شہر میں رہنے والوں کی طرح شو آف کرنے کی عادت نہیں ہے۔ سارا دن وہ گھر میں اکیلی رہتی تھی، میں نے اسے مشورہ دیا اور اسے ٹیچر کی جاب دلوائی۔“

”یہ ہی جاب سوٹ کر سکتی تھی آپ کی دیہاتی بہو پر..... چلو دو چار ہزار روپے تو مل ہی جائیں گے۔“ جانے ماما کب آ گئیں۔ ایک تو جس دن ماما گھر پر ہوتی تھیں جھگڑا تو لازمی ہوتا تھا۔

”تم سے تو لاکھ درجہ بہتر ہی ہے ناسلمی! لوگوں کو تعلیم کا شعور دیتی ہے۔ خود کو باشعور کہنے والے جاہل لوگوں سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ وہ جنہیں استاد جیسے عظیم پیشے کا احساس تک نہیں ہے“ ڈیڈ نے کاٹ دار لہجہ اختیار کیا۔

”ماما پلیز! آپ ہر دم کیوں اپنا بلڈ پریشر ہائی رکھتی ہیں؟ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ آپ نے کبھی ڈیڈ سے آرام سے یا پیار سے بات کی ہو۔ ایک عورت کی ذمہ داری میں اس کا شوہر سب سے پہلے آتا ہے مگر آج تک میں نے کبھی آپ کو ڈیڈ سے جیسے لہجے میں بات تک کرتے نہیں دیکھا، ان کی ضرورت کا خیال رکھنا تو دور کی بات ہے۔“ جانے یہ مدیحہ کی ذمہ دار طبیعت کا نتیجہ تھا یا کچھ اور..... اب اسے ماما کی یہ ٹوٹلی سوشل لائف کھٹکنے لگی تھی۔ انہیں بابا کا خیال رکھنا چاہیے الٹا ہر وقت وہ لڑتی رہتی ہیں ان سے.....

”احراز ڈیئر! بے جوڑ شادی میں یوں ہی ہوتا ہے۔ تمہارے ڈیڈ میرے قابل کبھی تھے ہی نہیں پھر بھی میں نے ساری عمر گنوا دی ان کے لیے..... اب یہ ہی تمہارے ساتھ ہوگا۔ بہتر ہوگا کہ ابھی فیصلہ لے لو ورنہ میری طرح ساری عمر فرسٹریشن کا شکار رہو گے۔“ ماما کی اس بات نے اسے دلی دکھ دیا تھا۔ ”بابا جیسے باظرف انسان کو ماما کس طرح سے بے عزت کر رہی تھیں۔ یہ واقعی ڈیڈ کا بڑا پین تھا کہ انہوں نے ساری عمر ماما کی ہر بات نظر انداز کی تھی۔

”ماما! کبھی اپنی ذات کے خول سے باہر نکلیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ہمارے ڈیڈ کتنے اچھے ہیں۔“ جانے کیوں آج وہ ڈیڈی بے عزتی برداشت نہ کر سکا۔ ماما حیران تھیں کہ اسے کیا ہوا اور ڈیڈ کی آنکھوں کے گوشے غم ہو گئے۔ آج انہیں علم ہوا کہ تربیت کا اثر ضرور ہوتا



ہے انسان پر..... وہ اپنے کمرے میں آ گیا مگر نیند آنکھوں سے دور تھی۔ بارہ بجے تھے اور مدیحہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ بجے ہلکی سی آہٹ سے دروازہ کھلا تھا اور محترمہ تشریف لائی تھیں اور کچھ دیر بعد فریش ہو کر وہ لیٹ گئی۔ ادھر بھوک سے اسے نیند نہیں آرہی تھی۔

”اُف خدایا! تھوڑا بہت کھانا کھا لیا ہوتا تو اب یوں نہ تڑپ رہا ہوتا۔ محترمہ نے آج دودھ تک نہیں پوچھا، بمشکل دو بجے کے بعد سویا تھا اور اذان کی پہلی آواز پر اس کی آنکھ کھل گئی مگر آج مدیحہ اب تک نہیں جاگی تھی۔ اس کی نماز قضا ہو جانے کے خیال سے وہ اسے جگانے آیا مگر اک ہچکچاہٹ تھی جو اسے ایسا کرنے نہیں دے رہی تھی۔ کتنے لمحے وہ تذبذب کا شکار رہا پھر ہلکے سے کاندھے پکڑ کر اسے بلایا۔ وہ یکدم اٹھ بیٹھی پھر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”نماز نکل جائے گی تمہاری.....“ نظریں چرائے وہ کہہ کر خود چلا گیا۔ مدیحہ کے لبوں پر خوبصورت مسکراہٹ ریگ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ ان لمحوں میں کھوجاتی، نماز کا سوچ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔



روز بے مزناشتہ کرنے سے بہتر تھا کہ وہ آفس بھوکے پیٹ ہی چلا جائے، وہیں کچھ کھالے۔ یہ ہی سوچ کر وہ آیا تھا نیچے جہاں ماما کے علاوہ سب ناشتے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔

”مافی پلیمز جلدی کرلو۔ آج ویسے ہی میں لیٹ ہو گئی ہوں۔“ مدیحہ کی بات پر اس کا دماغ گھوم گیا اور وہ جو کچھ خوش فہمی کا شکار ہو کر ناشتا کرنے آیا تھا، شدید غصے میں آ گیا۔

”کیا سمجھتی ہو تم! یہ چھوٹی موٹی جاب کر کے تم ہمیں متاثر کر سکتی ہو؟ ہر وقت تمہیں جلدی پڑی رہتی ہے۔ رات کو تمہاری پارٹیاں ختم نہیں ہوتیں۔ ضرورت کیا ہے تمہیں یہ سب کرنے کی؟ تم گھر میں نہیں رہ سکتیں سکون سے؟“ مسلسل پندرہ دن کی روٹین نے اس کا دماغ گھما دیا۔ کشف اور ڈیڈ نے مسکراہٹ چھپانے کے لیے اخبار چہرے کے سامنے پھیلا لیے اور مدیحہ دل باغ باغ ہونے کے باوجود معصوم سی صورت بنائے بیٹھی تھی۔

”بھابی جی ناشتا!“ مافی کی آواز پر سب متوجہ ہو گئے۔

”بس مافی! مجھے بھوک نہیں ہے، میں چلتی ہوں۔“ اس نے بیگ کاندھے پر ڈالا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”اللہ حافظ بابا!“ وہ باہر نکل گئی۔ ایک طرف احزاز کو غصہ تھا کہ اس پر تقریر کا اثر نہ ہوا، دوسری طرف بناناشتے کے جانے پر ملال سا بھی تھا۔ وہ بھی کچھ کھائے بنا آفس چلا گیا۔

رات کو کھانے کی ٹیبل پر وہ نہیں تھی مگر کھانے کا ذائقہ بتا رہا تھا کہ کس نے بنایا ہے۔ کتنے دن بعد اس نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا تھا، پھر عشاء کی نماز کے بعد جب وہ کمرے میں گیا تو اسے لینا پا کر چونک گیا۔ اس کے خیال میں تو وہ کشف کے ساتھ ہوگی مگر وہ تو.....! وہ خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گیا مگر بے چینی حد سے سواتھی کہ کبھی بھی وہ اس طرح نہیں لیتی۔

”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا!“ لاکھ خود کو روکا مگر زبان پھر بھی دغا کر گئی۔ مدیحہ اس کی آواز پر اٹھ گئی۔ اس کا اتر اچہرہ صاف بتا



رہا تھا کہ وہ ٹھیک نہیں ہے۔

”سر میں درد ہے!“ اس نے دھیرے سے کہا پھر بیڈ سے اٹھ گئی۔ ”آپ آجائیں، میں صوفے پر سو جاؤں گی۔“ احزاب نے ایک نظر اس پر ڈالی۔

”تم لیٹ جاؤ، مجھے آفس کا کچھ کام کرنا ہے۔“ وہ کہہ کر اپنی فائلز پھیلا کے بیٹھ گیا۔  
”دودھ لا دوں آپ کو.....؟“

”تم سو جاؤ، میں لے لوں گا۔“ اس نے دھینے لہجے میں کہا۔ مدھو کچھ لمحے کھڑی رہی پھر بیڈ کے کونے پر جا کر لیٹ گئی۔ احزاب دو گھنٹے مصروف رہا لیکن اب نیند سے بُرا حال تھا۔ وہ تکیہ اٹھانے بیڈ تک آیا تھا کہ یک دم اس کی نگاہیں مدیحہ کے معصوم چہرے پر ٹھہر گئیں۔ وہ پُرسکون نیند میں تھی۔ سوتے ہوئے اس کے چہرے کی پاکیزگی اسے نظریں ہٹانا بھلا گئی۔ صاف شفاف روشن چہرہ اور چہرے پر بکھری آوارہ بالوں کی لٹیں.....! کیا کوئی سوتے میں بھی اتنا حسین لگتا ہے..... اسے احساس نہ ہوا کہ وہ کب تک اسے دیکھتا رہا پھر اسی طرح بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے وہ سو گیا۔



حماد احسن کا فون آیا تھا۔ اماں جی اور اباجی نے شاہ نواز کو بلا یا تھا۔ تقریباً چار ماہ بیت گئے تھے، مدیحہ ملنے تک نہیں گئی تھی پھر حماد اور کشف کی شادی بھی طے کرنی تھی۔ وہ ایک بار سلمیٰ سے آرم سے بات کرنا چاہتے تھے شاید وہ مان جائیں اور بیٹی کی خوشیوں میں شریک ہو جائیں۔ آج چونکہ اتوار تھا، سب ہی گھر پر تھے، مدیحہ بھی صبح سے کچن میں مصروف تھی کہ احزاب کی بھی چھٹی تھی اور نہیں چاہتی تھی کہ کھانے پر پھر وہ بے چارے مانی کو ڈانٹے کیونکہ وہ یہ بات اسے کبھی نہیں کہہ سکتا کہ کھانا تم خود بنایا کرو، بس سارا غصہ اس مانی غریب پر نکل جاتا تھا۔ دوپہر کا کھانا اتوار کو کچھ اسپیشل ہوتا تھا کیونکہ اس دن ماما بھی گھر پر ہوتی تھیں۔ مدیحہ نے اب ان سے گھبرانا چھوڑ دیا تھا اور ان کی باتوں کی عادی ہو گئی تھی، بابا کی محبت اور کشف کے ساتھ نے اسے بہت اعتماد دیا تھا۔ کھانا سب کو پسند آیا تھا کیونکہ اس نے تقریباً گھر کے ہر فرد کی پسند کا خیال رکھا تھا۔ شکر تھا کہ ممانے بھی کوئی بد مزگی نہیں کی۔ کھانے کے بعد سب سنگ روم میں بیٹھے تھے، کشف اور وہ اپنی باتوں میں لگ گئیں، احزاب ٹی وی آن کر کے بیٹھ گیا اور شاہ نواز کو آج اپنی بیگم کا موڈ کچھ بہتر لگا تھا سو بات چھیڑ دی۔

”سلمیٰ! اباجی کا فون آیا تھا، حماد اور کشف کی شادی کا پوچھ رہے تھے، تم بتاؤ کہ کب کا ٹائم دوں؟“ اب تقریباً سبھی ان کی طرف متوجہ تھے۔

”مجھے نہیں پتا شاہ نواز! مجھے اس معاملے میں مت گھیسو۔“

”کشف تمہاری بھی بیٹی ہے سلمیٰ!“ بابا کا لہجہ اب بھی نرم تھا۔

”اگر یہ سمجھتے ہو تو پھر یہ شادی میں کبھی نہیں ہونے دوں گی۔“

”سلمیٰ! ہمارے بچوں کی خوشی وابستہ ہے اس کام میں۔ کشف ساری عمر اپنے گھر میں خوش رہے گی تو ہم بھی پرسکون رہیں گے۔“  
 ”جہاں تم کشف کو بھیجنا چاہتے ہونا شاہ نواز! ہاں وہ کچھ سالوں بعد ہی دم گھٹ کر مر جائے گی۔“  
 ”مما! وہاں بھی ہم جیسے انسان رہتے ہیں۔“ احزاز نے کہا۔

”میرے نزدیک وہ انسان ہی نہیں ہیں۔ میں نے بھی زندگی کے کچھ دن گزارے ہیں۔ وہاں اس گندے ماحول میں.....“  
 ”مما! وقت بہت بدل گیا ہے، وہاں کا ماحول بھی اب چینیج ہو گیا ہے، لوگوں کو شعور آ گیا ہے۔ اب زیادہ فرق نہیں رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو اب اچھا لگے گا۔“  
 ”اگر اتنا چینیج آ گیا ہے تو تم اب تک اس لڑکی کو کیوں اپنی زندگی میں شامل نہیں کر پائے ہو؟“ ان کی تلخ بات پر اس کی نظر فوراً مدیحہ پر گئی تھی جو اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”مما! میرے اور مدیحہ کے بیچ صرف ذہنی ہم آہنگی کی کمی ہے ورنہ مدیحہ کی یہاں موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ.....“ وہ جانے کیوں بات مکمل نہ کر پایا۔ مدیحہ کی منتظر نظریں مایوس لوٹ گئیں۔  
 ”میں تمہیں بتاتی ہوں احزاز! تم لوگوں کی حقیقت ہے کیا..... بے شک میں نے تمہیں جہنم دیا ہے مگر تم دونوں بہن بھائی اپنے باپ پر گئے ہو۔ اس لیے کبھی اس گھٹیا ماحول اور چھوٹی سوچ سے باہر نکل ہی نہیں سکتے۔ شہر میں رہے ہو تو اس ماحول کے اثر سے پہنچنے اوڑھنے کا شعور اٹھنے بیٹھنے کی تمیز آ گئی ہے لیکن دراصل تم لوگ بھی اپنے خاندان جیسے ہو اور بس.....!“  
 ”بس سلمیٰ! بہت ہو گئی تمام عمر میں نے تمہاری ہر بات برداشت کی، تم نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا، میں سبہ گیا مگر تم جیسی خود غرض عورت پھر بھی میری نہ بن سکی۔ یہاں تک کہ تم تو اچھی ماں بھی نہ بن سکیں۔ تم ہمیشہ سے اکیلی ہو اور تمہیں اکیلے رہنے کا شوق ہے نا تو ٹھیک ہے آج میں تم سے ہر بندھن توڑ کر جا رہا ہوں، اپنے بچوں کو لے کر.....“ بابا کا لہجہ اتنا سخت تھا کہ کوئی بھی کچھ نہ بول سکا مگر احزاز نے ہمت کی۔

”بابا! ممما کو تو عادت ہے نا! آپ پلیز کیوں پریشان ہوتے ہیں۔ پلیز غصہ مت کریں۔“

”ہر بار میں نے اس کی غلطی یہ سوچ کر معاف کر دی کہ اسے عادت ہے مگر اب میں تھک گیا ہوں۔ کشف! مدیحہ! بیٹا تیار کرو۔“  
 ”شاہ نواز! یہ دھمکیاں اور ڈرامے کہیں اور کرنا، مجھ پر ان کا اثر نہیں ہونے والا۔ یہ مت سمجھنا کہ میں تمہارے سامنے گڑ گڑاؤں گی بلکہ باقی زندگی سکون سے گزاروں گی، مجھے پروا نہیں کہ تم جاتے ہو یا یہیں رہتے ہو۔“

”مما پلیز خاموش ہو جائیں۔“ احزاز چیخ پڑا۔ ”آخر آپ کیوں سارا گھر برباد کرنا چاہتی ہیں اپنی ضد سے.....؟“

”احزاز! تم اس معاملے میں مت بولو، یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔“

”اور ممما ہم آپ کے ذاتی معاملات کا حصہ نہیں ہیں.....؟ ہم آپ کے..... آپ نے کبھی زندگی میں ہمارے بارے میں سوچا ہے؟“

”تمہارا باپ کافی ہے نا! تمہارے لیے سوچنے کے لیے پھر تم دونوں نے ثابت بھی تو یہ ہی کیا ہے کہ تم صرف اس کی اولاد ہو۔“ وہ بے دردی سے کہہ کر چلی گئیں۔ احزاز کو اپنے دماغ کی رگیں پھٹتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔ وہ اپنے کمرے میں بند ہو گیا۔ ڈیڈ اسٹڈی روم میں چلے گئے۔ وہ اور کشف اکیلی رہ گئیں۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا بات کریں۔

”پتا نہیں ماما ایسی کیوں ہیں؟ کیوں ماما خود کو بدل نہیں سکیں۔ عورت کا نام تو مدھو قربانی دینا ہے پھر ہماری ماں میں عورت کے احساسات کیوں نہیں ہیں؟ وہ تمام عمر صرف خود کے لیے جیتی رہیں، شادی سے پہلے خود سربٹی..... پھر خود سربٹی اور جب ماں بنیں تب بھی ان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ میں نے سنا ہے مدھو! عورت جب ماں بن جاتی ہے تو اس کی دنیا ہی بدل جاتی ہے اور وہ ایک نئے احساس میں ڈوب جاتی ہے۔ مگر میں نے کبھی اپنی ماں میں وہ احساس نہیں پایا مدھو! ہم اتنے بڑے ہو گئے ہیں مگر میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ ماما ہمیں کبھی اپنی گود میں لیا ہو، کبھی پیار سے اپنے ساتھ لگایا ہو یا سلایا ہو۔ ہمارے یہ کام ہمارے ڈیڈ نے کیے۔ انہوں نے ماما کو سمجھایا مگر جب ان کی طرف سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے اپنی ساری محبت کا رخ ہماری طرف کر دیا۔ انہوں نے باپ کی شفقت کے ساتھ ساتھ ہمیں ماں کی کمی بھی محسوس نہیں ہونے دی۔ ہر وہ کام جو ماں کی ذمہ داری ہوا کرتا ہے، وہ خود انہوں نے ہمارے لیے کیا۔ پھر بھی ماما کے دل میں ڈیڈ کے لیے ذرا بھی جگہ نہیں ہے۔ مدھو! تم اپنی مثال لو۔ تم نے بھیا کی خاطر خود کو کتنا بدل لیا، جیسا وہ چاہتے تھے، وہ ہی بن گئیں مگر دیرے دھیرے بھیا کو اپنا احساس بھی دلایا۔ آج بے شک وہ لفظوں میں یہ بات تسلیم نہیں کر رہے مگر ان کو تمہاری عادت پڑ گئی ہے۔ تم کھانا نہ پکاؤ تو وہ تمہارے ہاتھ کا ذائقہ محسوس کرتے ہیں۔ تم گھر پر نہ ہو تو تمہاری کمی انہیں محسوس ہوتی ہے۔ کیا کبھی زندگی کے کسی موڑ پر ڈیڈ کو یہ محسوس نہیں ہوئی ہوگی؟ مگر ماما نے کبھی ان کے احساسات و جذبات کی قدر نہیں کی۔“ کشف رو پڑی تھی۔ مدیحہ نے اسے گلے لگا لیا۔

”پلیز کشف! کیوں خود کو ہلکان کر رہی ہو۔“

”مدھو! ہمارا بھی دل چاہتا تھا کہ ہمارے ماما ڈیڈ پر سکون زندگی گزاریں، پیار محبت سے رہیں۔ ماما نے تو کبھی اس چیز کا بھی احساس نہیں کیا کہ ان کے ان رویوں کا ہم پر کیا اثر پڑے گا۔ ڈیڈ صرف ہمارے لیے ہر بات سہہ لیتے، کوشش کرتے کہ جھگڑا نہ ہو اور ہمارے ذہنوں پر اثر نہ پڑے، مگر میں نے ماما کو یہ قربانی دیتے کبھی نہیں دیکھا۔“

”کشف! دعا کیا کرو، اللہ کے حضور! ہم دعا کر سکتے ہیں نا! وہ دل سے مانگی دعا کبھی رد نہیں کرتا۔“ اس نے کشف کے آنسو صاف کیے۔ ”اللہ جو بہتر سمجھتا ہے وہ ہی کرتا ہے اور اس پر بھروسہ رکھو، ان شاء اللہ بہتر ہوگا۔“

”ہاں شاید یہ اللہ سے دوری کا ہی نتیجہ ہے۔ ہم نے خود کو دنیا میں اس قدر مصروف کر لیا کہ اس سے دور ہو گئے جو ہمارا رب ہے۔“ کشف نے چہرہ صاف کیا اور دل سے ارادہ کیا کہ آج وہ اللہ سے معافی مانگے گی اور اپنے ماں باپ کے حق میں دعا کرے گی۔





عشاء کی نماز کے بعد وہ رب کے حضور بابا اور آنٹی کے لیے گڑگڑا کر دعا مانگ رہی تھی۔ وہ جب کمرے میں داخل ہوا تو مدیجہ کو احساس بھی نہ ہوا۔ وہ بہت غور سے اس کا بھیگا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اس لڑکی نے کتنا بدل دیا تھا اسے..... آج وہ اپنے دل میں اس چیز کا اعتراف کر رہا تھا کہ مدیجہ نے نہ صرف خود کو بدل لیا بلکہ اسے بھی بدل ڈالا تھا۔ ان چند ماہ میں احساس ہوا تھا اسے کہ زندگی کیا چیز ہے اور ایک عورت کا وجود زندگی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ممانے تو کبھی وہ احساس نہ دیا جو اس لڑکی نے صرف چند ماہ میں اس گھر کے مکینوں کو دیا تھا۔ وہ اس دنیاوی زندگی میں سر تا پیر ڈوبا ہوا تھا کہ اس رب کا نام تک لینا اسے یاد نہ رہتا تھا۔ صرف کام..... کام اور دنیا بھر کے کام.....

زندگی کا اصل مقصد کیا ہوتا ہے، اسے کچھ پتا نہ تھا۔ ہاں ان میں جو مروت و لحاظ تھا وہ بھی صرف اپنے ڈیڈ کے باعث و گر نہ ان کی ماں نے تو ان کی تربیت پر کوئی توجہ نہ دی تھی اور وہ بھی جیسے جیسے بڑا ہوتا گیا اسی زندگی میں ڈھلتا گیا۔ آسائش سے بھرپور زندگی.....! اسے بھی شروع سے گاؤں اور وہاں کے رہنے والے پسند نہیں تھے لیکن اس نے ماما کی طرح کبھی اظہار نہیں کیا مگر جب پہلی بار وہ ڈیڈ کے ساتھ گاؤں گیا تو اس کے ذہن پر پڑے پردے ہٹ گئے..... پھر اس کی مرضی کے خلاف سہی، مجبوری کے بندھن میں بندھ کر وہ اس کی زندگی میں آئی۔ اس نے نفرت بھی بہت کی اس سے، دھتکارا بھی مگر اس لڑکی نے کبھی گلہ نہیں کیا اور اپنی عملی زندگی سے اس نے احزاز کی زندگی میں تبدیلی پیدا کی وہ دھیرے دھیرے اس کی تمام عادتوں کو نوٹ کرتا اور اچھی عادتوں پر خود بھی عمل کرنے کی کوشش کرتا۔ صرف اس کی ذات ہی نہیں، اس گھر کے درود یوار یہاں کے مکینوں تک پر اثر پڑا تھا اس ذات سے۔ وہ ہر کام پر توجہ دیتی نظر آتی۔ ہر فرد کی ضرورت کا دھیان رکھتی۔ یہ بھی تو عورت تھی.....! میں نے کبھی اس سے کچھ نہیں کہا مگر اس نے میرے کہے بنا میرے سارے کام کیے، میرے دل کی ہر بات سنی اور میرا جو آئیڈیل تھا، اس نے خود کو اس روپ میں ڈھال لیا مگر اپنی نسوانیت کا وقار برقرار رکھ کے، اپنی روایات اور اسلامی اقدار کا پاس رکھتے ہوئے۔ مدیجہ اس کے ساتھ ہر پارٹی میں جاتی تھی جہاں وہ لے جاتا تھا اور اس کا لباس بھی ویسا ہوا تھا جو افراد کی پسند تھی مگر اخلاق، وقار اور عورت کا مان کبھی اس نے اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اس کے تمام دوستوں کو اس کی بیوی آئیڈیل بیوی لگتی تھی۔ ہر لحاظ سے مکمل..... شاید وہ ہی نا سمجھ تھا..... مگر آج اپنی ماما کا اتنا سخت روپ دیکھ کر اسے یہ احساس شدت سے ہوا تھا کہ ان کی زندگی میں عورت کی جو کمی ہمیشہ سے رہی ہے، مدیجہ کے آنے سے دور ہوئی ہے۔ ان کے گھر کو عورت کی جو توجہ درکار تھی، وہ توجہ مدیجہ کے روپ میں مل گئی ہے۔ وہ اسے کیا سمجھتا رہا، اجڈ، گنوار، جال، ان پڑھ اور نالائق..... مگر اس نے کبھی ان باتوں پر گلہ شکوہ نہیں کیا اور اپنی ذمہ داریاں نبھاتی رہی۔ کاش ماما کے اندر بھی ایسی ہی عورت ہوتی۔ انہیں بھی اپنے گھر، شوہر اور بچوں کی فکر ہوتی۔ وہ ہماری چھوٹی چھوٹی خواہشات اور ضروریات اپنے ہاتھوں سے پوری کرتیں تو ان کا گھر آئیڈیل گھر ہوتا۔ جانے کب تک وہ اپنی سوچوں میں الجھتا رہتا کہ مدیجہ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

”آپ کے لیے کافی بنا دوں؟“ روز اس وقت خود اسے دودھ پینے کی عادت ڈال کر اب وہ کافی کا پوچھ رہی تھی۔ احزاز نے الجھی نظروں سے دیکھا۔ ”میں سمجھ سکتی ہوں کہ آج آپ بہت ٹینس ہیں اور جب آپ پریشان ہوتے ہیں تو کافی ہی پیتے ہیں۔“

”بنا دو!“ تشکر بھری نظروں سے دیکھا۔ مدیجہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ پل بھر کو نظریں ملی تھیں پھر وہ رخ موڑ گئی۔ آج اس نے



اپنے اور کشف کے لیے بھی کافی بنائی تھی احراز کا کپ اسے دے کر وہ دو کپ لے کر باہر آ گئی اور کشف کے روم میں داخل ہوئی۔  
 ”ڈیر کشف! یہ لو، کافی حاضر ہے۔“

”مگر میں تو نہیں پیوں گی، میرا موڈ نہیں ہے۔“

”کیا.....! تمہاری خاطر میں اپنے شوہر کو کافی وہیں دے کر تمہارے پاس آئی اور تم منع کر رہی ہو؟“

”تو مائی ڈیر بھابی! تمہیں کس نے کہا تھا؟ تم اپنے شوہر نامدار کے ساتھ بیٹھ کر کافی پی لیتیں۔“

”اچھا..... اچھا..... نخرے مت کرو اور تم اچھی طرح جانتی تو ہو کہ میرے شوہر مجھے اپنے روم میں دیکھ کر زیادہ خوش نہیں ہوتے

پھر بھلا میں ان کو کیوں تنگ کروں؟“ وہ مسکراتے ہوئے کپ اسے تھما کر بولی۔

”مدھو! تم خوش ہو؟ بھیا تمہارے ساتھ کتنی زیادتی کر جاتے ہیں مگر میں نے آج تک کبھی تمہارے چہرے پر اداسی نہیں دیکھی۔

تمہیں بھیا کی باتیں دکھ نہیں دیتیں؟“

”کشف! میرا احراز کے علاوہ اب دنیا میں کوئی رشتہ باقی ہے ہی نہیں.....“ احراز اندر آتے آتے رک گیا اور کان اس کی آواز

پر لگا دیے۔ ”بابا کے بعد جب میں اس گھر میں آئی تھی تو مجھے اتنا پتا تھا کہ بے شک تم سب میرے اپنے ہو مگر احراز اور میرا تعلق وہ ہے جو

شاید دنیا کا مضبوط ترین تعلق ہے۔ ایک عورت کے شادی کے بعد تمام رشتے کمزور پڑ جاتے ہیں۔ ماں باپ، بہن بھائی اور دوسرے تمام

رشتے صرف شوہر کا رشتہ استوار کرنے کے لیے عورت تن من صرف اس رشتے کو مضبوط بنانے میں لگا دیتی ہے پھر کہیں جا کر اسے خوشیاں

اور من چاہی بیوی کا اعزاز ملتا ہے لیکن مجھے پتا ہے کہ میں کچھ کر لوں، اپنے اور احراز کے رشتے کو مضبوط نہیں کر سکتی۔“

”مدھو.....!“

”ہاں کشف! ان مہینوں میں میں نے پوری کوشش کی کہ احراز کی نظروں میں اپنی کوئی حیثیت بنا سکوں، میں اس کے مزاج کے

ہر موسم کو جان گئی، وہ کب کیا چاہتا ہے، کیا کہنا چاہتا ہے، اسے کس چیز کی ضرورت ہے، کیا پسند ہے اور کیا ناپسند ہے، میں نے خود کو مکمل اس

کی پسند میں ڈھال لیا لیکن.....“ اس نے گہری سانس خارج کی۔ احراز دم بخود رہ گیا۔

”مدیحہ! تمہاری خواہش تھی نا کہ انجان بندے سے تمہاری شادی ہو جسے دھیرے دھیرے تم سمجھو.....“

”ہاں! کیونکہ میں شادی کے بعد کی محبت پر یقین کرتی ہوں اور کشف میں نے اپنا کہا پورا تو کیا ہے۔ شادی کے بعد پل پل

تمہارے بھائی کو جانا ہے، سمجھا ہے مگر میری خواہش اب بھی ادھوری ہے۔ کوئی مجھے بھی تو سمجھے کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ میری خواہش میرے

خواب..... شاید سب بے معنی..... میں نے تو اب یہ باتیں سوچنا ہی چھوڑ دی ہیں کشف! ہاں مگر جس انسان کی خاطر ہم ہر رشتہ چھوڑ دیتے

ہیں، جس کے ساتھ ساری عمر گزارتے ہیں، اس کی باتیں ہمیں دکھ دیں تو.....“ اس کا لہجہ بھیگ گیا تھا۔

”میں جانتی ہوں، تم بھیا کی باتوں پر دکھی ہوتی ہو، پراظہار نہیں کرتیں، ہے نا!“

”جب میں یہ سوچتی ہوں ناکشف کہ اتنی لمبی زندگی اگر اسی طرح گزرے گی تو دکھ ہوتا ہے۔ بابا اور آنٹی کی طرف دیکھتی ہوں تو دل سے دعا نکلتی ہے کہ اللہ ان کے درمیان کے فاصلے مٹا دے اور اپنی طرف دیکھتی ہوں تو دعا کرتی ہوں کہ یہ کہانی پھر نہ دہرائی جائے، ہماری سوچوں کے یہ اختلاف عمر بھر نہ رہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے کشف! تم ہو یا بابا، کوئی کب تک میرا ساتھ دے گا؟ زندگی تو بہر حال مجھے اور احراز کو ہی گزارنی ہے نا! میں پیچھے مڑ کر دیکھوں تو میرے پاس تو کچھ بچا ہی نہیں ہے۔ میرا تو کوئی بھی نہیں ہے، بس اب یہ ہی ایک بندھن ہے اور جو سب سے زیادہ اپنا ہے شاید اس چیز کا احساس بھی نہیں کہ مجبوراً اور زبردستی سہی، اس نے میرے مرحوم باپ کی خواہش پوری کی تھی اور میرے بابا مجھے یہ زندگی نہیں دینا چاہتے تھے، انہوں نے تو میری خوشیوں کے لیے بھیک مانگی ہوگی۔“

”مدھو!“ کشف نے اس کا چہرہ تھام کر اپنی طرف کیا، اس پورے عرصے میں پہلی بار اس کی پلکیں بھیگی تھیں۔ ”مدھو پلیز! رونا نہیں.....“ اس سے پہلے کہ وہ دونوں مزید کوئی بات کرتیں، ہلکی سی دستک کے بعد احراز اندر آیا تھا۔

”بھیا..... آپ.....؟“ کشف کو سمجھ نہیں آیا کہ اس لمحے کیا کہے۔ مدیحہ نے جلدی سے چہرہ صاف کیا۔ ”آئیں ابھیا! خیریت تھی یا اپنی بیگم کی کمی محسوس کر رہے تھے؟“ کشف اس وقت ماحول کا بو جھل پن ختم کرنا چاہتی تھی۔

”دراصل کافی پینے کی عادت نہیں رہی تھی نا، آج پی تو نیند اڑ گئی۔“ وہ کشف کے پاس ہی آ بیٹھا تھا۔

”مدھو! تمہیں پتا ہے، تمہاری شادی کے بعد بھیا پہلی بار آج میرے روم میں آئے ہیں۔ لگتا ہے مجھ سے بھی خفا ہیں، ورنہ پہلے تقریباً روز ہی ہم دونوں بہن بھائی گپ شپ کرتے تھے۔“

”کشف! تم کیا چاہتی ہو کہ میں اٹھ کر چلا جاؤں؟“ وہ نروٹھے انداز میں بولا۔ مدیحہ نے کن آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔ گندمی پُرکشش رنگت پر کھڑے نقوش، براؤن گہری آنکھیں، بلیوٹی شرٹ اور بلیک ٹراؤزر میں وہ روٹھا روٹھا کتنا خوبصورت لگ رہا تھا۔ وہ کسی بھی لڑکی کا آئیڈیل بن سکتا تھا کہ وہ تھا ہی اتنا اچھا اور وجیہ..... اس نے احراز شاہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی بہت کم دیکھی تھی۔ اکثر اس کے چہرے کے نقش بھی اکھڑے رہتے تھے۔

”ارے بھیا! میں تو آپ کو تنگ کر رہی تھی۔“ کشف کی آواز نے اسے حواسوں میں لوٹا دیا تھا۔ تبھی دروازے پر دستک ہوئی اور مانی آیا۔

”بھابی جی! بڑے صاحب بلارہے ہیں آپ کو۔“

”مجھے بابا.....؟ کہاں ہیں وہ.....؟“

”اسٹڈی روم میں.....“ مانی بتا کر چلا گیا۔ پتا نہیں کشف کو ہی محسوس ہوا تھا مگر احراز کے چہرے پر سایہ سالہرا یا تھا۔

”او کے کشف! گڈ نائٹ!“ مدیحہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ارے ڈیڈ کی بات سن کر آ جاؤ نا!“

”نہیں یار! اب آرام کروں گی۔“

”چلو ٹھیک ہے، تم بھی تو سارا دن کام کرتی رہتی ہو، تھکن ہو جاتی ہوگی۔“

”اوکے.....!“ وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل آئی اور اسٹڈی روم میں پہنچی تو بابا اس کے ہی منتظر بیٹھے تھے شاید.....

”بابا! آپ نے بلایا تھا مجھے.....؟“

”جی بیٹا! مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔“

”مجھ سے..... کہیں.....!“ وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

”مدیحہ! میں نے فیصلہ کر لیا ہے حالانکہ یہ فیصلہ مجھے بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا مگر دیر سے سہی، اب میں نے حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔

میں گاؤں جا رہا ہوں ہمیشہ کے لیے..... کشف تو ظاہر ہے کہ میرے ساتھ جائے گی مگر میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔“

”بابا! آپ آنٹی کو اکیلا چھوڑ کر کیسے جاسکتے ہیں؟ انہیں آپ کی ضرورت ہے۔“

”مدھو! اسے تو میری ضرورت کبھی بھی نہیں رہی بچے! کاش ایسا ہی ہوتا۔ خیر، میں تم سے پوچھنا چاہتا تھا کہ تم ہمارے ساتھ چلو

گی؟ بچے! میں تمہارا بھی مجرم ہوں۔ اپنے مرحوم بھائی اور اپنی خواہش تو میں نے پوری کر لی لیکن تمہاری زندگی مشکل میں ڈال دی۔

احزاز جانے کب تمہاری ذات کو سمجھے گا، جانے کب اسے احساس ہو۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تم بھی میری طرح اکیلی ہی زندگی کا یہ سفر نہ

طے کرتی رہو، ہم سفر کے انتظار میں..... میں جانتا ہوں کہ تم نے پوری کوشش کی ہے اور تم کسی حد تک کامیاب بھی رہی ہو..... لیکن احزاز کا

مزاج اپنی ماں جیسا ہے، مدیحہ! اس کا تم اندازہ لگا چکی ہوگی اور میں اس کی طرف سے خوش فہمی کا شکار ہونا نہیں چاہتا۔ تم سوچ لو، رات ہے

تمہارے پاس..... میں اور کشف کل چلے جائیں گے۔ تم ہمارے ساتھ جانا چاہو گی یا احزاز کو ایک موقع اور دو گی؟“ بابا نے اسے دیکھا جو

خود جیسے ہاری ہوئی لگ رہی تھی۔ اس کا دل تو پہلے ہی اداس ہو رہا تھا۔ وہ بابا کی گود میں سر رکھ کے بُری طرح رو دی۔

”شاید بابا میری کوششوں میں ہی کمی رہ گئی ہے۔ میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔ آپ کی ذات سے میرا حوصلہ بڑھتا تھا، آپ

نہیں ہوں گے تو..... اور رہی میرے نصیب کی بات تو احزاز کو میری ضرورت ہوئی تو مجھے لینے ضرور آئیں گے۔ بابا میں انہیں موقع نہیں،

خود کی کوششوں کو آزمانا چاہتی ہوں۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ میں خلوص اور نیک نیتی سے کیے گئے اس تمام عرصے کی کوشش میں کہاں تک

کامیاب ہوئی ہوں اور کامیاب ہوئی بھی ہوں یا نہیں.....؟“

”اللہ تمہیں کامیاب کرے بیٹا!“ انہوں نے اس کا سر تھپکا۔ وہ کافی دیر روتی رہی۔ بابا سے وہ دل کی ہر بات شیئر کر لیتی تھی۔

انہیں بتاتی رہی۔ وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا۔

”مدھو! بہت رات ہو گئی ہے بچے! اب جا کے آرام کرو۔“

”جی بابا!“ اس نے چہرہ صاف کیا اور ”گڈ نائٹ“ کہتی اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس کی آہٹ پر وہ یوں اٹھ بیٹھا تھا جیسے اس کا

ہی منتظر ہو۔ مدیحہ نے پہلے واش روم کا رخ کیا پھر باہر آ کر تکیہ اٹھاتے بیڈ پر گئی تو وہ خود کو روک نہ پایا اور پوچھ بیٹھا۔

”بابا سے کیا بات ہوئی ہے؟“ مدیحہ نے اسے بہت حیرت سے دیکھا۔

”بابا صبح ہمیشہ کے لیے گاؤں جا رہے ہیں.....“

”اور.....“ اس نے پوچھا۔

”میں اور کشف بھی ان کے ساتھ جائیں گے۔“ یک دم ہی احزاز کو لگا اس کے اندر کچھ زور سے ٹوٹا ہو۔

”تم نے ڈیڈ کو سمجھایا نہیں.....؟“ جواباً اس نے صرف سر ہاں میں ہلایا تھا۔ اس سے پہلے احزاز نے کبھی اتنی بات نہیں کی تھی اس

سے.....“ مگر وہ فیصلہ کر چکے ہیں۔“ اس نے تکیہ اٹھایا اور صوفے پر جا کے لیٹ گئی۔

”اور تم.....؟“ وہ آواز شاید ایک خواب تھا۔ وہ بھلا کیوں مجھ سے پوچھے گا۔ وہ آنکھوں پر ہاتھ دھر کے سونے کی کوشش کرنے

لگی اور احزاز سوچ میں پڑ گیا۔ آج اس نے مدیحہ کی ہر بات سنی تھی اور واقعی اسے احساس ہوا تھا کہ وہ اس کی ذات سے وابستہ ہو کر ہی اس

گھر میں آئی تھی اور اس نے کبھی سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ صبح کیا وہ چلی جائے گی۔ بابا اور کشف کے ساتھ.....؟ کیا ماما کو روکنا نہیں

چاہیے بابا کو؟ انہوں نے ایک عمر ساتھ گزاری ہے..... کاش مमारوک لیں ڈیڈ کو..... اور وہ.....! کیا وہ مدیحہ کو روک پائے گا؟ اس کا ذہن

بڑی طرح الجھ رہا تھا۔ مگر اس کے پاس ان الجھنوں کا کوئی حل نہیں تھا۔

اگلے روز اس نے بابا کو جالیا۔

”بابا پلیز! آپ میرے بارے میں سوچیں، مجھے اکیلا چھوڑ کر مت جائیں نا!“

”میں نے تو کوشش کی تھی بیٹا کہ تم اکیلے نہ رہو، مگر تم نے خود وہ تمام لمحے گنوا دیئے اور اب میں مدیحہ کو یہاں چھوڑ کر پھر سے وہ

کہانی نہیں دہرانا چاہتا جو میرے ساتھ بیت چکی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری ذمہ داری پوری ہوئی۔ تم ماشاء اللہ ایک اچھے بزنس مین بن

چکے ہو، سیشنل ہو، البتہ کشف کو رخصت کرنے کی ایک ذمہ داری ابھی مجھ پر باقی ہے اور گاؤں جا کر پہلا کام یہ ہی کروں گا۔ ٹائم ہو تو آ جانا

ورنہ میں جانتا ہوں، تم اپنی بہن کو اچھی دعائیں ضرور دو گے۔ اپنا خیال رکھنا اور ہاں! بے شک تمہاری ماں کو کسی کی ضرورت نہیں ہے مگر تم اپنا

فرض ادا کرنا اور ان کا خیال رکھنا۔“

”ڈیڈ پلیز!“

”احزاز! مجھے مجبور مت کرنا بچے! زندگی میں پہلی بار کوئی فیصلہ کر کے مجھے دلی سکون ملا ہے۔“ گویا وہ اٹل تھے۔ احزاز ماما کے

پاس گیا انہیں سمجھانے مگر.....!

”تو کیا ہوا؟ وہ یہاں ہو کر بھی کبھی میرے نہ بن سکے۔ یہ شادی صرف ایک سمجھوتا تھی..... ورنہ شاہ نواز احمد کبھی بھی میرے شوہر

نہ ہوتے۔“



”مما.....!“ وہ سکت رہ گیا۔ ”آپ کو ڈیڈ کے جانے کا ذرا بھی افسوس نہیں.....؟“ آپ نے ایک عمران کے ساتھ گزاری ہے۔“  
 ”وہ میری مجبوری تھی مائی سن! پلیز میرا سر مت کھاؤ۔ شاہ نواز نے بہت دیر سے سہی، صبح فیصلہ کیا ہے، اسے بہت پہلے چلے جانا چاہیے تھا۔ شاید وہ یہاں ہو کر بھی یہاں کبھی تھا ہی نہیں..... میں نے زبردستی اسے اس کے ماں باپ سے دور رکھا تھا اور وہ صرف اپنے بچوں کی خاطر خاموش رہا۔ آج جب اس کے بچے اپنے پیروں پر کھڑے ہیں تو اس نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔“ احراز کو محسوس ہو رہا تھا کہ یہ عورت جسے وہ ماں کہتا رہا ہے اس کی ماں ہے ہی نہیں۔ اس عورت میں جذبات و احساسات تھے ہی نہیں۔ جس شخص کے ساتھ زندگی گزاری۔ اس کے ہونے نہ ہونے سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

”مجھے بہت افسوس سے یہ کہنا پڑ رہا ہے آج کہ آپ ہماری ماں ہیں اور یہ بات میرے لیے خوشی کا باعث ہرگز نہیں ہے“ پہلی بار اس کے لبوں سے ایسے الفاظ ادا ہوئے تھے کہ جن پر اسے خود بھی دکھ تھا۔ مگر بابا کے جانے سے زیادہ نہیں۔ وہ ہارے ہوئے شخص کی طرح کمرے میں آ گیا جہاں مدیحہ جانے کی تیاری کر رہی تھی۔

”اب اس سے کیا کہوں.....؟“ اس نے خاموشی سے اپنے آفس کی تیاری کی اور جب کمرے سے جانے لگا تو مدیحہ کی آواز نے قدم روک دیے۔

”میں جانتی ہوں احراز! کہ میرے وجود نے آپ کو کبھی خوشی نہیں دی، میں ایک زبردستی کے بندھن میں بندھ کر آپ کی زندگی میں آئی تھی، میں نے ہمیشہ کوشش کی کہ میری ذات سے آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو پھر بھی کبھی اگر میں نے آپ کو دکھ دیا ہو تو اس کے لیے مجھے معاف کر دیجیے گا۔“ اس کی آواز بھاری ہو گئی تھی تب ہی وہ خاموش ہو گئی۔

”اگر یہ ہی الفاظ میں کہوں تو.....؟ کیونکہ میری ذات سے تو مدیحہ احراز شاہ تمہیں ہمیشہ دکھ اور تکلیف ہی ملی ہے۔ اس کے لیے ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔“ اس نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ اپنی بات ختم کر کے فوراً چلا گیا تھا۔



حویلی کا ہر فرد انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔ دادی اماں اور پھوپھو نے اسے گلے لگایا۔

”پتا ہے کتنا مشکل تھا ہمارے لیے تیرے بنا جینا، کتنے دن تو یوں محسوس ہوا کہ ٹو آ جائے گا۔“ پھوپھو اسے سینے سے لگائے کہہ رہی تھیں۔ ”اور حماد کتنے دن تجھے یاد کر کے روتا رہا، اس نے تو گھر آنا چھوڑ دیا تھا کہ مدھو کے بنا گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ ہمیں تو عادت بھی نہیں تھی تیرے بنا رہنے کی کبھی تجھے خود سے الگ کیا نہیں..... اور جب یوں اچانک اپنے سسرال گئی تو لگا ہمارے آنگن کی ساری چڑیا اڑ گئیں، وہ چہچہاہٹ نہیں رہی تھی مدھو!“ انہوں نے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں اس کا چہرہ تھام کر چوما۔ مدیحہ کی مسکراہٹ انہیں اچھی لگ رہی تھی۔ اس کے اندر بہت تبدیلی محسوس کی تھی انہوں نے..... لیکن یہ تبدیلی اس پر بیج رہی تھی۔ پھوپھو نے کشف کو بہت پیار کیا۔ اماں جی اور اباجی اپنے بیٹے کو دیکھ کر ہی مسرور ہو گئے تھے۔ حماد شام میں آیا تو گھر میں رونق دیکھ کر نہال ہو گیا۔ مدیحہ اس کے کاندھے سے لگ گئی۔

”بڑی سنگ دل بہن نکلی مدھوا! ایسی پیادیس گئی کہ مڑ کر اپنا بھائی بھی یاد نہ آیا۔ پتا ہے تیرے بغیر رہنے کی عادت کتنی مشکل سے ڈالی ہے ہم نے.....؟“

”میں نے ہر پل آپ لوگوں کو یاد کیا ہے بھیا! مگر وہاں زندگی گزارنے کے لیے ان لوگوں میں گھلنا ملنا انہیں وقت دینا بھی ضروری تھا نا!“

”اچھا کیا.....! چل یہ بتا احزاز کیسا ہے اور وہ تم لوگوں کے ساتھ نہیں آیا؟“ اس کے سوال پر پل بھر کو وہ گڑبڑا گئی پھر سنبھل گئی۔

”بابا اور وہ دونوں آ جاتے تو بزنس کا کیا ہوتا؟ پھر آنٹی کا ارادہ تھا کہ وہ اپنی فرینڈز کے ساتھ گھومنے جائیں گی۔ گھر پر کسی کو تو رہنا تھا نا!“ اس بے مہر کی سنگت نے اسے جھوٹ بولنے کا ہنر بھی سکھا دیا تھا۔ حماد ماموں اور کشف سے ملا۔ ان کے ساتھ باتیں کرتے ٹائم کا پتا ہی نہ چلا تھا۔

”میرا خیال ہے اب سو جانا چاہیے بچو! بارہ بج چکے ہیں۔“ بابا نے کہا تو انہیں ٹائم کا احساس ہوا۔

”جی ماموں! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، پھر صبح مجھے شہر بھی جانا ہے، ضروری کام سے.....“ حماد بولا۔ کشف تو انہیں گرائے کر رہی تھی مگر مدھو کا نیند سے بُرا حال تھا، اس نے شکر ادا کیا۔



شام شاید اپنے پیر پھیلا چکی تھی۔ اس نے کسلمندی سے کسبل ٹانگوں سے ہٹایا اور انگڑائی لیتا کھڑا ہو گیا۔ پردے سمیٹ کر کھڑکی کھولی تو سورج جیسے اسے ہی الوداع کہنے کو رکھا ہوا تھا۔

موسم بدل رہا تھا اور بدلتے موسم کی یہ اداس سیاہ شامیں، ڈوبتا سورج احزاز شاہ کے اندر تک سنائے اُتار گیا۔ اسے اپنے اندر کچھ ڈوبتا محسوس ہوا تھا۔ سرد ہوا کا جھونکا چہرے کو چھو کر گزرا تو جھر جھری لیتا وہ کھڑکی بند کرنے لگا۔ فریش ہو کر نیچے آیا تو خلاف معمول ماسٹنگ روم میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔

”گڈ ایوننگ بیٹا! اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟“ کل سے بخار نے اس کے وجود کو توڑ کر رکھ دیا تھا مگر اب کچھ بہتر تھا۔

”اب بہتر ہوں ماما!“ جب ہی مانی چائے لے آیا۔

”بھیا جی! چائے کے ساتھ کچھ لائو؟ آپ نے دوپہر بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔“

”نہیں! میرا دل نہیں چاہ رہا۔“ اس وقت کی چائے کے ساتھ کچھ نہ کچھ وہ ضرور بنا کے رکھتی تھی۔ یہ ٹائم وہ ہوتا جب مدیحہ، بابا، کشف اور ان سے الگ بیٹھا احزاز چائے پیتے گپ شپ کیا کرتے اور آج! شام تو تھی مگر وہ نہیں تھے۔ جانے کیوں اس کا دل عجیب سے سنائے میں گھر گیا۔ ملازم چائے لے کر آیا تو اس نے لونادی۔

”مانی! میرا دل نہیں چاہ رہا چائے کو، لے جاؤ پلیز!“ ملازم نے اسے حیرت سے دیکھا۔ اس وقت کی چائے اور وہ منع کر دے؟

لیکن اسے اپنے چھوٹے صاحب کے موڈ سے ڈر لگتا تھا، سو خاموشی سے کپ اٹھا کے بچن کا رخ کیا۔

”مائی سن! مجھے لگتا ہے تم ان لوگوں کو یاد کر رہے ہو۔ آج دس دن ہو گئے ہی اور میں دیکھ رہی ہوں کہ تم میں پہلے والی بات نہیں رہی۔“

”مما! اگر ایسا ہے تو ظاہری بات ہے، وہ میرے ڈیڈی ہیں، کشف میری بہن ہے۔ اک عمر گزاری ہے میں نے ان کے ساتھ

اور میں تو پھر انسان ہوں! شاید آپ نے غور نہیں کیا یہ گھر اس کے درود یواریتک اداس ہیں۔“

”اور تمہاری بیوی؟ مجھے جانے کیوں لگتا ہے کہ تم اس میں شامل ہو چکے ہو، اس کی کمی محسوس کر رہے ہو؟“

مما کی بات پر پل بھر کو اس کے اندر ایک سکون سا اثر تھا پھر سنبھل گیا۔

”مما! مانا کہ میرے اور مدھو کے درمیان ہم آہنگی نہیں رہی مگر یہ سچ ہے کہ اس نے اس گھر کو گھر بنایا ہے، توجہ اور پیار سے..... جو

آپ ایک عمر گزار کر بھی نہ کر سکیں، وہ چند ماہ میں کر گئی۔ اس نے مجھے احساس دلایا ہے کہ گھر کے لیے عورت کا وجود کتنی اہمیت رکھتا ہے اور

عورت کی توجہ اگر اس کا گھر اور گھر والے ہوں تو وہ گھر کتنا مکمل اور پُر سکون ہوتا ہے۔ مجھے کوئی شرمندگی نہیں ہے یہ کہنے میں کہ میں اس کی کمی

شدت سے محسوس کر رہا ہوں کیونکہ مجھے اور اس گھر کو اس کی عادت ہو گئی ہے، وہ میری ہر ضرورت، ہر خواہش کا خیال رکھتی تھی بنا میرے

کہے۔ کاش! آپ نے بھی ڈیڈی پر یوں توجہ دی ہوتی۔“

”اُف! خدا یا! یہ لیکچر بند کرو۔ اگر اتنی محبت ہے اس اجڈ سے تو چلے جاؤ تم بھی وہاں.....“

”کاش ایسا ہو سکتا مگر میرے ڈیڈی نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اپنی ماں کے ساتھ رہوں، ان کا خیال رکھوں جنہیں اپنے علاوہ کسی کا

خیال نہیں۔“

”میں اپنا خیال رکھ سکتی ہوں، مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔“

”جی! اس کا عملی مظاہرہ تو آپ کر چکی ہیں۔ اپنے شوہر کے جانے پر جس عورت کو دکھ تک نہ ہو وہ.....“ وہ یہ کہہ کر اٹھ گیا۔

احزاب شاہ کی حالت عجیب سی تھی۔ گھر آنے کو دل نہ چاہتا تھا اور آنا تو یوں محسوس ہوتا جیسے ابھی ڈیڈی یا کشف کی آواز آئے گی، وہ اسے

پکاریں گے، اپنے کمرے میں جاتا تو لگتا ابھی کسی کی چوڑیاں کھنکیں گی مگر ہر سو صرف سناٹا تھا اور وہ ایک ماہ میں ہی اس زندگی سے اکتا گیا تھا۔

”پلیز ڈیڈی! مجھے یہ سزا مت دیں، لوٹ آئیں، میں آپ کے بنا نہیں رہ سکتا۔“ اس نے ڈیڈی کو فون کیا تھا۔ شاید اس دن سلمیٰ بیگم کو

یہ احساس ہوا کہ اس نے احزاب کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئیں مگر انہوں نے یہ ملک چھوڑنے کا فیصلہ

کیا تھا اور یہ ہی اطلاع دینے کے لیے آج زندگی میں پہلی بار انہوں نے خود شاہ نواز احمد کو فون کیا تھا۔

”میں احزاب کو یوں نہیں دیکھ سکتی۔ یہ سچ ہے شاہ نواز! میں کبھی تم سے محبت نہیں کر پائی ورنہ تم نے ہر ممکن کوشش کی کہ ہمارا یہ رشتہ

مضبوط ہو مگر میرے دل میں آج بھی تم نہیں ہو۔ سو میں مزید تمہیں یا اپنے بچوں کو دکھ نہیں دوں گی، میں امریکہ جا رہی ہوں۔ تم پلیز اپنے

بچوں میں لوٹ آؤ کیونکہ میرے بغیر تو بچے ہمیشہ ہی رہے ہیں لیکن تمہارے بنا وہ نہیں رہ سکتے۔ احزاب بہت تنہائی محسوس کرتا ہے، اس کا باپ



اسے لونڈو پلیز!“ انہوں نے آج صرف اپنی کہہ کر لائٹ کاٹ دی اور شاہ نواز احمد ایک بار پھر سلمیٰ احمد کے سامنے ہار گئے۔  
کاش ہمارے بڑوں نے یہ فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا ہوتا تو آج.....!

وہ اس وقت کشف کی شادی کی تیاری میں مصروف تھے اور انہوں نے احراز کو بھی اطلاع دے دی تھی کہ پرسوں کشف کا نکاح ہے، تم آنا چاہو تو ضرور آنا اور جس دن نکاح تھا، وہ سویرے ہی پہنچ گیا تھا۔ کشف کو یوں لگا جیسے وہ برسوں بعد اپنے بھائی سے ملی ہو۔ کتنی دیر اس کے گلے سے چپکی رہی۔

”بھیا! آپ ٹھیک ہیں، اتنے کمزور لگ رہے ہیں۔“ اس نے بغور مشاہدہ کیا تھا۔ وہ مسکراتا ہوا ڈیڈ کے گلے لگ گیا اور جانے کس احساس سے اس کی آنکھوں کے گوشے نم پڑ گئے۔

”اگر آپ بھی ماما کی طرح کاروبار رکھتے تو شاید آپ کی کمی اتنی شدت سے محسوس نہ ہوتی۔ مگر آپ نے تو اپنی ذات سے زیادہ ہمارا خیال رکھا ہے۔ ڈیڈ! پھر آپ نے یہ سوچ کیسے لیا کہ ہم آپ کے بنارہ پائیں گے؟ نہیں ڈیڈ.....!“ ڈیڈ نے اپنے خوب صورت بیٹے کو مزید خود سے بھینچ لیا۔

”جناب! ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں.....“ حماد کی چپکتی آواز نے اسے ڈیڈ سے الگ کیا۔

”اوہ، سوری ڈیر!“ وہ حماد سے ملا پھر دادا، دادی جی، پھوپھو اور گھر کے ہر فرد سے مل چکا تھا مگر اسے مدیحہ کا چہرہ نظر نہیں آیا۔ اس کی نگاہیں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ ظاہر ہے شادی کا گھر تھا، مہمان تھے اور اتنے لوگوں میں اسے تلاش کرنا..... شاید بابا اس کی نگاہوں میں چوری چوری کسی کی تلاشی دیکھ چکے تھے تبھی بھنویں اچکا کر اشارے سے پوچھا تو وہ مسکرا کر سر جھکا گیا اور شاہ نواز احمد اسی بات کے منتظر تھے کہ احراز، مدیحہ کو خود پکارتا ہے یا ان کی طرح اب مدیحہ نے بھی یوں ہی بے مقصد زندگی گزارنی تھی لیکن وہ خوش تھے کہ مدیحہ کی محنت رائیگاں نہیں گئی۔

شام میں جا کر وہ اسے دکھائی دی تھی۔ میرون کلر کے فل کام والے سوٹ میں خوبصورت سے کیے میک اپ اور جیولری نے اسے نظر لگ جانے کی حد تک خوبصورت بنا دیا تھا۔ کسی کام سے گزر رہی تھی جب احراز سے سامنا ہوا۔

”السلام علیکم!“ اس کے یا قوتی لب ہولے سے ہلے تھے، احراز کہیں کھو گیا۔

”بہت جلدی یاد آ گیا آپ کو.....؟“ صبح سے اسے ڈھونڈ کر نگاہیں تھک گئی تھیں سو وہ ناچاہتے ہوئے بھی طنز کر گیا مگر اس کی موجودگی اس بہکار ہی تھی۔

”تم ٹھیک ہو؟“

”جی! آپ اور آنٹی کیسی ہیں؟“

”ماما امریکہ چلی گئی ہیں۔“ سنجیدگی سے جواب دیا۔ مدیحہ نے نظریں اٹھا کے اسے دیکھا، جسکے چہرے پر عجیب سا دکھ نظر آیا تھا،



وہ پہلے سے بہت کمزور لگ رہا تھا۔ چہرے پر تازگی بھی نہیں تھی، اس کے دل کو کچھ ہوا۔

”آپ ٹھیک ہیں نا احراز! بہت کمزور ہو رہے ہیں؟“ اس کی فکر جیسے احراز شاہ کی روح تک کو ہر سکون کر گئی۔

”تمہیں فکر ہے میری.....؟“ اس نے گلہ کیا۔ مدھونے اسے دیکھا جو اسے ہی تک رہا تھا۔ ”جس دن سے آئی ہو بیمار ہی رہا ہوں۔“ جانے وہ کیا جتا رہا تھا۔ مدیحہ کی پلکیں خوشی سے بھیگیں۔

”احراز بھائی!“ حماد کے دوست کی آواز نے اس لمحے بہت پریشان کیا تھا اسے۔ ”مجھے تم سے بات کرنی ہے مدیحہ احراز!“ وہ اپنی بات مکمل کر کے تیز قدموں سے پلٹ گیا۔



ڈیڈ! اب تو کشف کی ذمہ داری ادا کر دی آپ نے، پلیز اب گھر چلیں، میں بہت تنہا ہو گیا ہوں۔“

”احراز! کیا میرے واپس جانے سے تمہاری تنہائی واقعی دور ہو جائے گی بچے!“ ڈیڈ کی ذمہ داری بات وہ سمجھ نہیں پایا تھا۔

”کیا مطلب ڈیڈ!“

”میں نے تمہاری ممانہ کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی اک عمر تنہا گزاری ہے احراز! اور میں نہیں چاہتا کہ دوبارہ ایسا ہو۔ میں تمہارے ساتھ رہوں یا نہ رہوں مگر تمہیں زندگی کے اس سفر میں ایک ہم سفر چاہیے۔ جس کا ہاتھ تھام کر تم یہ زندگی آسانی سے گزار سکو اور جو تمہارے ہر دکھ سکھ کی ساتھی ہو۔ تم ایک دوسرے کی مشکلیں سمجھو اور مل کر حل کرو۔“ اب اسے یہ بات واضح انداز میں سمجھ آ گئی تھی۔ وہ خود بھی تو دوبارہ سے یہ کہانی نہیں دہرانا چاہتا تھا لیکن اپنی زندگی وہ کسی سمجھوتے کے سہارے نہیں بلکہ دل و دماغ کی رضامندی سے گزارنا چاہتا تھا، جس کے لیے وہ اب پوری طرح تیار تھا۔ وہ اس آنے والے نئے سال میں اپنی نئی زندگی کا آغاز کرے گا، مڑ کر گزر جانے والے ماہ و سال کو نہیں دیکھے گا۔ یہ ہی وعدہ تو کر کے آیا تھا وہ خود سے اور یہ ہی اقرار تو اس نے مدیحہ سے لینا تھا۔

”آپ فکر نہ کریں ڈیڈ! مجھے صرف آپ کی دعائیں چاہئیں۔“ اس نے مسکرا کے ان کے خدشات دور کیے۔ ”میں مدیحہ سے کہہ دیتا ہوں کہ صبح ہمیں نکلنا ہے، وہ پیکنگ کر لے۔“ اس کی مکمل بات سن کر ڈیڈ سرشار ہو گئے تھے۔



اگلی صبح وہ سب کی دعائیں سمیٹ کر ایک بار پھر اسی سفر پر رواں دواں تھی لیکن اس بار دل میں امید تھی، اسے یقین تھا کہ وہ اپنا ہم سفر پا چکی ہے۔ بس اس کے اظہار کی منتظر تھی۔ جس نے اس سے کہا تھا کہ وہ مدیحہ سے بات کرنا چاہتا ہے۔

گھر پہنچے تو مانی انہیں دیکھ کر کھل اٹھا۔

”بھابی جی! قسم سے آپ کے آنے سے حوصلہ ملا ہے، ورنہ بھائی جی کے خراب موڈ سے مجھے ڈر لگنے لگا تھا۔“ احراز نے اسے آنکھیں دکھائیں تو بابا اور وہ ہنس پڑے تھے۔

”اچھا اب فٹ کچھ بناؤ، میں ابھی فریش ہو کر آتی ہوں، بھوک سے برا حال ہے۔“

”جی اچھا.....!“ وہ مسکراتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔ شام تو ویسے بھی ڈھل چکی تھی۔ جب تک وہ لوگ فریش ہو کر آئے، مانی نے کھانا تیار کر لیا تھا۔

”ڈیڈ! میں اور مدیحہ کھانے کے بعد باہر جائیں گے۔ آپ چلی گئے ہمارے ساتھ؟“ وہ کھانے کے دوران ڈیڈ سے مخاطب تھا۔

”ارے نہیں بھئی! میں آرام کروں گا۔ تم دونوں جاؤ۔“ انہوں نے سہولت سے منع کر دیا۔

”تم تیار ہو جانا کھانے کے بعد!“ وہ اب مدیحہ سے مخاطب تھا۔ جس نے صرف سر ہلایا تھا۔ کھانا ختم کرتے ہی احزاز اٹھ گیا، بابا

اسے دیکھ رہے تھے۔

”خوش رہو بچے! آج تمہاری محنت کا ثمر تمہیں مل گیا، اللہ رب العزت تمہیں ہمیشہ خوش رکھے اور ہر آنے والا ہر دن تمہارے

لیے خوشیاں ہی خوشیاں لائے۔“

”شکریہ بابا!“ اس نے اٹھ کر ان کے گلے میں بائیں ڈالیں۔

”اچھا! اب جا کر تیار ہو جاؤ، کہیں احزاز کا موڈ بگڑ نہ جائے۔“ انہوں نے کہا۔

وہ ”اچھا“ کہتی اٹھ گئی اور آدھے گھنٹے بعد وہ دونوں باہر جا رہے تھے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے پُر شوق نظروں سے مدیحہ کو

دیکھا تھا، وہ جھینپ کر رخ موڑ گئی۔ احزاز نے گاڑی اسٹارٹ کی۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

دراصل میرے دوستوں نے آج پارٹی رکھی ہے لیکن وہاں جانے سے پہلے میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“ وہ ڈرائیو کرتے

ہوئے بہت نرم انداز میں بات کر رہا تھا۔ اس نے گاڑی کو ایک خوبصورت اور شہر کے بڑے ہوٹل کے سامنے لا کر کھڑا کیا تھا۔ مدیحہ نے

حیرت سے دیکھا۔

”آ جاؤ!“ گاڑی پارک کر کے وہ آگے بڑھ گیا، مدیحہ اس کے ہمراہ تھی۔ یہاں بہت زیادہ لوگ تھے، شاید وہ بھی پارٹی میں مدعو

تھے۔ احزاز اسے لے کر سکون سی جگہ تلاشتے ہوئے ایسی جگہ لے آیا تھا جہاں بہت کم لوگ تھے۔

بیٹھ جاؤ! اس نے کرسی کی جانب اشارہ کیا۔ مدیحہ کچھ جھجکتے ہوئے بیٹھ گئی۔ بے شک یہاں لوگ کم تھے مگر اس کے خیال سے رش

تھا۔ احزاز نے اس کی الجھن محسوس کی۔

”پلیز ریپلیکس! یہ وہ دنیا ہے جہاں کسی بھی شخص کو دوسرے سے کوئی سروکار نہیں، بے فکر ہو جاؤ۔!!“

”میں یہاں ایزی فیل نہیں کر رہی۔“ بار بار دوپٹا درست کرتے وہ تنگ آ گئی تھی۔

”مدھو! ادھر دیکھو میری طرف.....!“ وہ قدرے تیز لہجے میں بولا تھا مگر آج اس کے رویے میں اپنا پن نمایاں تھا اور پہلی بار اس

نے ”مدھو“ پکارا تھا۔ مدیحہ نے نظریں ذرا سی اٹھائیں تو اسے متوجہ پایا۔

”میں تمہیں یہاں اس لیے لایا ہوں کہ ہم آرام سے بات کر سکیں گے۔ گھر کے ماحول سے دور.....!“ اس کے لفظوں سے مدیحہ کے دل کی دھڑکن بے قابو تھی۔ ٹیبل پر نظریں جمائے جانے کیا کھوجے لگی۔ احزاز نے بغور اس کا سراپا دیکھا پھر ٹیبل پر دھرے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں کی پناہ میں لے لیا۔ مدیحہ کی جان پر بن آئی تھی، ایک تو احزاز کا یہ روپ، پھر پبلک پلیس۔

”مدھو! میں تمہیں شکریہ کہنا چاہتا ہوں۔ تم نے مجھے زندگی کی ایک نئی راہ دکھائی، میں شاید اس حیات کے صحیح معنوں سے واقف ہی نہیں تھا اور کبھی ہو بھی نہ پاتا، اگر تم میری زندگی میں نہ آئی ہوتیں۔ میں بھی شاید ماما کی پسند کی کسی لڑکی سے شادی کر لیتا، جو بے شک ماما جیسی ہی ہوتی مگر ہمارے گھر کی وہ ہی روٹین تا عمر چلتی رہتی جو تمہارے آنے سے پہلے تھی۔ مدھو! تم میری زندگی میں بنا میری خوشی اور مرضی کے آئی تھیں اور یقین کرو کہ مجھے صرف تمہارا نام پتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے تمہارے بارے میں کچھ علم نہ تھا اور نہ ہی مجھے دلچسپی تھی۔ مجھے صرف اتنا پتا تھا کہ ماما کہتی تھیں گاؤں کے لوگ جاہل اور چھوٹی سوچ کے ہوتے ہیں اور تعلیم کے سخت خلاف۔ سو میرے ذہن میں یہ ہی تھا کہ تم بھی ان پڑھ ہو گی حالانکہ حویلی کا ماحول دیکھ آیا تھا مگر مجھے لگا تم ہمارے گھر کے لیے قطعی نامناسب ہو۔ ہمارے ساتھ کبھی ایڈجسٹ نہیں کر سکتیں اور کم از کم ہم دونوں میں ہم آہنگی ہو ہی نہیں سکتی۔ مگر مدھو! میں غلط تھا۔ میں نے لاکھ تمہیں نظر انداز کیا مگر پھر بھی تم میری توجہ کا مرکز رہیں۔ تم نے دھیرے دھیرے میرے گھر، میرے کمرے اور پھر میرے دل میں ایسے جگہ بنائی کہ میں تمہارا عادی ہو گیا۔ ہاں مدھو! مجھے اعتراف ہے کہ تم میری ضرورت بن گئی تھیں۔ جب تم گاؤں میں تھیں تو میں شدید تناؤ کا شکار ہو رہا تھا، نہ کھانا اچھا بنتا اور نہ ہی میرے کام ٹھیک سے کوئی کر سکتا تھا۔ بس میں تم سے کہہ نہیں پایا کہ پلیز لوٹ آؤ مدھو! تم نے مجھے جان لیا تھا، میری ہر خواہش ہر ضرورت اور ہر وہ بات جو میرے دل میں ہوتی تھی تم جان لیتی تھیں۔ میرے اندر کے انسان کو وہ ہی توجہ چاہیے تھی جو تم نے دی۔ ہاں میں آج تم سے اقرار کرتا ہوں کہ تم نے مجھے مجھ سے چھین لیا ہے، تم میرے اندر بستی ہو، تم واحد ہستی ہو جس نے مجھے پیار کے معنی سکھائے۔ اپنی خاموشی، محنت اور لگن سے..... شکریہ مدھو! تھینک یو سوچ!“ وہ بڑی سچائی سے اعتراف کر رہا تھا۔ جذبات سے بھرپور لہجے میں۔ اس نے مدھو کے ہاتھوں کو لبوں سے چھوا تو اس نے یک دم ہاتھ کھینچ لیے۔ ”تم کچھ نہیں کہو گی؟“ جواب میں مدھو نے صرف اسے دیکھا، لبالب پانی سے بھری آنکھیں..... احزاز شاہ چند لمحے دیکھتا رہا۔ ”میں جانتا ہوں تم مجھ سے خفا ہو، تمہارے اندر بہت گلے ہیں جو صرف میری ذات سے ہیں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم کبھی بھی ان کا اظہار نہیں کرو گی؟“ مدیحہ نے بہت حیران نظروں سے اسے دیکھا۔ ”میں نے تمہاری تمام باتیں سن لی تھیں جو تم اس دن کشف کے روم میں بیٹھی اس سے شیئر کر رہی تھیں۔ آئی ایم سوری، میں نے ارادنا ایسا نہیں کیا تھا مگر جب میں نے تمہارے اندر کے وہم اور تمہارے شکوے جو تم کر رہی تھیں اور اپنا ذکر سنا تو میں نہ چاہتے ہوئے بھی سنتا گیا..... تم نے بالکل غلط کہا تھا مدھو! کہ تم اپنے اور میرے رشتے کو کبھی مضبوط نہیں کر سکتیں۔ تمہیں اندازہ ہے کہ تم نے اس بندھن کو کس قدر محبت سے باندھ دیا ہے، مائی ڈیئر وائف! کہو تو کان پکڑ کر سوری کروں کہ میں نے تمہیں سمجھنے میں واقعی دیر کر دی یا شاید اظہار کرنے میں ٹائم لگا دیا۔ تمہیں پتا ہے مدیحہ! شاید



میں اب بھی تمہاری محبت کو اندر ہی دبائے بیٹھا رہتا، مجھے اظہار کرنے کا ہنر نہیں آتا تھا مگر ماما کی بات نے میرے جذباتوں کو جیسے زبان دی تھی۔ جب انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں تم میں شامل ہو چکا ہوں اور تمہاری کمی مجھے محسوس ہوتی ہے تو میں یکدم پھٹ پڑا۔ اس دن میں نے ماما کے سامنے وہ اقرار کر لیا جسے میں دل میں چھپائے پھرتا تھا۔ تب مجھے ہمت مل گئی اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں جاؤں گا، تمہیں لینے کیوں کہ تمہارے بنا میں واقعی نہیں جی سکتا۔“

”مجھے لگا کہ میں نے اپنی محنت اور سچی لگن سے آپ کو پالیا تھا مگر جب میں نے آپ سے جانے کا کہا تو میرے دل کو امید سی تھی کہ شاید آپ مجھے روک لیں گے مگر وہ امید، امید ہی رہی۔ اگر آپ چاہتے تو میں کبھی نہ جاتی۔“ اس کے لب ہلے تو شکوہ ہی اتر اٹھا، وہ ہولے سے ہنس دیا۔

”شکریہ! تم نے کچھ کہا تو..... گلہ ہی سہی۔“ وہ ہولے سے ہنسا۔ ”تم میرے اندر سا گئی تھیں واقعی تمہیں روک سکتا تھا، کیونکہ تم میرے اندر عیاں نہیں تھیں۔ اسی لیے میں نے تمہیں نہیں روکا کیونکہ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ میری یہ فیملنگز محض وقتی ہیں یا پھر تمہارے جانے کے بعد بھی تم یوں ہی میری روح میں بسی رہو گی۔ شاید میں خود کو آ ز مانا چاہتا تھا کہ میں تمہارے بن رہا پاؤں گا یا نہیں اور تم جیت گئیں.....“

”احزاز.....!“ اس کے لبوں سے اپنا نام اسے بہت خوبصورت لگا تھا۔

”ہوں!“ وہ اب تک اس کی آواز کے سحر میں کھویا ہوا تھا۔

”آج میں بہت خوش ہوں، بہت خوش، کیونکہ تمہارے وسوسے دم توڑ گئے ہیں۔“

”ہاں مدیحہ! میں سمجھتا ہوں تمہیں ڈرتھانا کہ کہیں ہماری بھی ساری زندگی ماما اور ڈیڈی طرح نہ گزر جائے؟ لیکن نہیں، ہماری زندگی محبت و احساسات سے بھرپور ایک دوسرے پر مکمل اعتبار کے ساتھ گزرے گی کیونکہ مدھوا! میں نہیں چاہتا تھا کہ ہمارے بچے بھی..... ساری عمر اسی کشمکش کا شکار رہیں۔“ اس کے لفظوں نے مدیحہ کے چہرے کی رنگ گہری کر دی تھی اور احزاز شاہ کو اس کے اس روپ پر ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔ ”تم بہت خوبصورت ہو مدیحہ احزاز! بہت پیاری..... آئی ریٹلی کو یو!“ محبت سے پوچھ رہا تھا اس کا۔ مدیحہ نے اسے گھورا مگر اس پر اثر نہیں تھا۔

”میں تم سے وعدہ کرتا ہوں مدیحہ کہ آج سے ہم اپنی زندگی کا خوشگوار آغاز کریں گے جس میں غلط فہمی اور گلے شکوے نہیں ہوں گے اور میں تمہیں اتنا پیار دوں گا کہ تم اپنے سارے دکھ بھول جاؤ گی۔ بس مجھے اور میرے گھر کو ہمیشہ یوں ہی تھا مے رہنا کیونکہ مجھے اور میرے گھر کو تمہاری عادت ہو گئی ہے اور میں اپنی یہ عادت عمر بھر نہیں بدلنا چاہتا۔“ اس کی دیوانگی پر وہ ہراساں تھی۔

”آؤ آج سے ہم اپنے نئے سفر کا آغاز کرتے ہیں۔“ اس نے مدیحہ کا ہاتھ تھاما اور ہوٹل سے باہر نکل آیا۔





## تمہاری یاد کے جگنو

وہ خاموشی سے اپنے کپڑے تہہ کر کے سوٹ کیس میں رکھ رہی تھی۔ چہرہ کسی بھی قسم کے تاثر سے قطعی عاری تھا۔ اشعر نے اس کا بھرپور جائزہ لیا تھا پھر مضطرب ہاتھوں کو مسل ڈالا۔

”تم اکیلی چلی جاؤ گی ناں ریحما؟“ اس نے کوئی دسویں بار یہ بات کہی تھی۔ اس بار وہ بنا کچھ کہے سر جھٹک گئی۔

”میں کیا کروں یار! بائی گاڈ اگر جاب کا پراہلم نہ ہوتا تو میں کبھی تمہیں اکیلے نہ جانے دیتا۔ آئی نو تم میرا مسئلہ انڈرا سٹینڈ کر رہی ہو، بٹ ماموں اور ارشد بھائی خفا ہوں گے۔“ وہ خود ہی فکر مند ہوتا ہوا وضاحتیں دینے لگتا۔

”اومائی گاڈ! بلیوی، میرا تمہیں اکیلے بھیجنے کو قطعی دل نہیں چاہ رہا۔“

”تمہیں کوئی مشکل تو نہیں ہوگی ناں؟“

”اشعر میں فرسٹ ٹائم اس شہر میں نہیں جا رہی ہوں۔“ آخر کار اسے بولنا پڑا۔

”پھر بھی ڈیر، ٹینشن تو ہے ناں مجھے۔“ اشعر بولا۔ اس کا دل چاہا کہہ دے کہ اشعر رضا، اس شہر کی گلیاں مجھے آج بھی ازبر ہیں

مگر کہہ نہ سکی۔ اشعر شاید اس کی سوچ پڑھ گیا تھا تب ہی قدرے مسکرا کے اسے دیکھا جو پیکنگ مکمل کر کے سوٹ کیس بند کر رہی تھی۔ پھر قریب آ کر اس کے کندھوں پر مضبوط ہاتھ دھر دیے۔ ریحاب نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

”آئی نو، وہ شہر تمہارے لیے نیا نہیں ہے مگر یہ بھی مت بھولو مائی لائف کہ تمہیں چار سال ہو گئے ہیں وہاں سے آئے ہوئے۔“

ظاہر ہے کچھ چیخو تو لگیں گے نا۔“ وہ قدرے مسکرا کے بولا تھا۔ ریحاب نے بغور اس کا چہرہ دیکھا جو اس کے اپنے چہرے سے قریب تر تھا۔

”میں نے زندگی کے بائیس سال گزارے ہیں اس شہر میں اشعر، وہاں کا کونا کونا مجھے یاد ہے۔“

”بات تو ساری میر دل کی ہے ناں جانو، جو تمہیں اکیلا بھیجنے پر راضی نہیں ہے۔ خیر میں ارشد بھائی کو فون کر دوں گا، وہ تمہیں

اسٹیشن سے لے لیں گے۔“ اشعر نے ہولے سے اس کی ٹھوڑی چھوتے ہوئے کہا۔ پھر اسے چھوڑ کر خود بیڈ پر گر گیا۔ گویا ریلیکس محسوس کر رہا

ہو۔ ریحما نے گہری سانس خارج کی اور پھر اس کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”اشعر تم فون مت کرنا۔ میں سب کو سر پر اند دینا چاہتی ہوں۔“ چار سال میں پہلی بار اس کے لہجے میں پُر جوش سے جذبے

اُبھرے تھے مگر صرف پل بھر کو۔ اشعر ہونٹ بھیجنے کر رہ گیا۔

”سوری میری جان! ایسا ممکن نہیں، ہاں اگر ہم دونوں ساتھ ہوتے تو میں بخوشی تمہاری بات مان لیتا۔“

”بلیوی اشعر، میں اکیلے گھر جاسکتی ہوں۔“ اس نے اشعر کے کشادہ سینے پر پیشانی دھرتے ہوئے بے بسی سے کہا۔ اس لمحے اشعر کوٹ کر اس پر پیار آیا تھا۔

”یار مسز، تم کیوں ارشد بھائی سے میری پٹائی کراؤ گی پلیز۔“ اس نے لجاجت سے کہتے ہوئے اس کے وجود کو بانہوں میں بھرا تھا۔ ریحاب گہری سانس لے کر رہ گئی تھی۔

”او کے اینڈ وٹ۔“

”تھینک یو ڈیر۔ خفا تو نہیں ہونا۔“ تب اس نے فقط سر ہلایا تھا۔

اشعر بھی خاموش ہو گیا۔ کبھی یہ لڑکی کتنی ضدی ہوا کرتی تھی مگر اب.....!



وہ کینٹ اسٹیشن پر اُتری تو ارشد بھائی کو ڈھونڈنے میں اسے قطعی وقت نہیں لگا۔ نیچے اُترتے ہی وہ مل گئے اور ریحاب ان کی بانہوں میں سما گئی۔

”کیسی ہے ہماری گڑیا۔“ اس نے مسکرا کر جواب میں فقط سر ہلایا تھا۔ لفظوں سے ناتا تو اس نے مروتا ہی رکھا ہوا تھا، اس کا بس چلتا تو وہ بھی نہ رکھتی مگر بہر حال جینا تو تھا، سو لفظوں سے رشتہ رکھنا، اس کی مجبوری ہی سہی۔ وہ اسی خاموشی کے ساتھ ارشد بھائی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی تھی حتیٰ کہ گھر کے کسی فرد تک کا نہ پوچھا تھا۔ بہت خاموشی سے سفر گزر رہا تھا لیکن صدر سے گزرتے ہوئے جانے اسے کیا یاد آیا کہ اس نے چونک کر ارشد بھائی کی طرف دیکھا تھا جو اسے ہی دیکھ رہے تھے اور یکدم مسکرا کر بولے تھے۔

”کھاؤ گی آکس کریم۔“ اس نے نفی میں سر ہلادیا اور ونڈو سے باہر دیکھنے لگی۔ آنکھوں میں پانی آ گیا تھا۔ ہر منظر دھندلا، دھندلا نظر آنے لگا۔

چار سال صرف اسی لیے اس نے یہاں کا رخ نہیں کیا تھا کہ پرانی یادیں زخم بن کر پھر سے اُبھر آئیں گی اور وہی ہوا۔ اس شہر بے مثال میں داخل ہوتے ہی اس راستے سے گزرتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ ان راستوں کا سفر وہ دن میں ایک بار ضرور کرتی تھی۔ اس کی رگوں میں خون کی طرح یہ راستے، یہ گلیاں رچی بسی تھیں۔ اس شہر نے اسے سب کچھ دیا تھا اور پھر اسی شہر نے اس کا سب کچھ چھین بھی لیا تھا۔

اپنے علاقے میں قدم رکھتے ہی اس کے کانوں میں آوازوں کی بازگشت گونجنے لگی۔ کسی کے قہقہے، شوخیاں، روٹھنا، گانا، منانا، لڑنا، ہر ہر آواز اس کے قدم جکڑنے لگی تھی۔

ارشد بھائی جیسے اس کی کیفیت جانتے تھے، اسی لیے اس کا ہاتھ تھام کر تسلی دی۔

گھر میں جیسے سب ہی بے تاب تھے، اسے دیکھنے کو۔ امی، بابا، سحاب، سحرش، بھابی اور طلال سب نے جی بھر کے اسے پیار کیا

لیکن اس کا وجود کسی پتھر کی مانند ساکت تھا۔

”سچ مجھے تو رات بھر نیند نہیں آئی جب سے اشعر نے فون کر کے بتایا کہ تم یہاں آ رہی ہو۔“ صحاب کی بے قراری پر اس نے مسکرا کے ساتھ دیا۔

بابا کتنی دیر تک اسے سینے سے لگائے رہے۔

”میں ابھی طیب اور کاشف کو بلا کر لاتا ہوں۔“ طلال نے فوراً ہی باہر کا رخ کیا۔ ریحان کی آنکھیں دروازے میں گڑھی گئیں۔

”طیب..... کاشف اور.....“ اس کا سر یکدم بری طرح چکرایا۔

”اوہو اتنا لمبا سفر کیا ہے، بھئی اسے بیٹھنے تو دو۔“ اس کو تھامتے ہوئے امی بولیں۔ گھر کا ہر فرد اس کی کیفیت جانتا تھا مگر کیا کرتے۔ ریحان نے خود کو صوفے پر گرتے ہی ڈھیلا چھوڑ دیا۔

”اشعر تو ٹھیک ہے ناں بچے۔“

”جی امی، وہ معذرت کر رہے تھے کہ آ نہ سکے۔“ یہ پہلا جملہ تھا جو گھر آنے کے بعد اس نے ادا کیا تھا۔

”انس اور ثوبان آنے والے ہیں اسکول سے۔ تمہارا سنا تو چھٹی کے موڈ میں تھے، زبردستی بھیجا تھا۔“ بھابی نے بتایا۔ بھتیجیوں کا ذکر اس کے چہرے پر اطمینان بھر گیا تھا۔

”تم فریش ہو جاؤ، میں ناشتہ لاتی ہوں۔“ بھابی کے کہنے پر وہ وہاں سے اٹھ گئی۔



وہ لیٹی تو کچھ دیر کے لیے ہی تھی مگر جب آنکھ کھلی تو سورج الوداع کہہ رہا تھا۔ وہ ہاتھ منہ دھو کر باہر آ گئی۔ بھابی اور صحاب شاید کچن میں تھیں۔ طلال اور مہوش ٹی وی کے سامنے بیٹھے تھے۔ طلال ٹی وی کمرشلز پر بیمار کس دے رہا تھا اور مہوش اس سے ایگری نہیں تھی۔ وہ بھی وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔

”دیکھو ناں ریحان یہ طلال صرف ہر چیز میں خامیاں ڈھونڈتا ہے۔ اسے کبھی پاکستانی چینلز میں کوئی خوبی نہیں ملتی۔“

”تو غلط کہتا ہوں کیا؟ اچھا ریحان تم اس ایڈ میں مجھے بتاؤ۔ کچھ بھی سمجھ آیا ہے، سراسر بکواس۔ پتا نہیں ہم لوگ کب اچھا کام کریں گے۔ یہ ملک کبھی آگے نہیں جاسکتا۔ نیورا!“ یہ شاید طلال کی حتمی رائے تھی۔ کیونکہ وہ تو سدا سے ہی پاکستان کی ہر چیز پر تنقید کرتا تھا لیکن اس کے کانوں میں تو کسی اور کے الفاظ گونج رہے تھے۔

”یہ ملک ترقی پذیر ہی اس لیے ہے کہ یہاں کے لوگ اس کی ترقی میں حصہ لینے کے بجائے بیٹھ کر صرف تنقید کرنا جانتے ہیں۔ اگر ان لوگوں کی نیت صاف ہو اور وہ اس کی تعمیر میں عملی حصہ لیں تو یہ ملک ترقی پذیر نہیں بلکہ ترقی یافتہ کہلائے گا۔“ کتنی پوزیٹو سوچ رکھتا تھا وہ اور طلال نے کتنے سخت الفاظ استعمال کیے تھے۔ وہ بحث کرنا چاہتی تھی مگر لفظوں نے تو اس سے لڑائی برسوں پہلے کر لی تھی، سودہ صرف



سوچ کر رہ گئی۔

سحاب نے سب کو چائے دی۔ وہ خاموشی سے چائے انجوائے کرنے لگی۔ تب ہی اشعر کی کال آ گئی۔  
”کیسی ہو ڈیئر۔“

”فائن..... تم کیسے ہو؟“

”تم بہت یاد آ رہی ہو۔“ وہ قدرے اداس لہجے میں بولا لیکن اس کا چہرہ احساسات سے خالی رہا تھا، بنا کسی تاثر کے۔ ”سفر ٹھیک سے گزرا؟“

”ہوں۔“ اس کے لب ہلے۔

”وہاں جا کر بھی اُداس ہو۔“ کتنا عجیب بے معنی سوال تھا۔

”میرے لیے یہاں بچا ہی کیا ہے۔“ وہ شاید بھول گئی تھی کہ اس کے پاس سب کچھ ہے، ہر رشتہ ہے مگر اس نے تو صرف ایک شخص پر ہی دنیا ختم کر دی تھی ناں۔

”تمہارے لیے تو میں بھی بے معنی ہوں۔“ اشعر کی سنجیدہ آواز ابھری۔ وہ کبھی اشعر کو جھوٹی تسلی تک نہ دے پائی تھی سواب کیا کہتی۔ اشعر نے تمام حقیقت سمیت خود اپنی مرضی سے اسے اپنا پا تھا۔ وہ تو صرف اسے اپنے فیصلے کی سزا دے رہی تھی شاید۔ چار سالوں میں پیار تو دور، وہ دل سے ایک مسکراہٹ تک اسے نہ دے سکی تھی۔

”تم آفس سے آ گئے۔“ اس سے اس سوال سے زیادہ کی امید رکھنا بے سود تھا۔ وہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔

”ہوں اوکے ڈیئر ٹیک کیئر، اللہ حافظ۔“ بسا اوقات اشعر بہت دلبرداشتہ ہو جاتا تھا جیسے اب۔“ اور اس نے مزید کچھ کہے بغیر لائن کاٹ دی اور وہ سیل ہاتھ میں تھامے گھورنے لگی۔

سحاب اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ ریحاب کو سمجھانا چاہتی تھی کہ ایسا کب تک چلے گا۔ اشعر کی خطا کیا تھی۔ اس نے تو تمہیں زندگی کی طرف واپس لانے کے لیے یہ فیصلہ کیا تھا اور تم..... جس کو جانا تھا وہ چلا گیا، وہ اب نہیں ہے۔ وہ کبھی آ بھی نہیں سکتا۔ پھر کیوں یہ حقیقت قبول نہیں کر لیتیں، مگر اس نے فی الوقت ریحاب سے کچھ بھی نہیں کہا۔

”ریحاب! شام میں پھوپھو کی طرف چلیں گے، بہت یاد کرتی ہیں تمہیں۔“ سحاب بولی تو وہ چونکی۔

”ہوں..... اوکے۔“ اتنا کہہ کر وہ وہاں سے اٹھی اور بھابی کے پاس کچن میں آ گئی۔



رات کے کھانے پرواک کے لیے جانا اس گھر کی پرانی ریت تھی۔ اس وقت بھی سب تیار تھے۔ وہ بھی ان کے ساتھ تھی۔ محلے کے پارک میں اس وقت اکثر لوگ ٹہلنے آتے تھے۔ یہ پل وہ لوگ ہمیشہ اچھی طرح انجوائے کرتے تھے۔ اس وقت بھی ان



سب کے ساتھ چلتے ہوئے وہ پرانی ہی یادوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ ایک ایک قدم اٹھاتے ہوئے اسے کسی کی آہٹ، ہزاروں شوخیاں، بے ساختہ ہنسی، ساری شرارتیں، مزے کے صدائیں دے رہی تھیں۔ وہ پلٹ کر دیکھتی تو کچھ بھی نہیں ہوتا تھا اور پارک تک پہنچتے پہنچتے وہ بالکل ہی ہار گئی تھی۔ اس سے مزید ایک قدم بھی اٹھانا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ بری طرح ہانپنے لگی۔

طلال کے ہاتھ میں تھا اس کا ہاتھ سرد پڑنے لگا۔

”تم ٹھیک تو ہو ریحا آپی۔“ تلال چلتے چلتے رک گیا۔

”بس تلال میں تھک گئی۔“ اس کی نظروں کے عین سامنے وہی بیٹھ تھا، جس پر بیٹھ کر وہ دن بھر کی باتیں شیئر کرتے تھے۔

”او کے ریلیکس، تم بیٹھ جاؤ۔“ اس نے ریحا کو بٹھایا تو آگے چلنے والے بھی رک گئے۔

”کیا ہوا؟“

”ریحا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے بس یہیں چہل قدمی کر لیتے ہیں، پھوپھو کی طرف کل چلیں گے۔“ تلال کے کہنے پر سب خاموش ہو گئے اور چہل قدمی کرنے لگے۔

”طلال تم بھی واک کر لو میں یہیں بیٹھی ہوں۔“

”او کے۔“ وہ اس کا ہاتھ تھپک کر اٹھ گیا۔

ریحانے بے حد تھکن کے احساس سے سر بیچ کی پشت پر دھردیا اور آنکھیں موند لیں۔ کتنے ہی منظر اس کے سامنے رقص کرنے لگے تھے۔

”بہت ستاتی ہو تم، کہاں تھیں اتنے دن سے۔“ قریب سے کوئی سرگوشی ابھری۔ اس نے تڑپ کر آنکھیں کھول دیں۔ لیکن

سامنے کچھ بھی تو نہ تھا سوائے ہوا میں بکھری اک مانوس سی خوشبو کے۔ تب اس سے برداشت نہ ہوا اور سیال مادہ آنکھوں سے بہنے لگا۔



پھوپھو سے مل کر وہ بالکل ہی بکھر گئی۔ انہیں دیکھ کر اندازہ ہوا تھا کہ ان کا نقصان کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ طیب اور کاشف کی محبتیں، اپنی جگہ مگر وہ شخص جو خلا چھوڑ گیا ہے، وہ کبھی نہیں بھر سکتا۔ پھوپھو تو کبھی بھی اسے نہیں بھول سکتیں۔

”کیا حال بنا لیا ہے آپ نے پھوپھو۔ خوش رہا کریں۔“

”میرے بچے میں کیا کروں۔ دل کو جیسے ایک روگ لگ گیا ہے۔ کسی خوشی میں اب خوشی نظر ہی نہیں آتی۔“ انہوں نے آنکھوں

کے گوشے صاف کرتے ہوئے کہا۔

”روگ تو لگ گیا ہے پھوپھو مگر جینا بھی ہے۔“

”ریحانے مجھے تو چھوڑ تم اپنی حالت دیکھو۔ بچے تمہارے آگے ساری زندگی پڑی ہے۔ وہ اب کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ تم زندگی

کو کیوں گنوار ہی ہو۔ ماضی بھول کر اپنا آنے والا کل سنوارو۔“

”پھوپو! وہ ماضی نہیں، میرا سب کچھ تھا۔ میرا حال، میرا مستقبل.....“

”ہاں! اگر وہ ہوتا تو، مگر اب وہ نہیں ہے تو وہ تمہارا صرف ماضی ہے۔ تمہارا حال، تمہارا مستقبل اشعر ہے ریحما۔“ طیب نے زبان کھولی۔ حالانکہ اسے کچھ کہنے سے سب ڈرتے تھے کہ طالب کے بعد ایک سال اس نے زندگی اور موت کی کشمکش میں گزارا تھا۔ یوں جیسے وہ سانس لیتی تھی مگر ایک بت کی مانند اور جب اس نے ہو لے ہو لے خود کو سنبھالا تو سب نے اس کے سامنے طالب کا نام تک لینا چھوڑ دیا تھا۔ وہ سب کو عزیز تھا۔ اس کے جانے کا دکھ ہر ایک فرد کو تھا مگر صرف اس لیے کہ وہ بمشکل دھیرے دھیرے جینے کی طرف لوٹ رہی ہے تو سب چاہتے تھے وہ پھر سے زندگی سے منہ نہ موڑے مگر وہ سننا، بولنا سب بھول گئی تھی۔

اشعر نے اس سے شادی کا فیصلہ کیا تھا۔ ایک تو وہ اسے چاہتا تھا دوسرا اس لیے کہ شاید وہ سنبھل جائے مگر چار سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اب وہ لوٹی تو ویسی ہی تھی۔ ذرا بھی تو بدلاؤ نہیں آیا تھا اس میں۔

”میں نے سب سے کہا تھا کہ یہ فیصلہ مت کریں۔ وہ کبھی میری زندگی، میری روح سے علیحدہ نہیں ہو سکتا مگر نہ اشعر نے میری بات مانی اور نہ آپ سب نے۔ پھر اب مجھے مجبور مت کریں۔ میں نے اپنی ذات اس کے نام پر ختم کرنی ہے اور بس۔“

”ریحما تم.....“

”طیب پلیز۔ مجھ سے مزید بحث مت کرو تم.....“ وہ شاید آگے کچھ بھی بول نہیں پارہی تھی تب ہی لب بھینچ گئی تھی۔



پھوپو کے گھر سے آنے کے بعد تو وہ بالکل ہی بکھر گئی تھی۔ یوں لگا چار سال درمیان سے کہیں چلے گئے ہوں۔ آنکھیں بند کیس تو سامنے وہی مسکراتا، چمکتی آنکھوں سے سے اسے دیکھتا کھڑا تھا۔ تب وہ اپنے آپ کو نہ روک پائی۔ اور ماضی کے در پیچے کھل بیٹھی۔

لاگی تم سے من کی لگن

لگن، لاگی تم سے من کی لگن.....!!

گلی گلی گھوے

دل تجھے ڈھونڈے!!

طالب بے حد سُر میں راحت فتح علی خان کا سونگ گارہا تھا، جب طیب نے آ کر اس کا سر ٹھونک دیا۔ کئی لمبے آنکھوں کے آگے اندھیرا رہا پھر کچھ حواس بحال ہوئے تو اس نے طیب کو گھورا۔

”میرا سُر تھا یہ جاہل آدمی، جسے تم نے کرکٹ بال سمجھ کر اڑا دیا۔“ طالب کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔

”سوری ڈیر برادر مگر آپ کی مستقبل قریب کی نصف بہتر کا یہی حکم تھا۔“ طیب ادب سے جھک کر کورنش بجالایا تو طالب کا دل

چاہا اسے بغیر بھونے ہی کھا جائے۔

”وہ نصف بہتر یا نصف بدتر اس سے تو میں ابھی جا کے پوچھ لیتا ہوں مگر تجھے شرم نہیں آئی، اپنے سے تین سال بڑے بھائی پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے۔ ڈوب کے نہیں مرے تم کسی مین ہول میں۔“ وہ بکتا جھکتا طیب کو حسب توقع نوازتا باہر نکلا تھا اور سارے راستے جھلاتا، وہ ماموں کی طرف پہنچا تو وہاں لاؤنج میں بھی سوگوار ماحول منتظر ملا۔ آنسو بہاتی منہ بسورتی اس کی نصف بہتر یعنی محترمہ ریحاب ضیاء بیٹی تھیں اور اس کی دونوں طرف مایوسی اور دکھ سے کچھ سوچتے، افسوس سے سر ہلاتے طلال اور بھابی بیٹھے تھے۔ سحاب اور مہوش قدرے لا پرواہی سے اپنا ہوم ورک کر رہی تھیں۔

طالب بھی عین اس کے سامنے آ بیٹھا اور ہاتھ کے اشارے سے کچھ جاننے کی سعی کی تو وہ رُخ پھیر گئی۔

”اللہ رے یہ ناراضگی۔ وجہ تو معلوم ہو کچھ۔“ وہ جو سارے راستے جھلاتا آیا تھا، اس کی صورت دیکھ کر سب بھول گیا مگر ریحانے اسے قطعی لفٹ نہیں کرائی۔ مجبوراً اسے اپنے سات سروں کو یاد کرنا پڑا۔

”دل تو میرا ہے تیرا

جان میری ہے تیری

پھر کیوں ناراض ہے

پھر کیوں ناراض ہے؟

تبلے، گٹار، ڈرم سارے انسٹرومنٹس کی جگہ ٹیبل بجاتے ہوئے وہ اشارت لے چکا تھا۔ ریحانے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

”تم ناراض ہو

میرے کتنے پاس ہو

نازک نازک سی پیاری پیاری سی

میرے جینے کی آس ہو

وہ باقاعدہ کچن سے تھالی اٹھالایا تھا۔ طلال تالیاں پیٹتے ہوئے اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ ریحاب نے سر تھام لیا۔

”اسٹاپ اٹ! تم سے کس گدھے نے کہہ دیا کہ میں خفا ہوں۔“

”پھر یہ خوبصورت چہرہ اس قدر پھولا ہوا کیوں ہے؟“ اس نے ترنگ میں پوچھا تو جواب اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

”سارا قصور تمہارا ہے۔ صرف تمہارا۔“ اس نے جرم بتائے بنا ہی اسے مجرم قرار دے دیا جس پر وہ ٹپ گیا تھا۔

”آخر کس چیز میں میرا قصور ہے منہ سے تو پھوٹو؟ یا رطلال تم ہی بتا دو کیا مسئلہ ہے؟“ اس نے براہ راست طلال کو مخاطب کیا جو

کب سے منتظر تھا کہ ابو طالب اس سے پوچھے اور وہ اشارت لے۔

”میری بہن اور آپ کی کزن یعنی ریحاب ضیاء ایک بار پھر اکناکس کے پیپر میں انک گئی ہیں۔“ طلال بہت مزیدار انداز میں بتانا چاہتا تھا مگر طالب کی کشادہ پیشانی پر کتنے ہی بل نمایاں ہو گئے۔

”واٹ؟ ستیاناس، تم میری ناک کنوا کر ہی خوش ہوتی ہے۔ بھلا اتنے ایزی سبجیکٹ میں رہ جانے کی تک ننتی ہے؟“

”ایزی..... طالب اتنا بکواس منحوس سبجیکٹ ہے جسے تم ایزی کہہ کر میری انسلٹ کر رہے ہو۔ میرا بس چلنا تو اس منحوس آدمی کو اپنے ہاتھوں مارتی جس نے یہ نحوست پھیلائی مگر اس نے صبر ہی نہیں کیا، پہلے ہی مر گیا۔“ ریحانے دل کی بھڑاس نکالی۔

”شرم کرو۔ دنیا انہیں بابائے اکناکس کہتی ہے۔ جانے کس گدھے نے تمہیں ایڈوائز کی تھی، اکناکس رکھنے کی۔ کیا کہیں گے لوگ کہ اکناکس کے پروفیسر کی زوجہ محترمہ اکناکس میں دو بار سلی دے چکی ہیں۔ کیا عزت رہ جائے گی میری۔“ طالب اچھا خاصا تپ گیا۔ اکناکس اس کا فیورٹ سبجیکٹ تھا اور ریحانے کو سدا سے ہی خدا واسطے کا بیر ہا تھا اس مضمون سے۔ اس کی تقریر پر ریحانے کو غصہ آ گیا۔

”تم نے ہی زبردستی مجھے اکناکس دلائی تھی، ورنہ میں تو دس دفعہ لعنت بھیج کر سائیکولوجی لے رہی تھی۔“ لمحہ بھر کو وہ گڑبڑایا تھا، اپنے آپ کو گدھا کہنے پر پھر قدرے ڈھٹائی سے اسے گھورا۔

”میں کراؤں گا اس بار تمہاری تیاری، بس۔“

”ہرگز نہیں۔“ وہ بری طرح اچھل پڑی۔ ”تمہارا خیال ہے کہ میں ایک بار پھر اس ڈل اور بور مضمون کو پڑھوں۔ سوری ڈیزر ابو طالب! اب ایسا ممکن نہیں۔ بے شک میرا گریجویٹیشن ان کمپلیٹ رہ جائے۔“ اس نے صاف الفاظ میں منع کیا تھا مگر وہ بھی ابو طالب تھا۔ ”تمہارے تو ابا حضور بھی پڑھیں گے، تم کیا چیز ہو۔“

”بہد شوق اگر بابا نے دوبارہ پڑھنے کا ارادہ کیا تو.....“ ریحانے دانتوں کی نمائش کی تو وہ بری طرح سلگ گیا۔

”تم جانتی ہوناں ریحانہ تمہیں اکناکس ہر حال میں کلیئر کرنی ہے۔ بی کو زتم نے ماسٹرز کرنا ہے اکناکس ہیں۔“ ”بھابی۔“ وہ بری طرح تڑپ کر بھابی سے لپٹ گئی۔ ”یہ ظلم ہے اور کچھ نہیں ابو طالب۔ تم مجھے جان سے مار دو مگر میں دوبارہ معاشیات کی کتاب دیکھوں گی بھی نہیں۔“

”جسٹ شٹ اپ ریحانہ! احق مت بنو۔“ وہ چیخا۔

”تم مجھے خاصا احق پہلے ہی بنا چکے ہو، سواتنا ہی بہت ہے، اب مزید نہیں۔“

”پھر کہتے ہیں ملک ترقی نہیں کرتا، ارے جس ملک میں تم جیسے نکلے اور تعلیم سے بھاگنے والے لوگ موجود ہوں گے، وہ خاک آگے بڑھے گا۔ کسی ملک کی ترقی میں اس ملک کی معاشیات اہم کردار ادا کرتی ہے اور.....“

”اچھا بس۔“ ریحانے ہاتھ جوڑے۔ ”ایڈم اسمتھ بننے کی کوشش مت کرو، میں بابا سے کہہ دوں گی کہ مجھے آگے نہیں پڑھنا اور

اگر تمہیں اتنی ایجوکیشن کے ساتھ مجھ سے شادی پر اعتراض ہے تو کسی اکناکس کی لیکچرار کے ساتھ بیاہ چالینا، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“



”آئی ول کل یو ریحا۔“ اتنا شدید دماغ اُبلتا تھا کہ وہ ضرور ایک آدھا اسے لگا دیتا اگر وہ بھابی کی آغوش میں نہ دبکی ہوتی۔ یقیناً اب ان کی لڑائی سنجیدہ ہو چکی تھی تب ہی طلال نے مداخلت ضرور سمجھی تاکہ طالب کا موڈ مزید نہ بگڑے۔

”چل دفع کرناں یار، اچھا ہی ہے۔ زیادہ پڑھی لکھی بیوی بھی سرکھاتی ہے اور ریحا تو ویسے ہی ماشاء اللہ تمہیں بچ کر کھا جائے گی۔ ایم اے کر لیا تو سب سے پہلے تمہاری معاشیات کا بیڑہ غرق کرے گی۔“

”عورت ے لیے تعلیم بہت ضروری ہوتی ہے طلال کیونکہ اس نے آنے والی نسل کی تربیت کرنی ہے اور ایک باشعور، پڑھی لکھی عورت ہی ہماری نسل کو بہتر پروان چڑھا سکتی ہے۔ اس ملک کو، ایسی نسل ہی چاہیے۔ دنیا میں آگے، بہت آگے جانے کے لیے۔“ اس نے نئی بحث کا آغاز کر دیا جس پر ریحاب دانت کچکچا کر رہ گئی۔

”طالب پلیز بس کر دو۔“

”شٹ اپ ریحاب اور پلیز تم مجھ سے بات نہ کرو تو بہت اچھا ہے۔“ وہ یقیناً بہت سنجیدہ تھا۔ ریحا جانتی تھی کہ اس کی تعلیم کے لیے وہ بہت کڑی تھا۔ بلکہ وہ تو ہر انسان کی تعلیم کے لیے یوں ہی پاگل تھا۔ یہاں تو پھر سوال اس کا تھا، جس سے اس کا مستقبل وابستہ تھا، اس کی آنے والی نسل کا مستقبل وابستہ تھا۔ اس کے لیے وہ کبھی کمپر و مائر کر ہی نہیں سکتا تھا، کبھی نہیں۔

”کاش تم میرا پیپر دے سکتے۔“ وہ اس کی خفگی سہہ نہیں سکتی تھی اس لیے مرل انداز میں بولی تو طالب بھی نرم پڑ گیا۔

”پیپر نہیں دے سکتا لیکن تیاری تو کر سکتا ہوں، تمہیں پڑھا تو سکتا ہوں۔ دیکھو ریحا، تم دل سے معاشیات پڑھو اور تمہارے اندر جو اس سبکیٹ کو لے کر چڑھتا ہے اسے نکال دو۔ آئی بلیو، تم ضرور کلیئر کرو گی۔“ وہ غصہ بھول کر اسے سمجھانے لگا۔

بات تو ریحا کو ہر حال میں اس کی ماننی تھی کیونکہ ایجوکیشن کے معاملے میں بابا بھی اپنے بھانجے کی طرح سخت تھے سو مرنی کیا نہ کرتی، اسے ماننا تو بہر حال تھا۔

”او کے مگر ایک شرط ہے تم مجھے ابھی آئس کریم کھلا کر لاؤ گے۔“

”جان بھی مانگو گی تو مان لوں گا مگر.....“

”ماسٹرز کرنا ہے۔“ ریحانے اس کی بات مکمل کی۔

”ڈٹس رائٹ اے گڈ گرل! چلو چلتے ہیں۔“

”امی سے پوچھ لو۔ پیپر رہ جانے پر Punish ملی ہے مجھے۔ باہر کہیں بھی جانا بند۔“ ریحانے منہ بسور تو وہ مامی کے پاس کچن میں چلا آیا اور ہاتھ پکڑ کر انہیں باہر لاؤنج میں لے آیا۔

”مامی میرا وعدہ ہے آپ سے کہ اس بار یہ معاشیات میں کلیئر ہوگی۔ میں ذمہ داری لیتا ہوں مگر آپ اتنی ظالم تو نہ بنیں۔ کیوں آپ نے اتنی نازک سی لڑکی کو باندھ کر رکھا ہے۔ جانے دیں ناں ہمیں۔“

”کہاں؟“

”آکس کریم کھانے۔“

”طالب تم نے ہی بگاڑا ہے اسے اتنی فیور لے کر۔“ وہ بگڑیں۔

”بھگلتا بھی تو مجھے ہی ہے ناں، ڈیڑہ مای۔ یو ڈونٹ وری۔ اس لڑکی کو اب میں سیدھا کروں گا۔ بس آج جانے دیں۔“

”اچھا مگر آدھے گھنٹے کے لیے۔“

”مای خود انصاف کریں۔ آپ کی دختر آکس کریم بھی صدر کی پسند فرماتی ہیں اگر میں تیز بائیک بھی چلاؤں تو میں منٹ لگ

جائیں گے اور.....“

”بس بس تقریر نہیں، صرف ایک گھنٹہ، مزید ایک منٹ بھی نہیں۔“

وہ جانتی تھیں کہ اس نے پورا ٹائٹ ٹیبل گنوا دینا تھا سو فوراً ہی بول پڑیں۔

”یا، ہو! مائی سویٹ مای! آپ اتنی اچھی ہیں تب ہی تو ماموں اتنا چاہتے ہیں آپ کو۔ بلیومی، ایک گھنٹہ سے زیادہ نہیں۔“ اس

نے انہیں گھورا تھا۔

”تمہیں ذرا شرم نہیں ہے طالب، ہٹو پرے۔“ وہ خود کو چھڑا کر چلی گئیں۔

”میر لیے لانا مت بھولنا۔“ طلال نے آرڈر دیا۔

”تیری بیگم کے باپ کا مال ہے ناں میری جیب میں، جوتنا پھروں۔“ کورا جواب دے کر وہ باہر نکل گیا، طلال ناک منہ بنا کے رہ گیا۔



اس نے کالج کے کھلے گیٹ کے باہر قدم رکھا ہی تھا جب پسینے سے شرابور بائیک سے ٹیک لگائے وہ کھڑا نظر آیا۔ شاید اس کی نظر

بھی ریمارک پر پڑ گئی تھی تب ہی وہ بائیک اشارت کرنے لگا۔

”حد ہو گئی پورے پچیس منٹ ہو گئے مجھے یہاں ذلیل ہوتے ہوئے اور محترمہ اب تشریف لا رہی ہیں۔ اندازہ ہے تمہیں مئی کا

مہینہ چل رہا ہے۔ کس قدر گرمی ہوتی ہے اس وقت۔“ وہ تقریر شروع کر چکا تھا ریمارک نے اکتائے ہوئے انداز میں اسے دیکھا پھر

چہرے پر آ یا پسینہ صاف کرتی بائیک پر نکل گئی۔

”تمہاری تقریر کا دورانہ بھی چند منٹ پر محیط ہو چکا ہے۔ اب تمہیں گرمی نہیں لگ رہی۔“ اس کے اطمینان پر طالب نے کھا

جانے والی نظروں سے اسے دیکھا اور بائیک اشارت کر دی اور ان کے گھر کے عین سامنے لا کر ہی بریک ماری۔

”اترو، مرواب۔“

”اور تم اتنی گرمی اور خراب حالت میں گھر جاؤ گے۔ چلو اندر۔ کچھ دماغ ٹھنڈا کر لو پھر جانا۔“ ریمارک ضیاء سے مزید بحث کرنے

کے بجائے وہ اتر کر اس کے ساتھ آ گیا۔

”اُف تو بہ یار۔ اتنی گرمی۔“ اندر آتے ہی وہ طلال کی گود میں گر گیا جو خود بھی ابھی کالج سے لوٹا تھا۔ اس کی اپنی حالت بھی بدتر تھی۔

”تو میرے گلے کا ہار مت بن۔ مارے گا کیا مجھے۔“

”میں تمہارے لیے لیموں پانی لاتی ہوں، تم اپنی پسینہ خشک کرو۔“ بھابی نے اسے پسینے سے نہاتے دیکھ کر کہا۔

”یار تم اٹھ کر نہالو۔“ طلال نے کہا۔

”نہا تو گیا ہوں پورے کا پورا۔“

”صاف پانی کا غسل لے لو، ورنہ ہم سب مرجائیں گے۔“ اس نے ناک پکڑی۔

”وماغ تو ٹھنڈا ہونے دو۔“ وہ پچھلے کے عین نیچے آ بیٹھا۔ سردرد سے ٹیسس اٹھنے لگی تھیں۔

”آئی ایم سوری طالب! میری وجہ سے تمہیں اتنی گرمی میں آنا پڑا۔“ وہ فریش ہو کر آئی تو طالب کو اپنا سر پکڑتے پا کر بولی۔

”اٹس اوکے یار۔“ کتنی افسوس کی بات تھی کہ وہ اکثر اس کے ساتھ زیادتی کر جاتی تھی مگر مجال تھا جو وہ پرمانتا ہوئی ابھی غصے میں آتا ہو۔

”کبھی کبھی میں بہت سیلفش ہو جاتی ہوں حالانکہ میں خود سے آ سکتی تھی مگر پھر بھی جان بوجھ کر تمہیں پریشان کیا۔“

”کم آن ریجا، کس طرح بی ہو کر رہی ہو تم۔ اگر ہم ایک دوسرے کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتے تو کیا فائدہ اس رشتے کا جو ہم میں

ہے۔ تم میری کزن ہو، فرینڈ ہو یا ر، اتنا تو میں تمہارے لیے کر ہی سکتا ہوں ناں اور پھر انسانیت کے ناطے ایک دوسرے کے کام آنا ہمارا فرض ہے۔“

”اور اب جو تمہارے سر میں درد ہے وہ.....“

”وہ تو گرمی سے ہے اور یو نو گرمی کے موسم میں یہ درد تو مجھے رہتا ہی ہے۔ لیکن اس کی ذمہ دار تم تو نہیں ہو۔ میں گرمی برداشت

نہیں کر سکتا۔ یہ میری کمزوری ہے۔“

”ہاں لیکن میں جانتی تھی کہ گرمی سے تمہاری طبیعت اکثر خراب ہو جاتی ہے پھر بھی ضد کی۔“

”آج خیر ہے ناں، بڑی ہمدردی ہو رہی ہے تمہیں مجھ سے۔“ اب اس کے لبوں پر شریری مسکراہٹ تھی۔

”کیوں صرف تمہیں ہی میرا خیال ہے۔ میں تمہارے لیے نہیں سوچ سکتی۔“

”آف کورس، صرف تم ہی میرے لیے سوچ سکتی ہو اور سوچو، کیونکہ میں گھر جا رہا ہوں۔“ یکدم ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”کھانا کھا کر چلے جانا۔“

”اول ہوں، امی ویٹ کر رہی ہوں گی۔ اوکے گڈ بائے۔“

”بائے اینڈ تھینک یو۔“ طالب نے مسکرا کے اسے دیکھا اور ہاتھ ہلاتا باہر نکل گیا۔

وہ اس کا پھوپھی زاد تھا۔ یوں تو وہ خاندان کے ہر فرد کا ہی خیال رکھتا تھا کیونکہ اوپر والے نے اس کے اندر رحم، ہمدردی جیسے جذبات کوٹ وٹ کر بھرے تھے مگر ریحاب ضیاء کی ہر بات وہ حکم کی طرح ماننا تھا۔ یہ بات کسی سے قطعی چھپی ہوئی نہیں تھی۔ سب بخوبی جانتے تھے اور وہ چھپانے کا قائل تھا بھی نہیں، تب ہی تو جب اس نے محسوس کیا ریحاب ضیاء اس کے لیے کزن اور دوست دونوں سے بڑھ کر کچھ اور ہے تو اس نے دیر نہیں کی تھی امی سے کہنے میں اور ضیاء احمد کا تو وہ چہیتا بھانجا تھا۔ وہ کیسے منع کرتے..... یوں سادگی سے ان کی متنگنی کی رسم ادا کر دی گئی۔

ریحاب کو وہ ہر لحاظ سے پسند تھا کیونکہ ابو طالب میں واقعی ایک اچھا انسان ہونے کی تمام خوبیاں موجود تھیں۔ ہاں بعض عادتیں ریحاب کو اس کی خوبی سے زیادہ بیماری لگتی تھیں، جیسے ہر شخص کے لیے ضرورت سے زیادہ فکر کرنا اور اس کی ایمانداری، جس پر وہ ایک لفظ سننا برداشت نہیں کرتا تھا مگر ریحاب بھی عادت سے مجبور تھی۔ جب تک اسے ٹوک نہ لیتی اسے بھی سکون نہیں ملتا تھا۔ حالانکہ وہ جانتی تھی سب بے سود ہے۔ ابو طالب کو بدلنا ممکن نہیں۔



”بھابی پلیز! آپ اس بد دماغ لڑکی کو سمجھائیں کہ ہم یہاں اپنے ملک میں رہ کر بھی کامیاب زندگی گزار سکتے ہیں۔ پھر کیوں یہاں سے باہر جائیں محض پیسے کمانے کے لیے۔“

”مگر تمہیں تو چانس مل رہا ہے، میں زبردستی تو نہیں بھیج رہی ہوں تمہیں۔ آفر ہے تو ضرور جاؤ۔ دو تین سال کی تو بات ہے..... یو۔“

نوطالب، یہ تین سال تمہاری لائف بدل سکتے ہیں۔“

اس نے اپنی بات پر ڈٹے رتے ہوئے کہا مگر طالب اس سے قطعی انگری نہیں تھا۔

”ریحاب! تین سال کم نہیں ہوتے۔ تین سال میں بہت کچھ بدل سکتا ہے۔ اتنے عرصے میں یہاں انٹھک محنت کروں تو.....“

”تم اچھی طرح جانتے ہو ابو طالب کہ تم تین کیا تیس سال بھی یہاں اپنی جان لگا کر کام کرو تو تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا، سوائے

ڈینی ٹینشن کے۔ اس ملک میں صرف بے ایمان اور کرپٹ لوگ ترقی کر سکتے ہیں، تم جیسے ایماندار اور سچے انسان کے لیے یہاں صرف

مشکلات ہیں اور بس۔“ وہ غصے سے بولی۔ ابو طالب نے سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”تم اپنے ملک کے لیے اتنی چھوٹی سوچ رکھتی ہو۔ یہ محبت ہے تمہیں اس مٹی سے۔“

”محبت ہے مجھے اس ملک سے، اسی لیے تو دکھ ہوتا ہے اس کا یہ حال دیکھ کر۔ دل دکھتا ہے جب ہم جیسے لوگوں کو اس ملک

میں..... طالب پلیز! تم آنکھیں بند کر کے جب تک چاہو جی سکتے ہو۔ اپنے ان خوابوں کو لے کر مگر ہم آنکھیں کھول کر جیتے ہیں۔ تب ہی تمہیں کہہ رہے ہیں۔ فار گاڈ سیک! اپنے سر سے یہ جنونی محبت کا بھوت اتار کر دیکھو۔ یہاں تمہارا کوئی فیوچر نہیں ہے۔ پلیز! اس آفر کو



ہاتھ سے مت جانے دو۔“

”ریحنا ٹھیک کہہ رہی ہے طالب۔ اتنی اچھی آفر کو یوں مت ٹھکراؤ۔ ایسے مواقع بہت کم ملتے ہیں۔“

”طلال تم بھی.....“ طالب نے صدمے کی حالت میں طلال کو دیکھا۔ ”یہ تو نا سمجھ ہے لیکن تم تو یار.....“

”یہ محض کتابی باتیں ہیں طالب۔ زندگی ان کے سہارے نہیں گزاری جاتی ہے۔ ٹھیک ہے ہمیں بھی اس ملک سے محبت ہے۔ میں تمہاری سوچ کی قدر کرتا ہوں۔ تم ان تین سالوں میں جو کماؤ گے اس کے بعد یہاں آ کر تم اپنے ملک میں اپنا وہ تجربہ لگاؤ۔ ساری عمر یہیں رہنا ہے تمہیں۔“

”بہت افسوس ہو رہا ہے مجھے ضیاء ماموں کے بچے یہ سوچ رکھتے ہیں۔“ اس نے افسردگی سے کہا۔

”ہاں تو بابا نے کیا پایا ہے اس حب الوطنی اور ایمانداری سے۔“ ریحاب نے جذباتی انداز میں کہا۔

”کیا؟ ریحاماموں نے تم لوگوں کو کبھی کسی چیز کی کمی ہونے دی۔ ہر نعمت دی ہے انہوں نے، تم لوگوں کی ہر خواہش پوری کی ہے۔ اسی ملک میں رہتے ہوئے، اپنی ایمانداری کے ساتھ۔ لاکھوں لوگوں سے اچھی زندگی گزار رہے ہو تم لوگ۔“

”مگر اتنا عرصہ اگر بابا کسی دوسری کنٹری میں محنت کرتے تو ہم شاندار گھر بنا سکتے تھے، گاڑیاں ہوتیں ہمارے پاس اور اب صرف یہ پانچ مرلے کا عام سا گھر، ایک سیکنڈ ہینڈ گاڑی، وہ بھی اب ارشد بھائی نے لے لی ہے۔ مجھ سے ایسی زندگی نہیں جی جاتی۔ یہاں بھی اور پھر شادی کے بعد بھی، گھٹ گھٹ کر، اپنی خواہشات مار کر جینا۔ بس تم باہر جاؤ گے۔“

”میں کہیں نہیں جا رہا اور اگر تمہیں لکھوری لائف چاہیے تو تم جیسے چاہو زندگی گزار سکتی ہو۔ اپنی ایمانداری کو داؤ پر لگا کر میں کبھی بھی تمہاری خواہشات پوری نہیں کر سکوں گا۔ یہ بات میں ابھی کلیئر کر دیتا ہوں۔ سو میرا یہ فیصلہ ہے کہ میں تم سے دستبردار ہوتا ہوں تاکہ تم ساری عمر گھٹ گھٹ کر زندگی نہ گزارو۔ آج کے بعد ہم صرف کزنز ہیں اینڈ enough۔“ وہ بہت سنجیدہ تھا۔ اس کے بچنے لب، پیشانی کے بل اور چہرے کی سختی گواہ تھی کہ وہ جو کہہ رہا ہے، اسے کرنے کا پورا عزم بھی رکھتا ہے۔ ریحاب تو جذباتی تھی، بے سوچے سمجھے بولتی تھی مگر بھابی جانتی تھیں کہ طالب اس وقت بہت غصے میں آ گیا ہے۔

”طالب تم اس کی فضول سی بکواس پر کیوں اپنا بلڈ پریشر ہائی کر رہے ہو۔ تم وہی کرو جو تم بہتر سمجھتے ہو، کیونکہ مستقبل تو تمہارا ہے نا۔“ بھابی معاملہ سنبھال رہی تھیں مگر ریحاب جانے کیا سوچے بیٹھی تھی۔

”بھابی صرف اس کا نہیں، مستقبل میرا بھی ہے۔ آپ اسے سمجھانے کے بجائے اس کی سائیڈ لے رہی ہیں۔“

”ریحاب چپ کرو تم۔“ بھابی نے اسے ڈانٹا، تب ہی امی بھی وہاں کی صورتحال دیکھ کر آ گئیں اور طالب کا سرخ ہوتا چہرہ انہیں

فکر مند کر گیا۔

”کیا ہوا، کیا مسئلہ ہے؟“

”مائی، آپ کی بیٹی کا مستقبل میرے ساتھ صرف خراب ہو سکتا ہے اس لیے آپ اس کے لیے کسی ایسے شخص کو تلاش کریں جو کروڑوں کے بنگلے اور چار پانچ گاڑیاں رکھتا ہو کیونکہ میں اس کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں کر سکتا۔“ وہ اپنی بات مکمل کر کے رکھا نہیں تھا۔ طلال اس کے پیچھے بھی گیا مگر وہ غصے میں تھا۔ امی الگ ہر اسات ہو گئی تھیں۔ مذاق تو وہ کرتا رہتا تھا۔ رینا کی اور اس کی جھڑپ بھی ہوتی رہتی تھی مگر وہ کبھی اتنا غصہ نہیں کرتا تھا اور ان کے ساتھ اس طرح کی بات، وہ بھی اتنے سخت لہجے میں۔ انہیں نے رینا کو دیکھا، جو خود بھی غصے میں تھی اور پیر پختی اندر کمرے میں چلی گئی تھی۔

طلال افسوس سے سر ہلانے لگا۔ ابو طالب اور اس کی سوچ بھی مختلف تھی اس لیے اکثر وہ بحث سے گریز کرتا تھا مگر رینا نے آج جو بھی کہا، وہ سراسر غلط تھا اور طالب کا غصہ بالکل جائز تھا۔



یہ محض رینا کا گمان تھا کہ یہ طالب کا وقتی غصہ ہے، جب بھوت اتر جائے گا تو اسے منانے آئے گا لیکن جب اگلے ہی دن پھوپھو آئیں تو وہ حیران رہ گئی۔ پھوپھو بہت پریشان تھیں۔

”کل سے میرا دل بہت پریشان ہے۔ آخر ایسا کیا ہو گیا ہے..... وہ تو شادی سے صاف منع کر رہا ہے۔ وہ تو اتنا خوش تھا اور اب اس نے حتمی فیصلہ کیا ہے کہ اگر آپ زبردستی بھی رینا سے میری شادی کرنا چاہیں تو میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔“

”کیا؟ اللہ میں کیا کروں ان بچوں کا۔ آپا ان دونوں میں بھی بحث ہوئی ہے کسی بات کو ایسا بھنا کے۔ میں اور صوفیہ تو کل سے اسے ڈانٹ رہے ہیں کہ.....“

”بات کیا ہوئی تھی؟“ پھوپھو نے اب صوفیہ کی طرف دیکھا۔ انہوں نے ساری روداد گوش گزار کر دی۔

”رینا سے مجھے ایسی امید نہیں تھی۔ جب سے طالب نے مجھے یہ بتایا تھا کہ اسے باہر جانے کی آفر ہوئی ہے، میں دل میں خوفزدہ تھی کہ کہیں وہ حامی نہ بھر لے مگر میرا بچہ اچھی سوچ رکھتا ہے پر رینا ایسا کیوں چاہتی ہے۔ کیا وہ نہیں چاہتی طالب اس کی نظروں کے سامنے رہے۔ ارے باہر چلا گیا تو دن رات پریشانی میں گزریں گے کہ جانے کیسا ہوگا۔ یہ فکر ہی مجھے بیمار کر ڈالے گی۔ اللہ کا شکر ہے کہ شام میں بچے گھر آ جاتے ہیں۔ دل بے سکون رہتا ہے۔ بھاڑ میں جائے ایسا روپیہ پیسہ جو آسائش تو دے مگر دلی سکون نہ دے سکے۔“ پھوپھو بھی اپنے بیٹے کے حق میں تھیں۔ خود اس کے گھر کے سب افراد بھی یہی چاہتے تھے مگر.....!!

”اب تم مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔ یہ لڑکا تو باؤلا ہو گیا ہے۔ کیسے سمجھاؤں اسے۔ میرا خیال ہے ارشد سے کہو کہ وہ بات کرے خواہ مخواہ اگر ضیاء احمد کو علم ہوا تو اسے دکھ ہوگا۔ طالب کو بہت پیار کرتا ہے وہ۔ میں اپنے بھائی کو دکھی نہیں کرنا چاہتی۔“

”آپا غلطی رینا کی ہے، آپ اسے بھی سمجھائیں۔“ امی طالب کی حامی تھیں۔ پھوپھو نے اسے بلا کر اچھی طرح کلاس لی تھی اس کی۔

”کتنی قدر ہے ہم مسلمانوں کی ان باہر کے لوگوں کی نظر میں یہ تو تم جانتی ہو ناں رینا۔ صرف چار پیسے زیادہ کمانے کے لیے تم

چاہتی ہو وہ اپنی عزت نفس بچ دے۔ بیٹا جو عزت ہماری یہاں اپنے وطن میں ہے ناں، وہ کہیں نہیں مل سکتی۔ وہ بھی آج کے وقت میں جب یہودیوں نے مسلمانوں کو بدنام کر ڈالا۔ ارے وہ ہمیں دہشت گرد کہتے ہیں، امن کا دشمن سمجھتے ہیں، ہم مسلمانوں کو۔ جن کا دین، امن کا علم بلند کرنے کے لیے بنا ہے وہ ہمارے اسلام کے دشمن ہیں۔ ہمارے دشمن ہیں۔ تم انہیں اپنا خیر خواہ کہتی ہو۔“

”اور پھوپھو یہ دہشت گردی، یہ قتل عام جو ہمارے ملک میں ہو رہا ہے، ہمارے اپنے اسلامی ملک میں جو مسلمان بے گناہ مارے جا رہے ہیں اور انہیں مارنے والے اور کوئی نہیں، خود ہمارے اپنے مسلمان بھائی ہیں، یہ فرقہ پرستی کے نام پر جو.....“

”یہ سب یہودیوں کی سازش ہے بچے، وہ ہمیں کمزور کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں آپس میں لڑا کر ہمیں کمزور کر رہے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں اسلام کی طاقت کو، مسلمان کی طاقت کو اور بچے اگر تمام مسلمان یہ بات سمجھ لیں اور ایک ہو جائیں تو دنیا میں ایک دن میں اسلام کا بول بالا ہو جائے مگر جانے ہمیں کیا ہو گیا ہے۔ ہم کیوں بھول گئے کہ ہمارے پیارے رسول ﷺ نے ہمیں کیا بتایا تھا۔“

”تو پھوپھو ہم یہ بات کیوں نہیں سمجھتے، کیوں ہم ان کے کہنے پر ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں، جبکہ ہم سب جانتے ہیں کہ وہ ہمارے سب سے بڑے دشمن ہیں۔“

”یہ ہی تو المیہ ہے ریحنا، کاش پیسے کی چکا چونڈ کو ہم آنکھوں سے دور کر کے اس وطن کے لیے سوچیں۔ وہ تو ہمیں چمک دکھاتے ہیں پیسے کی۔ یہ تو ہماری کمزوری ہے جو ہم بھٹک جاتے ہیں اور ریحنا تمہارے بابا نے ہمیشہ ایمانداری اور سچائی کے ساتھ زندگی گزاری ہے۔ انہوں نے صرف اپنی محنت، اور حلال کی کمائی کا لقمہ تمہارے منہ میں ڈالا ہے۔ کیا تم نہیں چاہتیں کہ تمہارے بچوں کو جو بھی تم دو وہ کم بے شک ہو مگر حلال ہو۔ بچے! دولت کی صرف چار دن کی چمک ہے لیکن ایمانداری، سچائی اور محنت سے اگر تم اپنے بچوں کی تربیت کرو گی تو تمہیں اس کا پھل ضرور ملے گا۔ زندگی میں صرف پیسہ کام نہیں آتا بچے، اچھی تربیت کام آتی ہے۔ آنے والے کل میں تمہارے بچے ایک اچھا اور ایماندار انسان بن کر، جب تمہارا نام روشن کریں گے تو تمہیں فخر ہوگا ان پر۔“

”آئی ایم سوری پھوپھو۔“ وہ واقعی شرمندہ تھی کہ بابا جیسے انسان کی بیٹی ہو کر وہ کتنا غلط سوچتی تھی۔ اس نے کتنا ہرٹ کیا تھا طالب کو اپنی باتوں سے۔

”مجھ سے نہیں، سوری اس سے کرو، جس کا دل تم نے دکھایا ہے۔ کل سے ایک پل وہ سکون سے نہیں بیٹھا۔ بہت بُرا لگا ہے ریحنا اسے۔“ انہوں نے دھیرے سے کہا۔ وہ سر ہلا گئی مگر وہ کیسے جائے گی اس کے سامنے..... سراسر اس کی غلطی تھی۔ اسے ایسی بکواس نہیں کرنی چاہیے تھی۔ صرف پیسے اور آسائش کے لیے وہ اسے فورس کر رہی تھی۔ سب سے اتنا دور جانے کو۔ ارشد بھائی نے نا صرف طالب کو سمجھایا تھا، ریحنا کو بھی خوب ڈانٹا تھا۔

”مجھے تو حیرت ہو رہی ہے کہ اس نا سمجھ لڑکی کو سمجھانے کے بجائے تم اتنا بڑا اور غلط فیصلہ کر رہے تھے، جس سے صرف تمہیں ہی نہیں، دونوں خاندانوں کو تکلیف پہنچی تھی۔“



”ارشد بھائی میں نے بہت سمجھایا تھا اسے مگر یہ سنتی تب ناں۔“

”تو دو تھپڑ لگاتے اسے، کوئی اعتراض نہ کرتا۔ اس کی بے وقوفی کی وجہ سے بابا اور پھوپھو کو ہرٹ کرنے جا رہے ہوتے۔ اتنی بڑی نہیں ہے یہ جو اس کا فیصلہ مانا جائے۔ تم سے چھوٹی ہے۔ اس کی اچھی، بری عادت پر اسے ڈانٹنے کا تمہیں حق ہے طالب۔ ناں کہ تم بھی بچوں کی طرح بی ہو کرو۔“ ارشد بھائی کے مزاج سے سب ہی سمجھتے تھے۔

”سوری ارشد بھائی۔“ اس نے سر جھکا کے کہا۔

”اور ریحا اگر میں نے آئندہ تمہاری کوئی شکایت سنی تو بری طرح پیش آؤں گا۔ طالب اگر تمہاری بدتمیزی برداشت کر لیتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ تم اسکے سامنے زبان درازی کرو۔ یہ تم سے بڑا ہے۔ میں نے آج کے بعد تمہیں اس کے ساتھ تیز لہجے میں بات کرتے سنا تو اچھا نہیں ہوگا۔ مذاق، شرارتیں اپنی جگہ مگر عمر اور رشتوں کا لحاظ بھی رکھنا چاہیے۔“

”جی..... بھیا.....“ اس کی مری مری آواز نکلی۔

”اب جاؤ یہاں سے۔ آئندہ ایسی بدتمیزی نہ ہو۔“ اس نے جلدی سے سر ہلایا اور باہر بھاگی۔ ارشد بھائی نے طالب کو دیکھا جو بہت سنجیدہ بیٹھا تھا۔

”طالب تمہاری سوچ بہت اچھی ہے، تم اپنی دانست میں بالکل ٹھیک فیصلہ کر رہے ہو۔ ریحا کا ذہن ابھی کچا ہے۔ وہ ابھی ان باتوں کی گہرائی نہیں سمجھتی، جو ہم جانتے ہیں اور اس عمر میں بچیاں ایسے ہی اُلٹے سیدھے خواب دیکھتی ہیں۔ تم میچور ہو، اس دھیرے دھیرے سمجھاؤ، قائل کرو۔ وہ تمہاری ہر بات مانتی ہے۔ ناظم لگے گا مگر مجھے یقین ہے وہ سمجھ جائے گی۔ تم اسے اپنی سوچ میں ڈھال سکتے ہو مگر اپنے غصے کو کنٹرول کر کے۔ مجھے اور بابا کو فخر ہے کہ ہم نے ریحا کا مستقبل بہت مضبوط ہاتھوں میں دیا ہے۔“

”تھینک یو بھیا۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ وہ ابھی نا سمجھ ہے۔“ اس نے ارشد بھائی سے اتفاق کیا۔

”دیکھو طالب! تم جانتے ہو وہ اکناکس پڑھنا نہیں چاہتی تھی مگر تمہارے سمجھانے پر، تمہارے پڑھانے سے اب وہ دل لگا کر اکناکس پڑھ رہی ہے۔ تم جانتے ہو ناں کہ اسے قائل کرنا ہے، پھر یہ نا سمجھی کیوں؟ وہ ضدی اور جذباتی ہے لیکن تمہارے لیے اچھا ہی سوچتی ہے۔“

”آئی نو۔“ اس نے سر ہلایا۔

”پلیز دوبارہ اس طرح سب کو پریشان مت کرنا۔ تم دونوں کی سوچ کی لڑائی، گھر پر اثر انداز نہ ہو۔ ہاں ریحا کو کیسے سمجھانا ہے، یہ تم پر ڈیپنڈ کرتا ہے اور ہاں ضرورت سے زیادہ نرمی بھی تمہارے لیے غلط ہے۔ اس کو ڈانٹا کرو۔“

”جی بہتر۔“

ریحان خیا کو ڈانٹنا! ابو طالب سے وہ ڈانٹ کھا سکتی تھی۔ لٹا اس کا ہی سر کھا جانے والی مخلوق تھی وہ۔ ہاں یہ بھی سچ تھا کہ یہ فائدہ



وہ اس کی ضرورت سے زیادہ نرمی سے اٹھاتی تھی۔ ابوطالب نے کبھی اسے نہیں ڈانٹا تھا۔ بس جانے اس دن اُسے کیوں غصہ آ گیا تھا۔



یوں تو وہ اس سے خفا نہیں تھا مگر ایک انجانی سی خاموشی تھی جو اس کے مزاج میں اتر گئی تھی۔ وہ پہلے کی طرح سب سے بولتا تھا، ہنستا تھا مگر پھر بھی، کہیں نہ کہیں، کچھ ایسا ضرور تھا جو پہلے کی طرح نہیں تھا۔ وہ اب بھی روز اسے اکناکس پڑھانے آتا تھا۔ روز رات کو واک بھی ساتھ ہوتی تھی۔ اس کی ہر بات وہ پہلے جیسی مانتا تھا پھر آخرا ایسا کیا تھا، جو صرف وہ محسوس کر رہی تھی۔ کتنے ہی دن وہ خاموشی سے یہ انجانی سی خاموشی، عجیب سی بے رخی سہہ گئی لیکن کب تک.....

”دیکھو ابوطالب، میں تمہاری ڈانٹ سہہ سکتی ہوں۔ تمہاری ناراضگی برداشت کر لوں گی لیکن یہ نہیں۔“ وہ اسے پڑھانے آیا تھا لیکن وہی خاموشی۔ آج ریحہ کی بس ہو گئی۔

”کیا مسئلہ ہے ریحہ! میں نے اب کیا، کیا ہے۔“

”ہاں تم نے کچھ کیا نہیں ہے۔ یہی تو میں کہہ رہی ہوں مگر تم پہلے جیسے نہیں رہے۔“

”تمہاری اوٹ پٹانگ باتوں کے جواب نہیں ہیں میرے پاس۔“

”پلیز طالب تم اچھی طرح جانتے ہوں ناں میں کیا کہنا چاہتی ہوں۔ صرف تم سمجھتے ہو۔“

”میں کچھ نہیں سمجھتا ریحہ۔ میں تو اب دعویٰ بھی نہیں کر سکتا کہ ریحہ ضیاء کو سب سے زیادہ میں سمجھتا ہوں۔ یہ بھی تم نے غلط

ثابت کر دیا۔ تم میری سوچ سے بالکل الگ ہو۔ تم واقعی سب سہہ سکتی ہو مگر اب تم ابوطالب کے اسی مزاج سے جانکاری حاصل کر لو۔ کیونکہ میں بھی اب وہ نہیں جسے تم جانتی تھیں۔“

”تم اب بھی مجھ سے خفا ہو طالب۔“

”نہیں اب ہمارا وہ رشتہ رہا ہی نہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہاری ساری خواہشات پوری کر سکوں۔“

وہ کتاب بند کر کے اٹھ گیا۔ ریحہ نے آواز دی مگر اس نے اُن سنی کر دی، ریحہ کو کشمکش میں مبتلا کر کے۔

اُس دن اس نے جو کہا وہ طالب نے اتنی شدت سے نوٹ کیا تھا۔ خود اسے یاد بھی نہیں تھا کہ اس نے کہا کیا ہے۔ دوبارہ ریحہ

نے بھی کچھ نہیں پوچھا۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بولتے تھے، ہنسی مذاق بھی کرتے تھے مگر ایک انجانا سا فاصلہ دونوں کے بیچ حائل تھا۔ ریحہ اپنے الفاظ پر نادم تھی اور شاید وہ خفا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ کسی کو اب تک شک نہ ہوا تھا۔



انہی دنوں اشعر آ گیا اسلام آباد سے۔ اشعر ان کی بڑی پھوپھا کا اکلوتا، تین بہنوں کا بھائی تھا۔ ان کی بڑی پھوپھو قسمت والی تھیں۔

یہ خیال ریحہ کا تھا کیونکہ ان کی مالی حیثیت بہت مضبوط تھی اور بقول ریحہ کے کہ اس دور میں زندگی گزارنے کے لیے سب سے اہم چیز

صرف پیسہ ہے اور بنا پیسے کے زندگی کچھ بھی نہیں۔

اشعر دوسرے دن ہی ان دونوں کی معمول سے زیادہ خاموشی بھانپ گیا کیونکہ وہ ان دونوں کا ہی اچھا دوست تھا۔

”خیریت ہے ناں ڈیر کزنز۔ تم دونوں ایک دوسرے سے خفا ہو گیا۔“

”نہیں۔“ طالب نے فوراً نفی کی۔ ”اور اگر ایسا ہوتا تو ہم دونوں ایک ساتھ بیٹھے نظر آتے تمہیں۔“

”ہاں! لیکن کچھ نہ کچھ ہے ضرور۔ تم دونوں ایسے ہو نہیں جو ان دونوں میں مجھے نظر آئے ہو۔“ اس نے سوچتی نظروں سے انہیں

دیکھا۔ ریحانا دیر چپ نہ رہ سکی۔ اس نے ساری بات اشعر کو بتادی۔ ”بس اسی دن سے یہ خاموش رہتا ہے۔“

”ریحنا، سوری ڈیر، لیکن تم نے طالب کو ہرٹ کیا تھا۔ اس نے جب تم سے محبت کی، تمہاری ذات کی سب ہی خامیوں، خوبیوں،

تمہاری عادات اور تمہاری تمام تر کمزوریوں سمیت تمہیں دل سے اپنایا۔ اس نے نہ تمہاری ظاہری حیثیت دیکھی، نہ تمہاری مالی حیثیت اور

پھر طالب جیسا انسان ہر لڑکی کا مقدر نہیں ہوتا۔ تم نے اس کی کیا کمزوری بتائی کہ یہ ایک ایماندار انسان ہے، اصولوں پر سمجھوتا نہیں کرتا، اپنا

ضمیر مار کر تمہاری سو کا لڈ خواہشات پوری نہیں کرے گا مگر اس کی چاہت..... جو ان تمام چیزوں سے بڑھ کر تھی، اسے تم نے انکور کر دیا۔

دیری بیڈ۔“ اشعر نے بھی اسے ہی لتاڑا تھا۔

”دفع کرناں اشعر، میں یہ ٹاپک کلوز کر چکا ہوں۔“ طالب نے اشعر کو خاموش کرانا چاہا۔

”اور یہاں تو سب سے بڑی غلطی کر گیا اگر وہ غلط ہے تو تم اسے بتاؤ، روگ بنا کر دل میں مت بٹھاؤ۔ دیکھو طالب تم دونوں نے

زندگی ساتھ گزارنی ہے یا، یوں ایک دوسرے کے لیے دل میں فاصلے اور شکوے جمع کر کے کیا تم عمر بھر ایک دوسرے کے ساتھ رہ سکتے ہو۔“

”کتنے لوگ ایسی دوغلی زندگی گزار رہے ہیں جن کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے بہت گلے ہیں مگر وہ زبان پر نہیں لاتے

اور ایک ساتھ رہتے ہیں، ہم بھی جی لیس گے۔“ طالب نے سرسری انداز اپنایا۔

”آف کورس جیتے ہیں۔ پھر تم میں اور ان لوگوں میں کیا فرق رہ جائے گا۔ تمہارے دل کی سچائی اور تمہاری صاف گوئی ہی تو

تمہیں دوسروں سے الگ کرتی ہے طالب۔“

”آج کل دل کی سچائی دیکھتا کون ہے اشعر۔ پھر فائدہ کیا۔“

”برامانویا اچھا مانو مگر یہ غلط ہے۔ دل صاف نہیں ہے تو اس رشتے کو نبھانے کا کوئی فائدہ نہیں اور جب ریحنا اپنے کہے پر شرمندہ

ہے تو تمہیں اسے دل سے معاف کر دینا چاہیے۔“

”میں اس سے خفا کب ہوں۔“ اس نے کندھے اچکائے۔

”میں دل سے شرمندہ ہوں اس سے۔ کتنی بار معافی مانگ چکی ہوں مگر.....“

”ریحنا دکھ ہوتا ہے جب ہمیں علم ہو کہ جس کے لیے ہم ساری کائنات کی خوشیاں ڈھونڈتے پھرتے ہیں، وہ صرف مادی چیزوں

پر جان دیتا ہے۔ تم کب تک پیسے کے ساتھ خوشی سے جی لوگی۔ زندگی گزارنے کے لیے رشتے ناٹے، چاہت، ایک دوسرے کا ساتھ بھی اہم ہے۔ اگر دولت کے ساتھ اکیلے جیا جاتا تو کوئی پیسے والا، رشتے بھاتا نظر نہ آتا تمہیں۔ انسانوں کے لیے جینا سیکھو، دولت تمہیں ان رشتوں میں خود مل جائے گی، جن سے تم وابستہ ہو۔ محبت کی دولت۔“ وہ ڈائریکٹ اس سے مخاطب ہوا تھا۔

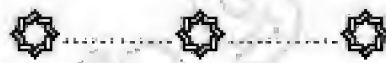
”میں نے کبھی صرف دولت کو زندگی نہیں سمجھا طالب۔ ہاں میں یہ ضرور کہتی ہوں کہ زندگی گزارنے کے لیے دولت اہم ہے۔ جس طرح ہم اپنے رشتے ناتوں کے بنا نہیں جی سکتے، اسی طرح زندگی کی ایک اہم ضرورت پیسہ بھی ہے۔ اس سے تم انکار نہیں کر سکتے۔“

”میں نے انکار کیا بھی نہیں ہے۔ میرے نزدیک پیسہ بہت کچھ ہے، سب کچھ نہیں اور تم نے یہ اندازہ کیسے لگایا کہ تمہیں میرے ساتھ گھٹ گھٹ کر، اپنی خواہشات مار کر جینا پڑے گا۔ ابھی تو تم صرف کزن ہو میری۔ تمہارے منہ سے نکلی ہر خواہش میں اپنے تمام کاموں کو پس پشت ڈال کر پوری کرتا ہوں ریحما۔ جب تمہاری خوشی، تمہاری خواہش میرے لیے اب اتنی اہم ہے تو پھر جب تمہاری ہر ضرورت، ہر خواہش مجھ سے وابستہ ہوگی تو کیا میں پوری نہیں کروں گا۔“

”سوری طالب! میں مانتی ہوں کہ میں بہت سیلفش ہوں۔ تمہیں بہت ہرٹ کرتی ہوں مگر یہ بھی طے ہے کہ تمہارے بنا مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ نہ دولت، نہ خوشی، میری ہر خوشی تم، تمہاری ذات ہے اور بس۔“ اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہوئے تو وہ بھی لب کاٹنے لگا۔

اس کی اپنی ہر خوشی ریحما ب ضیاء کے نام سے شروع ہو کر اسی کے نام پر ختم ہو جاتی تھی۔ اتنے دن سے پتا نہیں کیسے وہ دل پر پتھر رکھے ہوئے تھا۔

”اچھا بس کرو اب اور اٹھو دونوں، مجھے اپنے شہر کی سیر کرو اور کچھ کھلاؤ پلاؤ یار۔ میں مہمان ہوں تمہارا۔“ اشعر نے ان دونوں کے چہرے دیکھے اور خوشگوار موڈ میں کہا۔ طالب اور ریحما فوراً مان گئے۔



ان کے دل کا موسم پھر سے حسین ہوا تو ہر موسم خوبصورت لگنے لگا۔ ہر کام میں دل لگنے لگا۔ پھر وہی روز و شب تھے، ہنستے مسکراتے اور یہ دن یوں گزر رہے تھے جیسے ہوا کے ساتھ اڑ رہے ہوں۔ اسکا ماسٹر مکمل ہو چکا تھا۔ طالب اب سیٹل تھا اور کامیاب زندگی کی طرف گامزن، ہاں وہ محنت ڈبل کر رہا تھا۔ طلال کا یونیورسٹی میں لاسٹ ایئر تھا۔

ارشاد بھائی کو پروموشن ملی تو کچھ گھر کے حالات مزید بہتر ہوئے اور پھر بابا کی ریٹائرمنٹ۔ بس زندگی کے چکر تھے اور سب اس میں مگن تھے کیونکہ ریحما ب ضیاء اب یہ بات سیکھ چکی تھی کہ وقت سے پہلے اور قسمت سے زیادہ کبھی کچھ نہیں ملتا، یوں بھی وہ بہت سے لوگوں سے اچھی زندگی گزار رہے تھے۔

ریحما ب کا تعلیمی کیریئر ختم ہوا تو پھوپھو کو بھی اپنے گھر میں بہولانے کی جلدی ہو گئی۔ یوں بھی طالب اپنے تینوں بھائیوں میں بڑا تھا۔ بابا بھی راضی تھے۔ یوں جلد ہی ان کی شادی کی ڈیٹ فکس ہو گئی۔

”بس آج لاسٹ ٹائم تم ہمارے گھر آئے ہو۔ اب صرف بارات لے کر آنا سمجھے۔“  
 ”یہ سراسر غلط ہے۔“ طالب نے معصوم چہرہ بنایا۔ ان کی تاریخ طے ہوئی تھی اور اس وقت گھر میں سب جمع تھے، موجِ مستی کر رہے تھے۔

”کیوں! یہ ہی رواج ہے۔“

”یہ میرے ماموں کا گھر ہے۔“

”سو واٹ! لیکن تم اب اس گھر کے داماد بننے بھی جا رہے ہو، اچھا۔“ بھابی نے مسکرا کے کہا۔

”ارشد بھائی۔“ اس نے دہائی دی لیکن ارشد بھائی نے بھی اپنی بیگم کی سائیڈ لی۔

”رسم و رواج بھی ہمارے سماج کا حصہ ہیں۔ طالب ہمیں ان کی قدر کرنی چاہیے اور پھر کچھ دنوں کی تو بات ہے۔“ ان کی بات پر اس کے منہ کے زاویہ بگڑے۔

”اچھا چلیں صرف آج ہمیں جانے دیں، آئس کریم کھا کے آ جائیں گے۔“

”نہیں ہر گز نہیں۔ ہمارے گھر میں تاریخ طے کرنے کے بعد لڑکی گھر سے باہر نہیں جاتی۔“

”بھابی پلیز یار!!“ وہ ٹرپ کے چیا۔

”چلو ایک فیور میں تمہیں دیتا ہوں، تم ریحما کے لیے یہیں آئس کریم لے آؤ پیک کرا کے۔“

”خاک مزہ آئے گا۔“ وہ بڑبڑایا۔

”تمہاری مرضی۔“ یعنی اجازت ملنا ممکن نہیں تھا۔

”طالب یہیں لے آؤ نا، سب مل کر کھائیں گے۔“ ریحما نے فرمائش کی اور خلاف معمول وہ مان بھی گیا۔

”طالب رہنے دو بیٹا۔“ امی بھی آ گئیں۔

”مامی، میں اکیلا جا رہا ہوں۔“

”میں جانتی ہوں لیکن وقت تو دیکھو، دس بج چکے ہیں اور آج کل حالات بہت خراب ہیں شہر کے۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔“

”اوگا ڈ!!“ اس نے سر تھاما۔

”امی ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں۔ طیب کی بائیک چھنے ابھی زیادہ دن نہیں گزرے۔“ ارشد بھائی بولے۔

”اور کل جو میرا موبائل چھین گیا وہ۔“ طلال نے صدے سے کہا۔

”میں سب کچھ یہیں رکھ جاتا ہوں۔“

”نہیں طالب رہنے دو۔“ ریحما یکدم بولی جس طرح کے حالات آج کل چل رہے تھے سب ہی ڈرنے لگے تھے۔ روز ہی کچھ



نہ کچھ سننے کو مل جاتا تھا۔ دل سہم سے گئے تھے۔

”وقعی اب تو ڈر لگتا ہے باہر نکلتے ہوئے۔ تم مت جاؤ رات کا ٹائم ہے۔“

”یار آج میری شادی کی ڈیٹ فکس ہوئی ہے۔ تم لوگ انجوائے کرنے کے بجائے ایویس مجھے بھی ڈر رہے ہو۔“

”تم نے آکس کریم ہی کھانی ہے۔ صبح سنڈے ہے تم صبح لے آنا۔“

سب کے سمجھانے پر وہ مان گیا اور خاموش ہو گیا۔



شہر کے حالات بہت زیادہ بگڑ گئے تھے۔ گھر سے باہر نکلنا بھی دشوار تھا۔ ایسے میں صبح نوکری پر جانے والے شام میں لیٹ ہو جاتے تو دل ڈرنے لگتا تھا۔ ہزاروں وہم ستانے لگتے تھے۔ پھر طیب کی بانیٹ اور طلال کے موبائل کے حادثے کے بعد کچھ اور زیادہ ہی سب وہمی سے ہو گئے تھے۔

آج بابا کو تھوڑی سی دیر ہو گئی تو سب پریشان ہو گئے۔ اوپر سے بابا کا موبائل بھی آف تھا۔

پھوپھو بھی آگئیں اور جب نو بجے بابا لوٹے تو سب کی جان میں جان آئی۔

”کہاں چلے گئے تھے آپ؟“

”ارے بھئی وہ صدیقی صاحب مل گئے تھے۔ زبردستی گھر لے گئے، بس وہیں دیر ہو گئی۔“

”بھائی جان آپ جانتے بھی ہیں کہ آج کل سب کتنے سہم گئے ہیں۔ پھر بھی کم از کم فون کر دیتے تو اتنی پریشانی نہ ہوتی۔“

”ارے بھئی موبائل تو یہیں چار جنگ پر لگا ہے اور پھر قریب ہی تو گیا تھا۔ آپ لوگ بھی۔“ بابا ہنس دیے۔

مگر صرف ان کے ساتھ ہی نہیں، شہر کے ہر گھر میں یہ خوف سا پھیلا ہوا تھا۔ ایک ماہ میں دو بلاسٹ، پھر فائرنگ، ڈکیتی..... کتنے واقعات ہو گئے تھے۔ اللہ جانے یہ قوم میں فرقہ پرستی کیوں اتنی زور پکڑ رہی تھی۔ ہر کسی کو یہ پتا رہ گیا تھا کہ وہ پٹھان ہے، مہاجر ہے، پنجابی، یہ بات سب بھول گئے تھے کہ ہم مسلمان ہیں، پاکستانی ہیں۔

گھر میں شادی کی تیاریاں بھی تیزی سے ہو رہی تھیں، روز ہی ماریٹ جانا پڑتا تھا۔ سب سے زیادہ بھابی پر کام کا زور تھا۔ ان کی اتنی مصروفیت دیکھتے ہوئے ریحاب آج کل کچن سنبھال رہی تھی اور طلال نے یہ رپورٹ طالب کو دے دی تھی تب ہی شام میں اس کا فون آیا تھا۔

”سنا ہے آج کل گھر والوں کا پیٹ خراب کرنے کی ذمہ داری سنبھال لی ہے تم نے۔“ اس نے چھیڑا، وہ قطعاً برا نہیں مانی تھی۔

”ہاں، ظاہر ہے تجربہ حاصل کر رہی ہوں۔ تمہارا پیٹ بھی تو خراب کرنا ہے۔“

”میرا تو تم نے خانہ خراب کرنا ہے ڈیر۔“ وہ ہنسا تھا۔ ”یار آج تم سے ملنے کا بڑا دل چاہ رہا ہے۔“

”آ جاؤ۔ بھیا اور بھابی کے جوتے فری مل جائیں گے۔“ اس نے مزید دل جلایا۔

”ایسے حالات بھی نہیں ہے۔ میں اپنے ماموں کی فیور لے لوں گا۔“

”بہانہ چاہیے تو میرے لیے دہی بڑے لادو۔“ ریحانے فرمائش جھاڑی۔

”یار بڑی فضول خرچ بیوی مل رہی ہے۔ سیونگ تو ناممکن ہوگی میری۔“ اس نے سر پٹا۔

”پھر وہیں رہو۔ ایک تو میں گھر آنے کا ریزن بنا رہی ہوں تمہارے لیے اور تم الٹا مجھے ہی طعنے دینے لگے۔“

”ارے سویٹ ریحانہ، جانو! آپ تو بڑا مان گئیں۔ میں ابھی لاتا ہوں دس منٹ میں۔“

”اتنی جلدی بھی نہیں ہے۔ بائیک آہستہ اڑانا، اوکے۔“

”جو حکم سرکار۔“ اس نے بشاش لہجے میں کہہ کر فون بند کر دیا۔

دس منٹ بعد وہ نہیں آیا تھا بلکہ ان کے سروں پر آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔

بم بلاسٹ کی اطلاع نے شہر بھر میں قیامت مچا دی تھی۔ بابا نے ارشد بھائی اور طلال کو فون کیا۔ وہ دونوں خیریت سے تھے لیکن جب ہی حواس باختہ طیب نے آکر ان کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔

”طالب کا فون بند جا رہا ہے اور.....“ اسے خود اپنا ہوش نہیں تھا۔

”ہو سکتا ہے چار جنگ نہ ہونے کی وجہ سے فون بند ہو، آجائے گا۔“

”بابا، دس منٹ پہلے اس نے فون کیا تھا مجھے۔ وہ چورنگی تک جانے کا کہہ رہا تھا۔“ اس کا اپنا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

”اچھا پریشان نہ ہو، میں دیکھتا ہوں۔“ بابا نے انہیں تسلی دی۔ طیب نے اس کے فرینڈز کو فون کر کے معلوم کیا۔ اتنے میں طلال

اور ارشد بھائی آ گئے۔ ارشد بھائی کو جیسے ہی معلوم ہوا وہ طیب کو لے کر فوراً چلے گئے اور طلال اسے چورنگی پر دیکھنے چلا گیا۔

آسمان کیسے سر پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ یہ اسے اب پتا چلا تھا۔ جب ابوطالب کی لاش بہت بری حالت میں ان کے سامنے تھی۔ یوں

لگتا تھا قیامت آ گئی ہے۔

پھوپھو، امی، بابا، طیب..... جسے دیکھو بے حال تھا۔ ایک بے یقینی کا سا عالم تھا۔ سامنے وہ ساکت تھا۔ آنکھوں کے سامنے تھا مگر

یقین نہ تھا کہ وہ چلا گیا ہے انہیں چھوڑ کر..... ریحانہ کی آنکھیں ابوطالب کے وجود کی طرح ساکت تھیں۔ اس کا جسم جیسے پتھر کا بن چکا تھا۔

کب ابوطالب کی آخری رسومات ہوئیں، اسے کب اس کی آخری آرام گاہ لے گئے، ریحانہ ضیاء کو کچھ ہوش نہ تھا۔ اس کی

آنکھیں اب تک کھلی تھیں، ابوطالب کے انتظار میں کہ کب وہ آئے گا۔ اس کی فرمائش پر ہی تو وہ گیا تھا۔ وہ ضرور آئے گا۔ اس کا دل چاہ رہا

تھا ریحانہ کو دیکھنے کا تو آئے گا وہ۔ اب تو اس کے پاس ریزن بھی تھا ناں۔ وہ منتظر دروازے پر لگا ہوا بیٹھی تھی۔ پر ابوطالب نے

نہیں آنا تھا۔ وہ چلا گیا تھا۔ اسے چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے۔ یہ بات سب نے قبول کر لی تھی۔ ہاں دل کو ایک بے یقینی سی تھی کہ جیسے ابھی کہیں

سے وہ آجائے گا، ہنستا ہوا اور کہے گا کہ کیسا ہامیر انداق۔ جان نکل گئی تھی ناں۔“

لیکن یہ امید..... امید بھی نہ رہی، اس کی قفل خوانی ہو گئی اور پھر دس دن کا ختم بھی ہو گیا لیکن ریحہ کا سکتہ جوں کا توں تھا۔ سب کی کوششیں بے سود ہو گئی تھیں۔ وہ نہ روتی تھی اور نہ ہی کچھ بولتی تھی۔ بڑی پھوپھو، اشعر اور دوسرے رشتے دار جو دوسرے شہر سے آئے تھے، ریحہ کی حالت کی وجہ سے از حد فکر مند تھے۔

ڈاکٹر زکود کھایا مگر نتیجہ کیا نکلا۔ اس کا سکتہ کوسے میں بدل گیا۔

یہ سب کے لیے ایک اور صدمہ تھا۔ ابوطالب کی جواں موت کا صدمہ تو دل میں روگ کی طرح بیٹھ گیا تھا اور اب ریحہ بے ضیاء کی حالت..... سب کو ایک اور صدمہ دے گئی۔ ڈاکٹر زکود نے انہیں قطعی جھوٹی تسلی نہیں دی تھی کہ وہ جلد ٹھیک ہو جائے گی۔ وہ بھی کچھ خاص پُر امید نہیں تھے ریحہ کی پوزیشن سے۔



ابوطالب کیا گیا، ان کے خاندان کی ہر خوشی اور زندگی سے جیسے مسرت کا وجود ختم سا ہو گیا تھا۔ دن رات ہنسنے، چھیڑ چھاڑ کرنے والے طلال اور طیب کے لبوں پر ایک سخت سی خاموشی چھائی تھی۔ سحرش، سحاب اور کاشف چھوٹے تھے مگر ظاہر ہے ابوطالب تو گھر کے ہر فرد کے دل میں بستا تھا۔ وہ تو ہر شخص کے لیے جیتا تھا، تو اس کی موت کا یہ بھیانک سچ سب کو دل سے قبول کرنے میں بہت وقت درکار تھا۔ ارشد بھائی اور بھابی بظاہر سب کے سامنے خود کو بہت مضبوط پوز کرتے تھے مگر یہ تو سچ تھا ناں کہ طالب ان کے وجود کی دیواریں ہلا گیا تھا لیکن اگر وہ بھی بکھر جاتے تو اتنے سارے لوگوں کو کون سنبھالتا اور ریحہ کی حالت نے تو انہیں مزید توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کی روح پرواز کر گئی۔ اس کی آخری رسومات، ان سب کا تو ہوش بھی نہ تھا۔

دن، ہفتے اور ہفتے مہینوں میں بدل گئے تھے لیکن ریحہ بے ضیاء کی وہی حالت تھی۔ اب تو سب کو تشویش ہونے لگی تھی۔ ڈاکٹر زکود نے لگے لگے جانے والا تو چلا گیا تھا، سب کو اس کی موت پر صبر آ گیا تھا مگر ریحہ جو نہ زندگی کی طرف لوٹ رہی تھی نہ ہی مردوں میں اس کا شمار کیا جاسکتا تھا۔ آخر کب تک وہ لوگ اس تسلی کے سہارے زندگی گزارتے کہ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ امی روز اسے جھنجھوڑتی تھیں لیکن وہ صرف ان کی باتیں سن سکتی تھی۔ ہاں اب کبھی کبھار امی نے اس کی آنکھوں کے گوشے دیکھے تھے۔ وہ اپنی بیٹی کی اس حالت پر صرف اللہ کے حضور دعا ہی کر سکتی تھیں۔ جو دن رات وہ کر رہی تھیں۔



آج اس کا نکاح تھا اشعر رضا کے ساتھ۔ وہ سچ ہی تو کہتا تھا کہ وقت سے پہلے اور قسمت سے زیادہ کبھی نہیں ملتا۔ وہ اس کا سب کچھ تھا مگر اس کی قسمت نہیں تھا۔ وہ خود تو چلا گیا۔ ریحہ بے ضیاء کے لیے دنیا جیسے ختم کر گیا تھا۔ اس کا خود کا بس چلتا تو وہ کب کا خود بھی ختم ہو جاتی لیکن رضائے الہی تھی کہ اس نے جینا ہے۔

آٹھ ماہ زندگی اور موت کی کشمکش میں گزار کر وہ زندگی کی طرف لوٹ آئی۔ پھر اسے اسی دنیا میں جہاں سب کچھ تھا مگر اس کے

لیے کچھ نہ رہا تھا۔ ہاں جس زندگی میں ابوطالب نہ رہا، وہاں بچا ہی کیا تھا۔ ہاسپٹل سے گھر آ کر بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ وہ بولنا تو شاید بھول ہی گئی تھی، ہنسنا تو دور کی بات تھی۔

سب کا خیال تھا شاید وہ دھیرے دھیرے سنبھل جائے مگر اب تو ایک سال ہو چکا تھا اور وہ ویسی ہی تھی۔ سب کے ساتھ بیٹھ کر بھی وہ انجان بنی بیٹھی ہوئی تھی۔ ٹی وی پر کوئی ایسی ویسی خبر سنتی تو گھنٹوں روتی رہتی۔ یوں لگتا جیسے ابوطالب آج ہی انہیں چھوڑ گیا ہو۔ اشعر نے اسے اپنانے کا فیصلہ از خود کیا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا ریحما یہاں سے دور جا کر شاید سنبھل جائے۔ مختلف ماحول میں اس کا من بہل جائے مگر وہ ریحما اب ضیاء تھی، کوئی بچی نہیں جو بہل جاتی۔

”ریحما میرے فیصلے کو میری نیت کا کھوٹ مت سمجھنا۔ آئی نو، بہت پہلے میں تمہاری خواہش رکھتا تھا مگر طالب اور تم، دونوں میرے لیے، میری خواہش، میری چاہت سے بڑھ کر ہو لیکن آج اگر میں نے یہ فیصلہ کیا ہے تو صرف تمہاری بہتری کے لیے پلیز ریحما.....!“

”میرے لیے زندگی کی ہر خوشی، ہر جذبہ بے معنی ہو چکا ہے۔ تم اگر پھر بھی یہ چاہتے ہو تو کل کو مجھے بلیم مت کرنا۔ مجھ سے کسی قسم کی امید مت رکھنا۔“ گھر والوں اور اشعر کی اس ضد پر وہ صرف خاموشی سے مان گئی تھی۔

یوں بہت سادگی سے ان کے نکاح کی سادہ و پُر وقار تقریب ہوئی اور وہ اسلام آباد آ گئی۔ لیکن اس کی روٹین نہیں بدلی۔ اشعر رضا کے اس کو بدلنے اور زندگی کی طرف لانے کے تمام دعوے پست ہونے لگے تھے۔

وہ گھر کے تمام کام کرتی تھی۔ اشعر کے تمام کام بھی خود سے سنبھال چکی تھی مگر وہ صرف ایک روبوٹ کی مانند۔ جذبات و احساسات سے قطعی عاری۔ اشعر اس سے کبھی گلہ نہیں کرتا تھا کیونکہ وہ تو خود کہہ چکی تھی کہ یہ فیصلہ سراسر اس کا ہے۔ وہ فارغ اوقات میں جانے کن سوچوں میں کھوئی رہتی۔ اسے اشعر کی موجودگی یا غیر موجودگی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اشعر زبردستی اسے باہر کہیں لے جاتا۔ اسے باتوں میں مصروف رکھنے کی کوشش کرتا۔

کبھی ان تمام آسائشات کی وہ خواہش مند تھی اور اب اسے ہر آسائش حاصل تھی۔ ایک بہت بڑا خوبصورت ویل ڈیکور بیڈ روم، گاڑی، بینک بیلنس..... اسے زندگی کی ہر سہولت حاصل تھی لیکن اس کے لیے سب بے معنی۔ اس کے لیے تو ہر خوشی ہر آسائش صرف ابوطالب کے سنگ حسین تھی۔ جب وہ نہیں رہا تو ان تمام مادی چیزوں کا کیا حسن، کیا معنی تھے۔

بڑی پھوپھو جب تک حیات رہیں اسے سمجھاتی رہیں۔ پھر وہ بھی زندگی کی بازی ہار گئیں اور اب اتنے بڑے گھر میں وہ تنہا تھی۔ اشعر صبح کا گیا شام میں آتا۔ کیا اس نے یہ تنہائی مانگی تھی قسمت سے۔ وہ تو اتنی خوش مزاج، ہنسنے بولنے والی لڑکی تھی لیکن.....

وقت اس کے زخموں پر مرہم رکھتا رہا مگر طالب کی موت کے زخم بھرنہ سکے۔ آج بھی اسی طرح ہرے تھے۔ چار سال اشعر کی سنگت میں گزار کر بھی وہ ویسی ہی تھی، جیسے کبھی اس شہر سے گئی تھی۔

اشعر رضا بھی شاید تھک گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کچھ وقت لگے گا ریحما سنبھل جائے گی، اسے قبول کر لے گی مگر نہیں، شاید اس



نے غلط فیصلہ کیا تھا۔ کیونکہ وہ سمجھ چکا تھا کہ ریحما سے کبھی قبول نہیں کرے گا۔ اس نے ریحما سے کچھ کہنا سننا چھوڑ دیا۔ پہلے کی طرح سمجھانا ترک کر دیا۔ چار سال وہ کراچی نہیں گئی لیکن اسلام آباد کے رنگ بھی اسے بدل نہ سکے۔ اس کے من سے کراچی اور اس سے وابستہ یادیں نہ نکال سکے تھے۔

تب اس نے خود کو اور ریحما کو حالات کے سپرد کر دیا اور خود ہی اسے کچھ دن کے لیے کراچی بھیج دیا۔



”تم ہمیں اپنا دشمن سمجھتی ہو ریحما۔ کیا ہمیں تمہیں خوش دیکھنے کا، بھرپور اور خوش زندگی گزارتے دیکھنے کا حق نہیں ہے؟ دیکھو بچے! ہم تمہاری اچھی زندگی کے لیے تمہارے آنے والے کل کے لیے تمہیں سمجھاتے ہیں۔“

”بھابی! میری زندگی تو طالب کی سانسوں کے ساتھ ختم ہو گئی تھی۔ اب تو صرف.....“

”ایسا نہیں ہے ریحما، اگر ایسا ہوتا تو ایک سال زندگی اور موت کی کشمکش میں گزار کر تم واپس ہم میں نہ لوٹتیں بلکہ اپنی سانسیں ہار چکی ہوتیں۔“

”کاش ایسا ہو جاتا۔“ اس نے آہ بھری۔

”تم سدا سے ناشکری ہو، اسی بات پر طالب تم سے خفا ہوتا تھا۔ زندگی اللہ کا دیا ہوا انمول تحفہ ہے ریحما۔ اس کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں نئی زندگی عطا کی اور اللہ تم اس کی ناشکری کر رہی ہو۔ ارے ان لوگوں سے پوچھو جا کر جن کے پاس زندگی کم ہے اور وہ بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ گزر گزاتے ہیں کہ ہمیں اتنی مہلت مل جائے کہ ہم جو کرنا چاہتے ہیں وہ کر لیں، ایک تم ہو، اتنی بڑی نعمت کو یوں ضائع کر رہی ہو۔ اسکی جتنی زندگی تھی اس نے جی اور بھر پور انداز میں جی۔ اس نے انسانیت کے لیے سوچا، وہ تعلیم کا بہت بڑا حامی تھا۔ وہ ان لوگوں کے لیے ہمدردی رکھتا تھا، ان کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتا تھا جو تعلیم سے محروم ہیں۔ اس کے پاس کرنے کے لیے بہت کچھ تھا لیکن زندگی نہیں اور وہ اپنے خواب اپنے من میں لیے چلا گیا۔“

”وہ گیا نہیں ہے بھابی، اس شہر پر قربان ہوا ہے۔ اس شہر، اس ملک پر جس پر وہ جان دیتا تھا۔ اسی ملک نے اس کی سانسیں چھین لیں۔ یہ تحفہ دیا اسے حب الوطنی اور ایمانداری کا۔“

”ریحما اپنے وطن کے لیے قربان ہونے کا اعزاز بھی ہر انسان کو نہیں ملتا۔“

”وہ اگر ملک کی سرحد پر دشمنوں کے ہاتھوں شہادت پاتا تو میرے دل کو صبر آ جاتا مگر اسے مارنے والے تو اسی ملک کے لوگ ہیں۔ ہمارے اپنے وطن میں رہنے والے، کوئی باہر سے نہیں آئے تھے۔“

”گڈ! ریحما تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ہم اس بات سے بھی انکار نہیں کرتے کہ طالب کو مارنے والے کوئی باہر سے نہیں آئے تھے۔ وہ اسی ملک کے تھے، ہم میں سے ہی تھے۔“

”سب کچھ ختم ہو جانے کے بعد، اب کیا مقصد ہے میرے جینے کا۔“

”مقصد ہے ریحا، طالب تمہیں عزیز تھا اور آج بھی تم اس کا نام لے کر جیتی ہو۔ تو تم اپنی زندگی کا مقصد، اس کے وہ، خواب بنا لو جو اسے عزیز تھے۔ جن کے لیے وہ جیتا تھا مگر وہ زندگی ہی اتنی مختصر لے کر آیا تھا کہ وہ خواب مکمل نہ ہو سکے۔ لیکن یہ موقع تمہیں ملا ہے۔ اس کی محبت کا فرض ادا کرو۔ اس خواب کے لیے جیو۔“

”مگر میں کیسے، یہ سب اکیلے کروں گی۔“

”نہیں ریحا تم اکیلے نہیں، ہم سب مل کر تمہارے ساتھ کام کریں گے۔“

”بھیا! اس کے لیے ہمیں فنانشلی سپورٹ چاہیے ہوگی، وہ۔“

”اشعر ہے ناں، ریحا ڈیر تم پہلا قدم تو اٹھاؤ، دیکھنا دھیرے دھیرے کتنے قدم تمہارے ساتھ اٹھیں گے۔“

”اشعر ہمارا ساتھ دے گا۔“

”تمہاری خوشی کے لیے وہ تمہاری ہر بات مان لے گا۔ دیکھو ریحا ان چار سالوں میں صرف ہم نہیں، وہ بھی تمہاری طرف سے بہت مایوس ہوا ہے۔ وہ تمہارا شوہر ہے اور تمہارا بہت خیال بھی رکھتا ہے۔ آج تک اس نے تمہیں کسی چیز سے انکار کیا ہے؟ نہیں ناں! تم اگر خوش رہو گی، ہنسو گی، بولو گی، زندگی کو بھرپور انداز میں جیو گی تو وہ یقیناً خوش ہوگا۔ اپنی زندگی کا مقصد تمہیں مل گیا ہے۔ آئی بلیو کہ اشعر بھی خوشی خوشی تمہارا ساتھ دے گا۔ کیونکہ جو تم کرنا چاہتی ہو اس سے ہمارے اپنے لوگوں کو فائدہ ہوگا۔“ بھابی نے پیار سے اسے سمجھایا تھا اور شاید اسے سمجھ آ گئی تھی تب ہی تو مسکرائی تھی۔ کتنے سالوں سے گھر والے اس کی مسکراہٹ کو ترس گئے تھے اور آج دیر سے سہی وہ لوٹ آئی تھی زندگی کی طرف۔ وہ اٹھ کر کمرے میں آئی تھی، اشعر کو فون کرنے۔



اس نے صرف سنا تھا کہ قطرے قطرے سے سمندر بنتا ہے۔ مگر آج ایک سال کے بعد یہ مثال حقیقت بن کر اس کے سامنے جگمگا رہی تھی۔

ایک ایک کر کے اٹھایا ہوا قدم آج اس کے خوابوں کی تعبیر بنا، اس کی نگاہوں کے سامنے تھا اور اس سفر میں وہ قطعی اکیلی نہیں رہی تھی۔ سب نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ اس کا حوصلہ بڑھایا تھا اور جو عزم لے کر وہ کراچی سے اسلام آباد لوٹی تھی، وہ اس پر ثابت قدم رہی تھی۔ اس نے کوشش کی تھی کہ ابوطالب کے ان خوابوں کو حقیقت کا روپ دے جو کبھی زندگی بن کر اس کے ساتھ جیا کرتے تھے۔ سواب خوابوں کو حقیقت میں بدلنے تک یہ پہلا قدم اس نے کامیابی سے طے کیا تھا۔

”ابوطالب“ کے نام سے منسوب کر کے اس نے ایک اسکول بنایا تھا۔ جس میں وہ تمام بچے علم کی روشنی سے مالا مال ہو سکتے تھے جو اپنی محرومیوں اور مجبوریوں کی وجہ سے تعلیم حاصل نہیں کر سکتے تھے۔

ایک ایسا ادارہ جو اس ملک کے ان بے شمار اسکولوں کی طرح نہیں تھا جو صرف نام کی مفت تعلیم کہہ کر غریب لوگوں سے پیسہ لوٹتے تھے پھر بھی ایمانداری کے ساتھ اپنا حق ادا نہیں کر رہے تھے۔ یہ قدم تھا صرف ان لوگوں کے لیے جو واقعی حق دار تھے۔ اس تعلیم کے اور اس ادارے میں صرف وہ لوگ اپنا فرض ادا کر رہے تھے جن کے لیے پیسے سے زیادہ علم کی اہمیت تھی۔

ابوطالب اب بھی اس کے لیے اتنا ہی اہم تھا۔ اس کی زندگی کا ہر باب اس کے نام سے منسوب تھا لیکن اب اس نے زندگی کو بے معنی نہیں گزارنا تھا۔ جب اس نے یہ زندگی ابوطالب کے نام کر دی تھی تو پھر جب تک سانسیں تھیں، اس نے ابوطالب کے خوابوں کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا اور یہ سب کرنے میں وہ پھر ریحا بن گئی تھی۔ اب وہ ہنستی بھی تھی، بولتی بھی تھی۔ اسے یوں لگتا تھا کہ اس کے قدم قدم پر ابوطالب آج بھی اس کے ہمراہ ہے۔ جب وہ ہنستی ہے تو وہ اس کے ساتھ خوش ہوتا ہے۔ اس کے کام میں اسے حوصلہ دیتا ہے اور اسے آگے بڑھنے کے عزم میں وہ اس کے برابر کھڑا ہے۔ ہنستا مسکراتا اور بہت خوش۔ جیسے کہہ رہا ہو، ریحا میں تمہارے ساتھ ہوں اور اس طرح اسے مزید حوصلہ ملتا۔

اس بات سے بھی وہ کبھی انکار نہیں کر سکتی تھی کہ اس کے حوصلوں، اس کے جذباتوں میں اشعر رضا بھی اس کے ہمقدم رہا تھا۔ دن رات جب بھی ریحا کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی، وہ اس کا ہاتھ تھامے اس کے ساتھ کھڑا تھا اور جب آج اس کے خوابوں کو تعبیر ملی تھی تو شکریہ کا پہلا حق دار بھی وہی تھا۔ اپنے اسکول کا افتتاح کرتے ہوئے اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

”کانگریجو لیشن..... ڈیر۔“ اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھامے اسے ویش کرنے والا یہ اشعر رضا تھا۔

”تھینکس، مگر اشعر اگر تم میرے ہمقدم نہ ہوتے تو شاید یہ سب کبھی نہ ہوتا۔“

”ریحا! عزم پکا ہونا چاہیے۔ منزل تو خود بخود قریب آ جاتی ہے۔ یہ خواب جس کا تھا، آج وہ ہم میں نہیں لیکن یہ اسکول اس کے خوابوں کی حقیقت بن کر ہمارے سامنے ہے۔“

”اور یوں لگتا ہے اشعر، جیسے وہ خود ہمارے سامنے ہے اور بہت خوش ہے۔ وہ یہاں نہ ہو کر بھی ہمارے ساتھ رہے گا اشعر۔“

”مجھے تو ابوطالب کا شکر گزار ہونا چاہیے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”کیوں؟“

”اس کے بعد جس طرح تم لائف گزار رہی تھیں لیکن جب تم نے اس کی خواہشوں کو اپنے جینے کا مقصد بنایا تو تمہاری زندگی بدل گئی اور یہ بدلاؤ، مجھے اس کے لیے اچھا لگا کہ تم زندگی کی طرف واقعی لوٹ آئیں اور پھر ہم سب کی طرف بھی۔“

”ریحا! کاش ہم سب پاکستان بن کر سوچیں، پاکستان کے لیے سوچیں، کیونکہ اچھی اور مثبت سوچ ہی تو مثبت تبدیلی لاتی ہے۔ تبدیلی، تغیر ایک دم سے برپا نہیں ہوتے، یہ عمل قدم بہ قدم ہوتا ہے مگر ارادے مضبوط ہونے چاہئیں۔ صرف بیٹھ کر باتیں بنانے سے اس ملک میں کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی۔ ہم سب کو اپنی ذاتی کاوش اور کوششوں سے عمل کرنا پڑے گا۔ تب ہی کچھ ہوگا۔ اگر ہماری سوچ ایک ہو



جائے تو بہت جلد ہم بھی بہت آگے ہوں گے لیکن اس کے لیے ہمیں ایک ہو کر قدم بڑھانے ہوں گے۔“  
 ”ہاں اشعر! ہم نے اسی لیے یہ قدم اٹھایا ہے۔ اس امید کے ساتھ کہ ہمارے اس عزم میں ہمارے ملک کے ہر گوشے سے اگر  
 ایک ایک فرد بھی ہمارا ساتھ دے تو ہم ضرور اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔  
 ”ان شاء اللہ!“ اس نے ایک عزم کے ساتھ کہا تھا اور اشعر نے ان شاء اللہ کہہ کے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا تھا۔



بطور خاص کتاب گھر قارئین کے لیے لکھا گیا  
 محمد شعیب کا بہت خوبصورت اور طویل ناول

**ابانیل**

ہر ماہ کی 20 تاریخ کو کتاب گھر پر نئی اقساط  
 پیش کی جائیں گی۔

**kitaabghar.com**

بطور خاص کتاب گھر قارئین کے لیے لکھا گیا  
 ایس اے نقوی کا بہت خوبصورت اور طویل ناول

**جام حسرت**

ہر ماہ کی 10 تاریخ کو کتاب گھر پر نئی اقساط  
 پیش کی جائیں گی۔

**kitaabghar.com**



## تیری خوشبو نہیں ملتی

طلحہ یار! نکل بھی آ باہر، کہیں مروتو نہیں گیا واش روم میں ہی۔ ”روز کی طرح صبح صبح ہی وہی آوازیں، شور ہنگامہ، کہنے کو تو اس گھر میں صرف دو فرد تھے، مگر ان کا شور دوسو کے برابر ہوتا تھا اور حرمین کو ان کے اس ہنگامے سے سخت الجھن ہوتی تھی۔ تنگ تو امی بابا بھی ہوتے تھے، مگر اس کے علاوہ گھر کا کوئی فرد اظہار نہیں کرتا تھا۔ صرف ایک ماہ ہوا تھا انہیں ان کے برابر آئے ہوئے۔

”پہلے اچھی خاصی فیملی رہتی تھی۔ اللہ جانے انہیں کیا مصیبت آئی تھی کہ ان میرا شیوں کو بیچ دیا ہے یہ گھر۔“ ادھر سے پھر آواز آئی تھی۔ وہ بڑبڑانے لگی۔ صحن میں بیٹھ کر اخبار پڑھنے کا خیال دل سے نکال دیا۔

”تم تو ٹھہرے پر دیسی وعدہ کیا نبھاؤ گے۔“

”اے بھیا! پردے بعد میں سی لینا، ناشتہ دے تاکہ ہم اس منحوس لباس کے متھے لگیں سویرے سویرے۔“ طلحہ نے حارش کو گاتے میں ٹوکا، ساتھ ہی گانے کا بھی ستیاناس کیا، حارش نے مگ اس کے سامنے بچھا۔

”میں تیرا باوا کا نوکر نہیں ہوں روز ناشتہ بناؤں، بس کل سے تو ناشتہ بنائے گا۔ شام کا میں کچھ نہ کچھ کر لوں گا۔“ حارش کئی دن برداشت کرتا رہا۔ وہ صرف بیٹھ کر کھاتا تھا۔ کچن اس نے سنبھال رکھا تھا، جیسے وہ اس کی نگہبوی ہو۔

”کیا یار حارش ایو نو، مجھے کتنی الرجک ہے ان لیڈیز کاموں سے۔“ وہ معصومیت سے بولا۔

”کینے، ذلیل، پاجی..... تجھے کھانے سے الرجی نہیں ہے صرف پکانے سے ہے، اور میں تجھے کوئی لیڈی نظر آتا ہوں جو سارے ایسے کام مجھ سے کراتا ہے۔ بس انیف آج سے بایکاٹ۔“ وہ جذبات میں اٹھ کھڑا ہوا۔

”اچھا یار! ناشتہ تو کر لے۔ اب تو نے اتنی محنت سے یہ جلا ہوا آملیٹ اور سوکھے ہوئے پراٹھے بنائے ہیں، ان کو حلق سے اتار کر

بھی دکھانا۔“ طلحہ اس کی بنائی اتنی پیاری پیاری آملیٹ اور پراٹھوں کی بے عزتی کرتا رہا۔ وہ کڑھ کر ناشتہ کرتا رہا۔ یہ اس بات کی نشانی تھی

کہ اب حارش عالم کو سنجیدہ غصہ آ گیا ہے تب طلحہ کو بھی بریک لگ گئی اور وہ جلدی جلدی ناشتہ ختم کرنے لگا۔ لیکن حارش پھر بھی اس سے پہلے

ہی بائیک باہر نکال چکا تھا اور جب تک وہ تالے لگا کر باہر آیا وہ جا چکا تھا۔ یعنی آج آفس جانے کے لیے بس یار کٹے کے دھکے کھانے

تھے۔ خیر اس نے چابیاں پڑوس میں دیں تاکہ ماسی آ کے صفائی وغیرہ کر جائے اور خود بھی اللہ کا نام لیتا آفس چل دیا۔



یہ دو لڑکے مہینہ بھر پہلے ہی یہاں شفٹ ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ کوئی لیڈیز یا سچے وغیرہ نہیں تھے۔ یعنی دونوں چھڑے چھانٹ کنوارے تھے، اور ایک نمبر کے بد تمیز، نالائق اور چھچھورے۔ خیر اسے تو آج تک کچھ نہیں کہا مگر آپس میں ان دونوں کی گفتگو اور مذاق اس قدر بھونڈے ہوتے تھے کہ وہ بعض دفعہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگتی۔ صبح ان کی بک بک اس نے ساری سنی تھی اور پھر جب وہ چابیاں دینے آیا تو اسے ہنسی آ گئی۔

آج اس نے بڑے نمونے کو خفا کر دیا تھا اور سزا کے طور پر اس نے اپنی بانیک پر اسے لفٹ نہیں دی تھی۔ ویسے یہ بھی سچ تھا کہ یہ طلحہ نام کا نمونہ ایک نمبر کا کام چور اور پیٹو تھا۔ کھانے کو جو مرضی دے دو، سب ہضم اور پکانے کی باری میں اسے یہ کام خالصتاً عورتوں کا لگتا تھا۔ دوسرا بے چارہ صبح شام عورتوں کی طرح کچن بھی سنبھالتا اور نوکری بھی کرتا۔ کسی دن وہ لیٹ ہو جاتا تو کھانا بازار سے آ جاتا تھا مگر وہ پیٹو نہیں ہلتا تھا۔ پتہ نہیں یہ شخص کیسے برداشت کرتا ہے ایسے انسان کو.....؟ اسے تو یہ بھی نہیں علم تھا ان دونوں میں رشتہ کیا ہے اور ان کا کوئی آگے پیچھے بھی ہے یا نہیں۔

مئی کا آغاز تھا اور گرمی اچھی خاصی شروع ہو جاتی تھی اس لیے شام کو صحن میں بیٹھنا سب کو اچھا لگتا تھا۔ پھر ان کے صحن میں دو تین درخت تھے جن کی ہوا میں بیٹھ کر سکون ملتا تھا، اور وہ سب شام کی چائے پیہیں بیٹھ کر انجوائے کرتے تھے۔ اس وقت بھی زمین کے علاوہ وہ سب چائے پی رہے تھے۔ زمین کچن میں شام کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی، تب ڈور بیل ہوئی۔ باہر ان دونوں میں سے ایک نمونہ تھا جو چابی لینے آیا تھا۔ ابو نے اخلاقا اسے بھی چائے کی دعوت دی تھی۔

”تھینک یو سوچ انکل! مگر اس وقت گرمی سے برا حال ہے۔ آپ پلیز انجوائے کریں ٹی۔“ واہ بھئی واہ، یہ لوگ اتنے مہذب انداز میں بھی بول سکتے ہیں۔ بڑی حیرت کی بات ہے۔ یہ یقیناً حارش تھا۔ اگر طلحہ ہوتا تو کبھی انکار نہ کرتا۔ اسے اپنی بات سوچ کر خود ہی ہنسی آ گئی اور کچھ دیر بعد ہی ادھر آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔

”حارش یار! چائے تو پلا دو، سچ سر میں شدید درد ہے۔“ پھر وہی پیٹو، جواباً کوئی آواز نہیں آئی تھی۔ شاید وہ اب تک ناراض تھا۔ ”تھینک یو برادر۔“ یعنی چائے بھی اسی بے چارے نے بنائی تھی۔ کچھ دیر خاموشی رہی، پھر طلحہ کی پریشانی بھری آواز آئی تھی۔ ”حارش! یہ کیا ہوا تجھے، اوگاڈیہ ہوا کیا ہے.....؟“

”ایکسیڈنٹ.....“ مدھم آواز گونجی۔

”کیا اور تو مجھے اب بتا رہا ہے، کب ہوا؟ اور زیادہ تو نہیں لگی چوٹ۔“ فکر، پریشانی، دکھ، ہر احساس نمایاں تھا آواز میں۔

”صبح ہی ہو گیا تھا، آج آفس گیا ہی نہیں ہاسپٹل تھا، وہاں سے گھر آ گیا۔“

”حارش! سارا دن تو اتنی تکلیف برداشت کرتا رہا اور مجھے فون تک نہ کیا، اتنا برا ہوں میں!“ وہ روہانسا ہو گیا۔

”یار طلحہ! ایسا نہیں ہے۔ میں نے سوچا تو پریشان ہوگا۔ دوپہر میں آفس سے بھاگے گا گرمی میں، بس اس لیے۔“

”تجھے میری اتنی فکر ہے اور میں کتنا خود غرض اتنی تکلیف کے باوجود چائے بھی تو نے بنائی، تو اب تو مجھے بتا سکتا تھا ناں۔ حارش یہاں کون ہے ہمارا۔ ایک دوسرے کے علاوہ۔ پڑوس بھی نیا ہے۔ کون جانتا ہے ہمیں۔ ہم نے خود ہی ایک دوسرے کا خیال رکھنا ہے۔ آئندہ تو نے ایسے کیا ناں تو میں گھر چھوڑ کے چلا جاؤں گا، پھر سڑنا کیلے۔ اس محلے میں تو کوئی ہم جیسوں کو پانی کا بھی نہ پوچھے۔ بیماری میں تڑپ تڑپ کے مرجائیں گے اور کسی کو خبر بھی نہ ہوگی۔“ کتنا جذباتی ہو رہا تھا وہ۔

”یو نو طلحہ! میں کبھی کسی سے بھی کوئی امید وابستہ نہیں رکھتا۔ انسانوں سے امیدیں باندھنا چھوڑ دی ہیں میں نے۔ پھر چاہے وہ پڑوسی ہوں یا اپنے اور ویسے بھی اس جہاں میں اپنا ہے ہی کون.....؟ تنہا آئے تھے، تنہا چلے جائیں گے۔“ اس کا جواب پہلے والے سے بھی زیادہ چھو لینے والا تھا۔

”یعنی تو مجھے بھی ان اپنوں کی کیٹیگری میں کھڑا کر رہا ہے۔“ طلحہ برا مان گیا۔  
 ”ایسا نہیں ہے طلحہ! تو اچھی طرح جانتا تھا، میری زندگی کے ہر باب کو..... پھر تجھے اتنا اندازہ بھی ہوگا کہ میں نے اپنا ناٹھ تعلق ختم کر ڈالا ہے سب سے، اور تو اگر میرے سامنے بیٹھا ہے تو صرف اس لیے کہ میں تجھے اور پھوپھو کو ان جیسا نہیں سمجھتا۔“  
 ”اچھا چل دفع کر۔“ طلحہ نے اس کا موڈ آف دیکھ کر کہا۔

”تو ریٹ کر۔“ اس نے حارش کو پکڑ کر کھڑا کیا۔ اس کے لیے صحن میں چار پائی ڈالی، بستر لگایا۔  
 ”چل لیٹ جا، میں تیرے لیے کچھ لاتا ہوں کھانے کو۔“  
 ”طلحہ! مجھے بھوک نہیں ہے یا! تو صرف اپنے.....“

”اچھا بس، مجھے پتہ ہے۔ اب خواجواہ پرانی باتوں کو ذہن پر سوار مت کرنا۔“ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ان کے ذکر پر وہ کس قدر ڈسٹرب ہو جاتا تھا۔ حارش نے اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا، بس آنکھیں موند لیں۔ ذہن خود بخود ہی پیچھے چلا گیا۔



”اُف او..... ایک تو یہ منحوس بچہ ہر وقت نندیدوں کی طرح میرے بچوں کو کھاتے پیتے دیکھتا ہے۔ چار دن ماں کے گھر رہنے کیا آگئی جان عذاب میں آگئی میری۔ اللہ جانے بھابی اس عذاب مسلسل کو اپنے باوا کے گھر ہی کیوں چھوڑ کر نہیں آئیں۔“ دس سال کے اس معصوم بچے کو دیکھتے ہی ثمنینہ باجی بولنے لگ گئیں اور شگفتہ آنکھوں میں آنسو بھرے اس بچے کا ہاتھ تھامے اندر آئیں اور اسے بچھ دیا۔

”کتنی بار منع کیا ہے تجھے مت نکلا کر باہر۔ جو چاہیے مجھے کہہ دیا کریں یہیں لا دوں گی، مگر تو نہیں مانتا ناں میری۔“ ان کا غصہ اس معصوم پر نکلا تھا۔ دو تھپڑ اور ہزاروں دفعہ کی ڈانٹ اسے رُلا گئی اور وہ بے چارہ بیڈ پر اوندھالٹ گیا۔ خود وہ باہر چلی گئی تھیں۔ کتنی دیر بعد کمرے میں آئیں تو وہ اسی طرح لیٹا تھا۔ ان کا دل برا آیا۔ روتے روتے سو گیا۔ کیسی ماں تھیں وہ.....؟ ایک طرف وہ معصوم سارے گھر والوں کی پھیکا رہتا تھا، پھر رونے کو ماں کا آنچل بھی نصیب نہ ہوتا۔ وہ کٹھور ہو جاتیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی سارا قصور اس کا ہی نکال



دیتیں۔ زیادہ غصہ آتا تو دو چار لگا دیتیں۔ ایسے میں وہ بالکل تنہائی پسند ہوتا جا رہا تھا۔ اس گھر میں صرف ایک ماں کا رشتہ ہی تو سگا تھا، ورنہ تو ہر رشتہ سوتیلا تھا، حتیٰ کہ اس کے چھوٹے بھائی بہن تک اسے سوتیلا کہتے تھے، آخر تھے جو سوتیلے۔

اعظم علی سے ان کا دوسرا نکاح تھا اور حارش ان کے پہلے شوہر سے تھا۔ اعظم علی کی پہلی بیوی سے اولاد نہیں تھی اور صرف اولاد کی وجہ سے انہوں نے شگفتہ سے دوسرا نکاح کیا تھا۔ ان کے پہلے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا اور وہ ایک بچے سمیت ماں باپ کے گھر بیٹھی تھیں۔ لیکن بھابیوں نے ان کا وقت گزارنا عذاب کیا ہوا تھا۔ پھر جب اعظم علی سے نکاح ہوا تو انہوں نے سوچا شاید ان کے برے دن ختم ہوئے لیکن حارش کا مسئلہ تھا۔ نانا، نانی معصوم نواسے کو رکھ بھی لیتے لیکن ماموں، ممانیاں بالکل راضی نہ تھیں۔ دوسرا حارش کو اعظم علی نے خود بھی کہہ دیا تھا وہ اگر شگفتہ کے ساتھ آجائے گا تو ہمیں کوئی مسئلہ نہ ہوگا۔ شگفتہ نے سکھ کا سانس لیا، لیکن اعظم کے ماں باپ اور بہن بھائیوں نے حارش کو دل سے قبول نہ کیا۔ ان کا رویہ بہت سرد اور روکھا تھا۔ وہ حارش کو اپنے سامنے تک بیٹھا برداشت نہ کرتے تھے۔ اعظم علی البتہ اکثر اس کے لیے باہر سے کوئی چیز لے آتے۔ کبھی کبھار پیار سے بلا لیتے تھے لیکن ان کے رویے میں بھی سوتیلا پن نمایاں ہوتا تھا۔ ایسے میں ان کا دل کٹ جاتا۔ سکے نانا، نانی، ماموں نے نہیں رکھا تو پھر ظاہر ہے کہ یہاں تو رشتہ سوتیلا تھا۔

حارش یہاں آ کر بہت گم صم رہنے لگا تھا۔ ان کی توجہ بھی کم ہو گئی تھی۔ سارا دن کام میں گزر جاتا تھا۔ بھرپور اگھر تھا۔ صبح سے کام میں لگتیں تو شام میں بھی فارغ نہ ہوتیں۔ پھر تھوڑی دیر حارش کے ساتھ گزارتیں۔ رات کو وہ اعظم کی اماں کے کمرے میں سوتا تھا۔

سال یوں ہی گزر گیا۔ حارش سب کے رویے محسوس کرتا لیکن جب ماں کا آنچل ملتا تو سب بھول جاتا۔ لیکن جب اعظم علی کی پہلی اولاد ہوئی تو حارش مزید تنہائی کا شکار ہو گیا۔ اعظم علی کبھی کبھار جو توجہ اسے دے دیتے تھے اب وہ بھی ان کی آنکھوں میں چھپنے لگا۔ کیونکہ اب اللہ نے انہیں بیٹا عطا کر دیا تھا۔ وہ تمام گھر والے اس معصوم بچے کو مزید تکلیف دیتے اور شگفتہ کی توجہ بھی اب اس پر سے بالکل ختم ہو گئی۔

گھر کے کام اور ننھے ریان میں لگ کر وہ حارش کو خود سے بہت دور محسوس کرنے لگی تھیں۔ انہیں اپنے معصوم کی فریاد اور شکوہ کرتی نگاہیں بے کل کرتیں اور اگر کبھی ریان سے ہٹ کر وہ حارش کے پاس بیٹھ جاتیں اور ننھا روئے لگ جاتا تو اس کی سانس بہت زیادہ برا مانتیں۔ حد تو جب ہو جاتی جب وہ ریان کی وجہ سے حارش کو مارنے بھی لگ گئی تھیں اور یہ بات ان کا دل چیر دیتی۔ انہوں نے حارش کو سمجھایا بھی تھا کہ وہ زیادہ وقت کمرے میں گزارا کرے۔ مگر وہ بچہ تھا ہنسنے کھیلنے کو مچلتا تھا۔ کبھی ریان کے پاس آ بیٹھتا تو دادی، پھپھو ڈانٹ کر اٹھا دیتیں اور وہ آنکھوں میں آنسو لیے کمرے میں جاتا اور لیٹ کر رونے لگتا۔ اسے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کا یہی ایک طریقہ آتا تھا۔

اسکول سے شکایت آئی تو اعظم علی نے اسے ڈانٹا بھی اور مارا بھی۔ اس دن وہ بھی رو دی تھیں۔ شاید ان کے آنسوؤں کی وجہ سے اعظم نے اسے ٹیوشن ڈال دیا۔ آفٹر آل شگفتہ بیگم کی وجہ سے آج وہ صاحب اولاد تھے۔ اتنی توقع نہ تھی انہیں اپنی بیوی کی۔ ٹیوشن کیا رکھی کہ حارش اب بالکل بھی ان کے پاس نہیں رہتا تھا۔ اسکول سے مدرسے اور شام میں ٹیوشن، رات کو آتے ہی سو جاتا۔ اکثر اب وہ رات میں



کھانا بھی نہیں کھاتا تھا۔ گھر کا کوئی فرد یہ بات محسوس کرے نہ کرے انہیں تو پتہ تھا ناں کہ ان کا بچہ بھوکا سویا ہے۔ وہ اپنے آنسو پی کر رہ جاتیں۔ اتنی بے قدری تھی ان کے بچے کی۔ اگر یہ لوگ سمجھ بوجھ والے ہوتے تو حارش کو آنکھوں پر ہٹھا کر رکھتے کہ اس کے نصیب سے ہی ان کے سونے گھر میں بچے کے قلقلاریاں گونجی ہیں۔ یہ اس قدر جاہل لوگ تھے کہ بس۔ دوسری طرف ان کے اپنے ماں باپ، بھائی بھابھیاں ان کے بیٹے کی شکل دیکھنے کو راضی نہ تھے۔ آخر وہ کیا کرتی.....؟ حارش کا کیا مستقبل ہوگا.....؟ یہ سوچ سوچ کر گھلتی رہتیں۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور جیسے جیسے حارش بڑا ہو رہا تھا اتنا ہی حساس ہو رہا تھا، لیکن پے در پے چار بچوں کی پیدائش نے ان کو ضرورت سے زیادہ مصروف کر دیا تھا، اور جیسے جیسے بچوں کو شعور آ رہا تھا وہ بھی حارش سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ حارش چوری چھپے ان کے ساتھ کھیلتا، خوب خوش ہوتا، مگر اب ان کے ذہنوں میں بھی یہ بات بٹھا دی گئی تھی کہ حارش سے ان کا کوئی رشتہ نہیں ہے اور وہ ان کا سوتیلہ بھائی ہے۔ یہ بات ریان نے سب سے پہلے سیکھی۔ اب وہ بھی حارش کو دیکھتے ہی چڑ جاتا اور اگر وہ مخاطب کرتا تو بدتمیزی سے پیش آتا۔ پہلے پہل انہوں نے ریان کو پیار سے سمجھایا مگر اس پر اثر نہ ہوا کہ اس کی فیور میں سارا خاندان تھا۔ آخر انہوں نے حارش کو ہی منع کر دیا اور پہلی بار انہوں نے حارش کے منہ سے کوئی ایسی بات سنی تھی کہ اندازہ ہو گیا کہ صرف گھر والوں سے ہی نہیں خود اپنی ماں سے بھی وہ بدگمان ہو چکا ہے۔

”آپ کو میری ضرورت نہیں تھی تو آپ مجھے مار دیتیں۔ آج مجھے اتنی افیت نہ سہنی پڑتی۔“ کتنے آنسو اترے تھے اس کی آنکھوں میں، مگر اب اس نے آنسوؤں کو پینا سیکھ لیا تھا۔ اس دن کے بعد اس نے ماں کو مخاطب تک کرنا چھوڑ دیا۔ اس کا میٹرک کا سال تھا لیکن وہ دیکھ رہی تھیں کہ وہ اب سارا دن باہر رہتا تھا۔ کہاں جاتا ہے؟ کیا کرتا ہے؟ انہیں علم نہ تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس نے رات میں بھی آنا کم کر دیا تو وہ پریشان ہوئیں، لیکن اس کا اظہار وہ کس سے کرتیں کہ اعظم علی نے پھر اسے مارنا پینا تھا۔ انہیں پرواہ کب تھی۔ ظاہر ہے وہ صرف ان کا بیٹا تھا۔ یوں بھی اپنے چار بچوں کے بعد حارش کو وہ کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ اگر وہ اس کی ضروریات پوری کرتے تھے تو صرف شگفتہ کی وجہ سے، ورنہ گھر والوں کے کہنے میں آ کر وہ کب کا اسے گھر سے پھینک چکے ہوتے۔

اس کے ایگزام کے لیے فیس جمع کرانی تھی لیکن پتہ نہیں وہ گھر کیوں نہیں آ رہا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو اس نے اسکول چھوڑ دیا ہو.....؟ غلط دوست نہ بنا لیے ہوں.....؟ جانے کیسے کیسے وہم ہر وقت پریشان کر کے رکھتے تھے۔

آج کئی دن کے بعد وہ آیا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ تقریباً سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں تھے۔ دروازہ انہوں نے ہی کھولا تھا۔ اسے دیکھتے ہی جان میں جان آئی۔ لیکن وہ اس سے یہاں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھیں اس لیے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے کمرے میں لے آئیں۔

”کہاں تھے تم اتنے دن سے؟ اور کن لوگوں میں رہنے لگے ہو؟ جانتے ہو میں کتنی پریشان تھی۔“

”آپ کو بھی فکر ہوتی ہے میری.....؟ کتنا کانڈ ار لہجہ تھا۔“

”حارش! زبان درازی مت کرو۔ آج کے بعد تم مجھے بتائے بنا کہیں نہیں جاؤ گے۔ تمہارے پیپرز ہونے والے ہیں اور تمہیں پرواہ.....“

”اس کی پرواہ ہے مجھے لیکن میں اب آپ کے شوہر کا مزید احسان لینا نہیں چاہتا اسی لیے میں نے خود اپنا بوجھ اٹھانا سیکھ لیا ہے۔ آپ برائے مہربانی میری فکر چھوڑ دیں اور صرف اپنے بچوں کی فکر کریں۔ میں اب الحمد للہ اپنا خیال رکھ سکتا ہوں اور میں آپ کو صرف یہ ہی بتانے آیا تھا کہ اب میں یہاں نہیں رہوں گا۔ اپنے کپڑے اور کتابیں اٹھانی تھیں، سو اس لیے آیا تھا۔“ اس نے اپنی بات مکمل کی اور اٹھ کر اپنی چیزیں سیٹھنے لگا۔ بت بنی شگفتہ کی طرف دیکھا تک نہیں۔

”تم اتنے بڑے ہو گئے ہو حارث کہ اپنے فیصلے خود کر لو۔“

”بڑا تو میں اسی دن ہو گیا تھا جس دن اعظم علی کا بیٹا اس دنیا میں آیا تھا، بس اب تو آپ کو علم ہوا ہے۔ اتنے سال ہو گئے ہیں آپ نے کبھی میرے بارے میں سوچا بھی ہے۔ میں اپنے فیصلے خود ہی کرتا آ رہا ہوں۔ آپ کو آج خیال آیا ہے۔“ اس نے تمام چیزیں اٹھائیں، ان کو جواب دیا اور پھر بنا ان کی شکل دیکھے وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ وہ گم صم کھڑی تھیں جب وہ نکلا تو تیزی سے اس کے پیچھے لپکیں لیکن تب تک وہ دروازہ کر اس کر گیا تھا۔ وہ وہیں ڈھے گئیں اور رو پڑیں۔



”بچے! اپنی ماں سے بدگمان مت ہونا۔ وہ بیچاری مجبور ہے لیکن اس کا کلیجہ بھی پھٹتا ہے تیرے ساتھ سب کا رویہ دیکھ کر۔“ پھوپھو اسے سمجھانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔

”آج تک میرے ساتھ جو بھی زیادتی ہوئی ہے انہی کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اگر وہ ایک بار بھی میری سائیڈ لیتیں تو شاید وہ لوگ مجھے اس طرح نہ دھتکارتے۔ انہوں نے تو ہمیشہ دوسروں کی غلطی پر بھی مجھے مارا ہے۔ پھر بھی آپ ان کی سائیڈ لے رہی ہیں۔“ وہ اپنی عمر سے بڑی باتیں کرتا تھا۔ پھوپھو کو لگانی الوقت اسے سمجھانا بے کار ہے کیونکہ اس کے ذہن ابھی تازے تھے۔

وہ اعظم علی کی کزن تھیں مگر جس دن سے شگفتہ بیاہ کر اعظم کے گھر آئی تھیں وہ اس معصوم بچے پر ہونے والے ہر ظلم کو دیکھ رہی تھیں۔ شگفتہ جب بچوں میں مصروف ہو کر حارث کی طرف سے بالکل ہی لاپرواہ ہو گئیں تو انہوں نے اس کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا۔ حارث کو بھی ان کی محبت بے غرض اور پُر خلوص لگی تو وہ ان سے انچھ ہو گیا۔ وہ اسکول کے بعد پھوپھو کے پاس آ جاتا۔ سارا دن یہیں گزارتا، طلحہ کے ساتھ کھیل کر، اس کے ساتھ بیٹھ کر ہوم ورک کر لیتا۔ شام کو گھر آ کر سو جاتا۔ اکثر وہ کھانا بھی پھوپھو کی طرف ہی کھا لیتا تھا۔ اگر پھوپھو نہ ہوتیں تو جس طرح اس کی ماما اس کی ذات سے لاپرواہ ہو گئی تھیں یا تو وہ مرجاتا اور نہ پھر غلط ہاتھوں میں چلا جاتا، لیکن پھوپھو کی ماں جیسی محبت نے اس کی ذات کا اعتماد کھونے نہ دیا۔ وہ دن بدن ان کے اور طلحہ کے قریب ہوتا چلا گیا۔

جب وہ آٹھویں میں تھا تو اس نے اسکول کے ساتھ ساتھ شام میں الیکٹریشن کی شاپ پر جانا شروع کر دیا۔ کچھ اس کا انٹرسٹ تھا کہ وہ الیکٹریکل انجینئر بننا چاہتا تھا، کچھ اس کی ضرورت، کیونکہ اعظم علی پر مزید بوجھ بن کر اپنی زندگی مزید برباد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی چیزیں اپنی پاکٹ منی سے جو دکان سے ہر ہفتے ملتی تھی خریدنا شروع کر دیں اور اب جبکہ وہ میٹرک میں تھا تو



اچھا خاصا کام بھی سیکھ چکا تھا۔ وہ اب بھی شام میں اسی شاپ پر کام کرتا تھا۔ اب اس کی پاکنٹ منی بھی بڑھ چکی تھی۔ سوائے لگا کہ اب وہ خود اپنا خرچ اٹھا سکتا تھا، اس لیے وہ اپنی ماما کا گھر چھوڑ کر پھوپھو کے پاس آ گیا۔

طلحہ اس کے مستقل آنے سے بہت خوش تھا۔ اب وہ صبح میں مل کر اسکول جاتے۔ پھر شام میں اکٹھے کام پر۔ چونکہ پھوپھو بیوہ تھیں اور وہ خود سیکنڈری اسکول میں ٹیچر تھیں، طلحہ بھی چاہتا تھا وہ اپنی ماما کے ساتھ مل کر کام کرے۔ دونوں کا وقت اچھا گزر جاتا۔ ساتھ ساتھ ہنر بھی آ گیا تھا، اور اپنے پیروں پر کھڑا ہونا انہیں اچھا لگتا تھا۔ وقت اسی طرح گزرتا چلا گیا۔ اس کی ماما پھوپھو کے گھر آ جاتی تھیں کبھی کبھار اس سے ملنے۔ لیکن اس کے دل پر اب گہری گرد چھا چکی تھی۔ وہ اپنی ماما سے بہت دور جا چکا تھا۔ اسے اب ان کی آنکھوں کی نمی ڈھونگ اور ان کا پیار محض ڈرامہ لگتا تھا۔

کتنے سال یوں ہی بیت گئے۔ وہ دونوں تعلیم مکمل کر کے اب پروفیشنل لائف اسٹارٹ کر چکے تھے اور اپنی پسندیدہ جاب پا کر وہ بہت خوش بھی تھے۔ طلحہ ہر قدم پر اس کے ساتھ تھا۔ ان دونوں نے اپنی الیکٹریشن شاپ بنا رکھی تھی۔ جاب سے پہلے ہی، سو جاب کے بعد بھی وہ اکثر شام کا وقت وہیں گزارتے کہ بے کاری سے بہتر کارگزاری، اور اس طرح وہ کافی پیسہ سیو کر لیتا تھا۔ پھوپھو تقریباً اس کی ساری پے منٹ سیو کرتی تھیں۔ دوکان سے ہی وہ اپنی ضرورت پوری کر لیتا تھا۔ یوں جلد ہی اس نے اتنے پیسے کر لیے کہ اپنا خود کا گھر خرید سکے۔ اب وہ اسی کوشش میں تھا۔ انہی دنوں اچانک پھوپھو کی طبیعت خراب ہو گئی۔ ہائی بلڈ پریشر کی وہ مریضہ تو تھیں لیکن اچانک ان کا بی پی بہت ہائی ہو گیا۔ وہ فوراً ہسپتال لے گئے مگر تب تک دیر ہو چکی تھی۔ پھوپھو کے دماغ کی رگ پھٹ چکی تھی، جس کی وجہ سے وہ اپنی زندگی ہار بیٹھیں۔ اس دن حارش کو لگا کہ اب وہ بالکل تنہا رہ گیا ہے۔ یتیم ہو گیا ہے۔ لیکن طلحہ کی حالت اس سے بھی بری تھی۔ وہ بھی تنہا ہو گیا تھا۔ ان دونوں نے ہی اب ایک دوسرے کو سنبھالنا تھا، کیونکہ اس دنیا میں ان کا ایک دوسرے کے علاوہ کوئی نہ تھا۔

کافی وقت لگا تھا انہیں خود کو سنبھالنے میں۔ مگر وقت نے آخر انہیں سنبھال ہی لیا۔ وہ دونوں تھے اور زندگی کا ایک نیا سفر۔ پھوپھو کے بغیر گھر کھانے کو آتا تھا۔ اب اس گھر میں دل نہ لگتا اس لیے دوسرے علاقے میں گھر خرید لیا اور وہاں شفٹ ہو گئے۔ دکان بھی ختم کر دی۔ اب صرف جاب تھی اور گھر کے کام۔ شام میں دونوں اکٹھے ہوتے تو الٹی سیدھی کہیں، گانے اور مذاق کر لیتے جس سے زندگی تھوڑی سہل ہو گئی تھی اور نئے گھر میں بھی ان کا من لگ گیا تھا۔ آخر زندگی کو تو گزارنا تھا تو وہ ہنسی خوشی سہی۔



دو دن تک طلحہ نے اسے آفس نہیں جانے دیا۔ خود بھی چھٹی کی تاکہ اس کا مکمل خیال رکھ سکے۔ کتنی حیرت کی بات تھی ناں کہ پچھلے دو دن سے وہ پڑوسیوں کے مہمان تھے اور تینوں وقت کا کھانا ان کے گھر سے آ جاتا تھا۔ حارش نے بہت منع کیا مگر وہ انکل نہیں مانے اور پھر ان کا بیٹا جو تقریباً ان کا ہی ہم عمر تھا، اچھے دوستوں کی طرح ان کا خیال رکھ رہا تھا۔

”حارش! کیا بات ہے یار؟ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ آج کل اتنی شرافت اور نیک نیتی کا زمانہ کہاں ہے۔“

’بک نہیں..... یہ لوگ بہت شریف ہیں اور انہیں پتہ ہے کہ گھر کا باورچی بیمار ہے تو کو کنگ کون کرے گا۔ تجھ جیسے بے حس سے انہیں بھی امید نہیں کہ چائے ہی پلا دے گا مجھے۔“

”کیا، کیا یعنی..... میں.....“ وہ چیخا۔

”بس بائیکاٹ..... میں اب تجھ سے بات نہیں کروں گا، دو دن میں ہی بدل گیا۔“ اس نے منہ پھلایا تو حارش ہنس دیا۔

”ارے میرا بھائی تو خفا ہو گیا، میں تو مذاق کر رہا تھا تجھ سے۔ تو نہ ہوتا تو بھلا آج میں یہاں ہوتا؟ جانے کہاں کہاں کے دھکے کھا رہا ہوتا۔“ وہ اب پھر سنجیدہ ہونے لگا تھا۔ طلحہ نے اسے گھورا۔

”اور اگر تو نہ ہوتا تو امی کے بعد میں بھی دھکے کھا رہا ہوتا۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے ضروری ہیں۔“

”ہاں طلحہ! یہ تو ہے یار۔ ایک دوسرے کے بغیر ہمارا ایک پل کا بھی گزارہ نہیں ہے۔“ وہ دونوں باتیں کر رہے تھے جب کاشف آیا۔

”ڈسٹر ب تو نہیں کیا میں نے.....؟“

”ارے نہیں یار آؤ ناں بیٹھو۔“

”تھینک یو۔“ وہ ان کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔

”دراصل مجھے ابو نے بھیجا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ آج شام تم دونوں کھانا ہمارے ساتھ گھر کھاؤ۔“

”کم آن کاشف! دو دن سے تم لوگوں کو ہم زحمت دے رہے ہیں، یہ کافی نہیں ہے۔ پلیز یار..... اب مزید کیوں۔“

”زحمت کی کیا بات ہے یار! پڑوسیوں کے حقوق کتنے ہیں یہ تو تم بھی جانتے ہو، آئندہ ایسی باتیں مت کرنا۔ ہمیں علم ہے کہ تم خود اچھے خاصے گھڑ ہو مگر ایک دو دن ریٹ کرو۔ تمہارا بازو ٹھیک ہو جائے تو پھر بے شک سنبھال لینا اپنا کچن۔“ اس کی بات پر وہ ہنس دیا۔

”تھینک یو یار! تم لوگوں نے ہمارا اتنا خیال کیا ورنہ ہم اس محلے میں بالکل نئے تھے۔ لیکن اب لگتا ہے کہ ہمیں اچھے لوگ مل گئے ہیں۔“ وہ تہہ دل سے مشکور تھا ان کا۔ شام میں دل تو نہیں کر رہا تھا، پہلی بار ان کے گھر جاتے ہوئے جھجک رہے تھے، پر انکل خود دوبارہ بلانے آئے تو انہیں جانا پڑا۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ خوبصورتی سے سجا ڈرائنگ روم بہت اچھا پر سکون سا لگا۔ حالانکہ گرمیوں کا موسم تھا، ان کے جاتے ہی انکل نے کھانا لگوا لیا۔ ان کے ساتھ کھانے کے دوران وہ ہلکی پھلکی گفتگو کرتے رہے۔ طلحہ کے چپکے تو ظاہر ہے کم نہیں ہو سکتے تھے، کھانے کے بعد انہوں نے چائے بنوائی۔

”اور حارش! اب بازو کیسا ہے بیٹا.....؟“

”بہت بہتر ہے انکل! تھینک یو ویری مچ! آپ لوگوں کی مہربانی سے.....“

”یہ ہماری مہربانی نہیں ہے، ہمارا فرض تھا اور بس۔ اور ہاں، آئندہ بھی کسی بھی طرح کی ضرورت ہو تو فوراً بتا دینا، بالکل بھی اکیلا مت سمجھنا خود کو۔“



”جی بہت بہت شکریہ۔“

”اچھا چھوڑ دے شکریہ..... یہ بتاؤ تم لوگ کس علاقے کے رہنے والے ہو، یہیں اپنے شہر کے.....؟“

”جی انکل! ہم ملتان سے ہی بی لوگ کرتے ہیں، بس پہلے یہاں دوسرے ایریا میں تھے۔“

”اور تمہاری باقی فیملی.....؟“ کاشف کے سوال نے ان دونوں کے چہروں کی مسکراہٹ غائب کر دی تھی۔ یہ بات خود انہوں نے

بھی محسوس کی۔

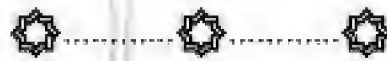
”ہم دونوں کا ایک دوسرے کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ ایک پھپھو یعنی طلحہ کی ممتا تھیں۔ سال بھر پہلے ان کی بھی ڈیٹھ ہو گئی ہے۔“

اس لیے ہم پرانا گھر رینٹ پر چھوڑ کر یہاں شفٹ ہو گئے۔ پھپھو کے بعد اس گھر میں ہمارا دل نہیں لگتا تھا۔“ حارش کی بات سن کر لمحے بھر کو وہ بھی چپ رہ گئے۔

”آئی ایم سوری بیٹا!“ انکل نے افسوس کا اظہار کیا۔

”لیکن بیٹا! خود کو کبھی اکیلا مت سمجھنا، کوئی بھی کام ہو دکھ تکلیف ہر چیز میں ہم تمہارے ساتھ ہیں۔“

”تھینک یو انکل۔“ اس بار طلحہ بولا تھا۔ کافی دیر وہ لوگ بیٹھے رہے، پھر اجازت لے کر آ گئے۔



”بچے اس دنیا میں اکیلے ہیں۔ اللہ کی مصلحت، کتنے پیارے بچے ہیں دونوں۔ سمجھدار، ذمہ دار.....“ دادی کو تو ان سے بہت ہی

لگاؤ ہو گیا تھا۔ جس دن سے یہ پتہ چلا کہ وہ دونوں بالکل اکیلے ہیں، ان سے اور زیادہ ہمدردی ہو گئی تھی۔

”ذمہ دار.....“ حرمین کو ہنسی آ گئی۔ چلو حارش کے بارے میں تو بندہ کہہ سکتا ہے مگر طلحہ اور ذمہ دار۔“

”تو کیوں دانت نکال رہی ہے۔“ دادی نے فوراً ٹوکا۔

”بس یوں ہی دادی! یہ اخبار میں لطیفے پڑھ رہی ہوں۔“

”اچھا سن..... شام تو ہو چلی ہے، تو دو کپ چائے بنا کر بھیج دے ان بچوں کے لیے، تھکے ہارے آئے ہوں گے آتے ہی

چولہے میں گھسیں گے گرمی میں۔“

”اُف دادی! آپ نے تو انہیں بہت ہی.....“ وہ جھنجھلا گئی مگر اندر آتے کاشف کو دیکھ کر بات مکمل نہیں کی اور چپ ہو گئی۔

”حرمین ڈیر! چائے تو پلاؤ زبردست سی۔“ کاشف نے وہیں دادی کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

”جی بھیا! ابھی لاتی ہوں۔“ وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں بھی یہ ہی کہہ رہی تھی اس سے کہ دو کپ چائے بنا کر دیوار پر رکھ دے حارش اور طلحہ کے لیے۔“

”دادی اماں! وہ ابھی گھر نہیں آئے۔ صبح طلحہ ملا تھا مجھے بتا رہا تھا کہ ان کے کسی رشتے دار کی ڈیٹھ ہو گئی ہے انہیں وہاں جانا ہے۔“

”شاید وہیں چلے گئے ہوں گے۔“

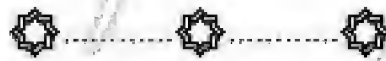
”یقیناً وہیں گئے ہوں گے۔“ تب ہی ابو بھی آگئے اور دادی نے انہیں بھی بتایا۔

”پتہ نہیں مجھے ایسا لگتا ہے کہ حارش اپنے رشتے داروں سے کٹا کٹا ہے، ذکر تک نہیں کرتا کبھی۔“ کاشف بولا، ابو بھی کچھ سوچ رہے تھے۔

”اماں! مجھے حارش کو دیکھ کر جانے کیوں ایسا لگتا ہے کہ میں نے پہلے بھی اسے دیکھا ہے۔ کچھ جانی پہچانی سی شکل اپنا پن سا محسوس ہوتا ہے اسے دیکھ کر۔ مگر اس سے پوچھنے کی ہمت ہی نہیں پڑتی کہ معلوم کروں وہ کون ہے۔ اس کے والد اس کا خاندان.....؟ ایک عجیب سا کھنچاؤ ہے جو مجھے اس کی طرف کھینچتا ہے۔“ ان کے لہجے میں حارش کے لیے اپنا پن صاف چھلک رہا تھا۔ حرمین تو دادی کو ہی کہہ رہی تھی، اب تو ابو بھی ان کے شیدائی نظر آ رہے تھے۔ وہ سب کو چائے دینے لگی۔

”ڈیڑھ گھنٹہ کس کی ہوئی ہے.....؟“ ابو، کاشف سے مخاطب تھے۔

”معلوم نہیں..... حارش تو اس معاملے میں بات کرنا ہی نہیں چاہتا تھا، طلحہ نے مجھے بتایا ہے۔ آئی تھنک وہ حارش کو فورس کر رہا تھا جانے پر، کیونکہ وہ جانا نہیں چاہتا تھا۔“ کاشف کی بات انہیں الجھا گئی۔ اس کے لہجے میں رشتے داروں کے لیے تلخی تو وہ محسوس کرتے تھے کیونکہ وہ صاف الفاظ میں کہتا تھا کہ اس کا دنیا میں کوئی رشتہ ہے ہی نہیں، جو کچھ بھی ہے صرف طلحہ ہے اور بس۔



”حارش یار پلیز! اب تو غصہ تھوک دے۔ دیکھ اگر تو وہاں چلا گیا تھا تو کیا عذاب آ گیا؟“

”میں گیا نہیں تھا، تم زبردستی لے کر گئے تھے مجھے۔“ وہ بھڑک اٹھا۔ اس نے تو قسم کھائی تھی اب دوبارہ زندگی میں اعظم علی کے گھر نہیں جائے گا، مگر اعظم علی کی ڈیڑھ کی خبر آئی تو طلحہ زبردستی اس لے گیا تھا۔

”مجھے پتہ ہے کہ میں تجھے لے گیا تھا، اگر کوئی غیر بھی ہوتے تو تم ضرور جاتے، تو کیا فرق پڑا کہ تم چلے گئے۔“

”طلحہ! میرا ہر زخم تازہ ہو جاتا ہے وہاں جا کر۔“ اس کے لہجے میں درد تھا، طلحہ سمجھتا تھا۔

”آئی نو..... لیکن تجھے پتہ ہے حارش! آنٹی شگفتہ کی آنکھیں تجھے کس بے تابی سے ڈھونڈ رہی تھیں۔ کاش تو ایک بار اندر جا کر ان سے مل لیتا۔ انہوں نے مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھا تو میں کہہ بھی نہ سکا کہ تم آئے ہو۔“

”اچھا کیا، وہ میرے اندر کے دکھوں کی ذمہ دار ہیں۔ میں ان سے ملنا نہیں چاہتا۔“ شاید اس کے بچپن کے حالات تھے ہی ایسے کہ وہ ماں سے بھی بدگمان تھا، کاش شگفتہ اپنی تمام تر مصروفیت میں سے اس کے لیے بھی کچھ توجہ پیار نکال پاتیں۔ ان کی بے توجہی نے آج ان کے بیٹے کو بہت دور کر دیا تھا ان سے۔

”تمہارے نانا اور ماموں بھی تمہیں دیکھ رہے تھے۔“

”طلحہ! کیا مسئلہ ہے تیرے ساتھ.....؟ آج تو کیوں میرے زخم ہرے کر رہا ہے، جب ایک بار میں کہہ چکا ہوں کہ میرا کوئی ہے ہی نہیں تو کیوں ایک ایک رشتے میرے سامنے لے کر گن رہا ہے۔“ اس کی برداشت کی حد ختم ہو چکی تھی۔

”رشتے کبھی ختم نہیں ہوتے حارش! صرف تمہارے کہنے سے کہ تمہارا کوئی نہیں ہے، سارے رشتے مرنے نہیں جائیں گے۔ تلخیاں زندگی کا حصہ ہیں بیٹا! مگر ان سے نا عمر نہ نہیں موڑ سکتے تم۔ ہاں کچھ وقت ایسا آتا ہے کہ ہم سب سے کٹ جاتے ہیں، لیکن خون کے رشتے یوں نہیں ٹوٹتے۔“ انکل جانے کب آ گئے تھے۔ اس کے اندر کی تلخی محسوس کیے بنا نہیں رہ سکے۔

”انکل! اپنے نصیب میں خون کے رشتے تھے ہی کہاں۔ سارے رشتے ملے وہ بھی سوتیلے اور ظاہر ہے سوتیلے رشتوں کا زہر تو رگوں میں اترنا ہی تھا ناں، سو مجھے رشتوں ناتوں نے صرف زہر دیا ہے۔ بدگمانی اور نفرت سکھائی ہے۔ پھر آپ بتائیں میرے اندر سے اور کیا نکلے گا سوائے اس کے کہ میرا کوئی ہے ہی نہیں۔“ اس کا لہجہ بھیگ گیا۔

”سوتیلے رشتے۔“ وہ کچھ اچنبھے سے بولے۔

”انکل! حارش کی پیدائش کے چھ ماہ بعد ہی اس کے پاپا کی ڈیوٹی تھوڑی تھی اور آئی کو ان کے سسرال نے منحوس اور بد نصیب جیسے طعنے دے کر گھر سے نکال دیا۔ آئی چھ ماہ کے بچے کو لیے اپنے ماں باپ کے گھر آ گئیں۔ دو سال گزر گئے۔ جیسے جیسے حارش نے ہوش سنبھالا، اسے ماموں ممانیوں کی آنکھوں میں صرف نفرت ملی، وہ چاہتے تھے کہ یہ بچہ مر جائے یا کہیں دفع ہو جائے۔ انہی حالات میں شگفتہ آئی کا ایک رشتہ آیا، اعظم علی کا، جن کی پہلی بیوی سے اولاد نہیں تھی، سو وہ دوسری شادی کے خواہشمند تھے۔ حارش کے نانا نانی نے رضا مندی دے دی۔ اس طرح آئی حارش کو ساتھ لیے وہاں سے اعظم علی کے گھر آ گئیں۔ انہیں لگا شاید ان کے معصوم بیٹے کو یہاں قدر مل جائے۔ یہ گھر انہیں بچوں کو ترسا ہوا تھا مگر ایسا نہ ہوا۔ ان کے معصوم کی یہاں بھی تذلیل تھی۔ اعظم علی کی جب تک اپنی اولاد نہ ہوئی تب تک وہ حارش کو پیار کرتے تھے مگر پہلے بیٹے کی پیدائش کے بعد حارش ان کے کیا اپنی ماں تک کے پیار کو ترس گیا اور جیسے جیسے وقت گزرتا رہا، حارش کے اندر رشتوں ناتوں سے نفرت پیدا ہوتی گئی، حتیٰ کہ آج یہ اپنی سگی ماں سے بھی بدظن ہے۔“ طلحہ کی زبانی ساری بات سن کر ان کا دل بھر سا آیا تھا۔ انہوں نے حارش کو کندھوں سے تھام کر اپنے سامنے کیا۔

”آئی ایم سوری بیٹا! شاید تم بھی اپنی جگہ سچ ہو مگر ایک بات بتاؤ..... تم نے کبھی اپنی ماما سے اپنے سگے رشتوں کے بارے میں جاننے کی سعی نہیں کی؟ تمہارے پاپا کے بہن بھائی، ماں باپ.....“

”کس لیے جانتا انکل.....؟ چھ ماہ کے بچے کو انہوں نے گھر سے نکالا تب انہیں خیال تک نہ آیا کہ وہ ان کے مرحوم بیٹے کی نشانی ہے، تو میں کیوں اپنے آپ کو مزید اذیت دیتا۔ انہیں تلاش کر کے اگر میں ان کے پاس چلا بھی جاتا اور وہ بھی میرے ساتھ وہی سلوک کرے جو میرے سوتیلے رشتوں نے کیا پھر کیا بھرم رہ جاتا میرا.....؟ اب تو دل کو پھر بھی یہ آسرا ہے کہ رشتے سوتیلے تھے، کم از کم خود کو تسلی تو دیتا ہوں کہ سوتیلے رشتے اپنے نہیں بن سکتے۔ آپ بتائیں انکل! اگر ایسا ہوتا تو پھر میں خود سے کیا کہتا.....؟ میرا تو ہر رشتے سے اعتبار

بالکل ہی اٹھ جاتا.....“ کتنا بڑا کچ تھا جو وہ کہہ رہا تھا اس کی بات کی گہرائی جان کر وہ چپ سے ہو گئے۔

”کیا نام تھا تمہارے پپا کا.....؟“

”سلطان عالم.....“ اس کی زبان سے نکلا نام ان کی سماعتوں پر بم کی طرح گرا تھا۔ وہ بے یقینی سے اس کی شکل دیکھ رہے تھے۔

”کیا نام بتایا تم نے.....؟ شاید انہیں سننے میں غلطی ہوئی ہو۔“

”سلطان عالم۔“ حارش نے انکل کو غور سے دیکھا۔ ان کے چہرے کا اڑتا رنگ دیکھ کر ٹھٹھکا۔

”خیریت انکل.....؟“

”تم سلطان کے بیٹے ہو.....؟“ ان کو اب بھی بے یقینی سی تھی، حارش، سلطان کا بیٹا تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی کا بیٹا۔ ان کا اپنا

خون تھا وہ..... تب ہی اس کو دیکھ کر ان کو اپنے پن کا احساس ہوتا تھا۔ ہاں اس کے چہرے میں سلطان کی شبیہ جھلکتی تھی، وہ جو اس کی

صورت میں ہمیشہ کسی کا چہرہ تلاشتے تھے آج خود ہی جواب پا گئے۔ ان کی حالت طلحہ اور حارش دونوں ہی حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

چہرے پر پھیلی بے یقینی اور آنکھوں میں بھرا پانی، لہجہ بھیگا بھیگا تھا۔

”کیا بات ہے انکل.....؟“ طلحہ نے ان سے پوچھا، مگر وہ کوئی بھی جواب دیئے بنا تیزی سے چلے گئے اور انہیں پریشان چھوڑ گئے۔



یعنی سلطان نے سوتیلے پن کے جتنے دکھ جھیلے اس سے کہیں زیادہ اس کا بیٹا جھیل رہا ہے۔ کاش ان کے ابا دوسرا نکاح کرنے

سے پہلے سوچ لیتے تو آج حارش کا یہ حال نہ ہوتا اور نہ ہی ان کا بھائی جوانی میں اللہ کو پیارا ہوتا۔ وہ جب سے حارش کے پاس سے آئے تھے

اپنے کمرے میں بند تھے اور اگلی صبح ہی باہر آئے تھے۔ ناشتے پر سب انکا اتر چہرہ، سو جھی آنکھیں دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے۔

”کیا بات ہے فرمان! تیری طبیعت ٹھیک ہے بچے.....؟ کل شام سے تو کمرے میں بند ہے اور اب آیا ہے۔ تیرا چہرہ اتر ا ہوا

ہے تو رویا ہے کیا.....؟“ اماں سے ان کی خاموشی برداشت نہیں ہوئی، باقی سب تو ہمت باندھ رہے تھے کچھ پوچھنے کی۔ انہوں نے کپ

نیچے رکھا اور اماں کو دیکھنے لگے۔

”اماں! بعض اوقات ہمارے بڑوں کی، کی گئی چھوٹی سی غلطی ہماری نسل در نسل خمیازہ بھگتی ہے۔“ ان کی بات کسی کی بھی سمجھ

میں نہیں آئی تھی۔

”کیا مسئلہ ہے.....؟ آخر کیا وجہ ہے جس نے آپ کو اتنا آپ سیٹ کر رکھا ہے۔“ شاید شریک حیات ہونے کے ناطے وہ ان کو

اتنا دکھی دیکھ کر برداشت نہیں کر پار ہی تھیں۔

”عالیہ نیگم! ہمارے ابا نے جو کیا اس کی سزا ہم آج تک سہہ رہے ہیں، سلطان دنیا سے چلا گیا اور.....“ ان کا لہجہ بھرا آیا، ان کی

بات پر سب ہی دکھی تو ہوئے تھے مگر آج اتنے سالوں بعد یہ قصہ؟ بابا کا یوں یکدم آپ سیٹ ہونا..... ان کی آنکھیں گواہ تھیں ان کے رونے



کی، لیکن کیوں؟ اب یہ باتیں یاد کر کے رونے کا کیا فائدہ تھا.....؟

”بابا جانی! ہم سمجھتے ہیں سب مگر اتنے سال بیت گئے اس بات کو، اب کیا حاصل یہ سب یاد کر کے خود کو ذہنی تکلیف دینے کا؟ چاچو کا دکھ دل میں ہے مگر آپ کیوں اب یہ باتیں از سر نو سوچ سوچ کر خود کو دکھی کر رہے ہیں.....؟“

”اس لیے بیٹا! جو دکھ سلطان نے جھیلے ہیں اب وہ دکھ اس کا بیٹا جھیل رہا ہے اور تمہیں پتہ ہے کہ اس بچے کا رشتوں پر سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔ وہ خود کو تنہا بتاتا ہے حالانکہ اس کے پاس تمام رشتے ہیں لیکن چند سوتیلے رشتوں نے اس کو اتنی اذیتیں دیں کہ اس کا کائنات کے ہر رشتے سے بھرم اٹھ گیا، اور جانتے ہو کہ وہ کون ہے جو سلطان کا بیٹا ہے.....؟ جس کے بارے میں آپ کو بتا رہا ہوں..... وہ حارش ہے..... حارش عالم..... جو ہمارا اپنا خون تھا اور ہم بے خبر تھے، جو دکھوں کے سمندر میں اکیلا ہاتھ پیر مارتا رہا اور ہمیں خبر بھی نہیں ہوئی۔ مجھے کل پتا چلا کہ کیوں اسے دیکھ کر میرا دل مچلتا ہے، ظاہر ہے وہ خون ہے ہمارا، میرے بھائی کی نشانی۔“ یہ سب بتاتے ہوئے جہاں ان کا لہجہ بھرا یا تھا آنکھوں سے آنسو بھی ٹپک پڑے، اور دادی یہ سب سن کر بری طرح رو دیں۔

”میرے سلطان کا بیٹا یہاں میرے پاس رہتا رہا اور میں بے خبر رہی۔“

”حارش، سلطان چاچو کا بیٹا ہے“ یہ بات ان کے لیے بھی حیرت انگیز تھی۔

”جی بیٹا.....“ بابا نے انہیں حارش کے بارے میں ایک ایک بات بتائی تو سب ہی اشک بار ہو گئے۔

”اس لیے اس کے اندر اتنی تلخی ہے۔“ کاشف بولا۔

”ہوں..... اگر طلحہ اور اس کی مادر حارش کو نہ سنبھالتے تو جانے آج حارش کہاں ہوتا۔“

”تو مجھے لے چل حارش کے پاس۔“ دادی آنسو صاف کرتے ہوئے بولیں۔

”اماں! میں نے ابھی حارش سے کوئی بات کی ہی نہیں، سچ تو یہ ہے کہ جب میں نے اس کے اندر رشتے ناتوں کی طرف سے اتنی

تلخی اور بدگمانی دیکھی تو میری ہمت ہی نہیں ہوئی کہ اس سے کوئی بات کہہ سکوں۔ وہ بھی تو اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہے، اگر وہ میرے بتانے پر مجھ سے یہ سوال کر لیتا کہ آج تک ہم نے اس کی خبر کیوں نہیں لی تو ہم کیا جواب دیتے اسے؟“

”پر بابا! ہمیں تو علم نہیں تھا کہ سلطان چاچو کا بیٹا بھی تھا اور اس میں ہمارا کیا قصور تھا۔“

”آپ صحیح کہہ رہے ہو بچے مگر جن حالات سے اس وقت حارش گزر رہا ہے وہ کبھی بھی ہمیں قبول نہیں کرے گا۔ اس وقت تو وہ

اپنی سگی ماں سے بھی بدگمان ہے پھر بھلا.....“

”بابا! آپ کو نہیں لگتا کہ اس سارے قصے میں واقعی چچی جان قصور وار ہیں، ان کی بے توجہی نے حارش کو بدگمان کیا، اگر وہ

مضبوطی سے حارش کو تھامے رہتیں تو اس گھر میں اس کی اتنی تذلیل نہ ہوتی اور اگر وہ واقعی اس معاملے میں مجبور تھیں تو حارش کو اس کے اپنوں کے بارے میں سچائی بیان کرتیں تاکہ حارش کے دل میں ہمارے لیے کم از کم بدگمانی نہ ہوتی۔ آج اگر ہم اس کے پاس جاتے تو ہمیں یہ ڈر

نہ ہوتا کہ وہ ہمیں اپنائے گا یا نہیں۔ حارش ٹھیک کہتا ہے سارا قصور شگفتہ چچی کا ہے۔“ حرمین کی فل فیور حارش کے ساتھ تھی۔  
 ”بیٹا! ہو سکتا ہے حالات ایسے نہ ہوں کہ شگفتہ حارش کو سب بتا سکتی۔“

”بابا! ایسی صورت میں وہ آپ سے رابطہ کر سکتی تھیں۔ احسان چاچو سے رابطہ کر سکتی تھیں۔ وہ حارش کو اسی وقت ہمارے حوالے کر دیتیں تو آج اس کا اعتبار نہ ٹوٹتا۔“ کاشف نے بھی حرمین کا ساتھ دیا۔

”بھلا ماں کب چاہے گی کہ اس کے کلیجے کا ٹکڑا اس کی نظروں سے دور رہے۔ شگفتہ کب اسے خود سے الگ کرنا چاہتی ہوگی۔“  
 ”اور دادی! اب بھی تو وہ الگ ہی رہ رہی ہیں ناں! اب تو ان کا بیٹا ان کو دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔ اگر وہ اس وقت کوئی اچھا فیصلہ کر لیتیں تو آج کم از کم حارش کے دل میں ان کے لیے یہ بدگمانی نہ ہوتی۔“ حرمین نے کہا تو وہ خاموش سی ہو گئیں۔ وہ بھی تو کتنے عرصے اپنے بچوں سے دور رہی تری رہی ہیں اپنی اولاد کی شکل کو بھی مگر آج وہ اپنے بچوں کے ساتھ ہیں اور ان کے بچوں کے دلوں میں ان کے لیے پیار ہی پیار ہے۔ شاید یہ اس صبر کا پھل ہے کہ وہ اتنے سالوں ان کے لیے تری رہی ہیں، روتی رہی ہیں لیکن انہوں نے شوہر کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ بس خاموشی سے وقت گزارتی رہیں۔ آخر اللہ نے ان کی سنی اور ان کے بچے ان کے پاس لوٹ آئے۔ سوائے سلطان کے۔ اس کے دنیا کے جانے کی خبر ان تک پہنچی تھی۔ ان کا سب سے لاڈلا اور چھوٹا بیٹا جو صرف پانچ سال کا تھا جب اس کے ابا لے گئے تھے۔ اس دن کے بعد انہوں نے اپنے بیٹے کو نہیں دیکھا۔ اور دیکھا تو سفید کفن میں لپٹا چہرہ، اور اس کی بلکتی تڑپتی بیوہ..... یہ تو انہیں آج علم ہوا کہ سلطان کا بیٹا بھی تھا۔ سوئم سے اگلے دن جب فرمان اور احسان اپنے بھائی کی بیوہ کو لینے گئے تو پتا چلا کہ اس کے ماں باپ اسے اپنے گھر لے گئے ہیں اور اب انہیں حقیقت پتہ چلی تھی کہ اس ظالم عورت نے جس نے ان سے ان کے بچے چھین لیے تھے اس نے شگفتہ کو گھر سے نکال دیا تھا۔ اگر انہیں علم ہوتا کہ ان کا پوتا بھی ہے تو کہیں نہ کہیں سے اسے ضرور ڈھونڈ نکالتے۔ آج یہ انکشاف سن کر وہ برداشت نہیں کر پار ہی تھیں کہ فوراً جا کر حارش کو گلے لگا لیتیں۔

”فرمان! میں خود حارش سے بات کر لوں گی، تو مجھے اس کے پاس لے چل۔“

”اماں پلیز! آپ حوصلہ رکھیں۔ کچھ وقت دیں مجھے، ان شاء اللہ کوئی نہ کوئی حل تو نکلے گا۔ میں آج احسان سے مل کر بات کرتا ہوں، کوئی تو راستہ ہو گا ناں آخر۔“

”جی بابا! چاچو احسان سے بات کرنا بھی ضروری ہے۔ آپ ٹھیک سوچ رہے ہیں۔ حارش کے لیے یہ سب کچھ قبول کرنا بہت مشکل ہوگا۔“ کاشف بولا تو وہ بھی سر ہلانے لگے۔



بڑی حیرت کی بات تھی ناں کہ آج جب وہ گھر لوٹا تو شام کا کھانا کچن میں بالکل تیار تھا۔ طلحہ اتنا اچھا بھی ہو سکتا ہے، اسے یقین نہیں تھا۔ وہ بڑے موڈ میں نہا کے فریش ہو کر مچن میں رکھی چیئر پر بیٹھ گیا، شاید طلحہ کہیں باہر گیا تھا۔ وہ انتظار کر رہا تھا، جب ایک نسوانی آواز

اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

”حارش بھائی!“ اس نے ادھر ادھر دیکھا، پھر گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تو دیوار پر موجود لڑکی نظر آئی، ساتھ ہی ٹرے جس میں یقیناً چائے کا کپ تھا۔

”حارش بھائی! یہ چائے لے لیں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے یہ قطعی پسند نہیں تھا لیکن وہ انکل اور کاشف کے خلوص کے آگے بے بس ہو جاتا تھا۔

”دیکھیں پلیز..... آپ پریشان مت ہوا کریں۔ میں خود بنا لیتا۔“

”کوئی بات نہیں حارش بھائی! چائے بنانے سے ہمیں کیا پریشانی ہوگی۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

”اور ہاں! آج کھانا کھانے کے بعد بتائیے گا ضرور کہ کھانا کیسا بنا تھا؟“ اس کی بات پر اسے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ یعنی کھانا طلحہ نے نہیں بنایا تھا۔

”آپ نے کھانا بنایا.....؟ وہ طلحہ.....“

”وہ طلحہ بھیا کاشف بھائی کے ساتھ کسی کام سے گئے ہیں، کاشف بھائی نے مجھے کہا تھا کھانا بنانے کا، اس لیے میں نے بنا دیا۔ آپ کو برا لگا، تو سوری۔“ اگر پہلے کی طرح وہ صرف پڑوسی ہوتے تو عمر بھر بھی وہ حارش سے اتنی بات نہیں کرتی لیکن اب وہ جانتی تھی کہ وہ غیر

نہیں اس کا سگا چچا زاد بھائی ہے، جانے کیوں اس کا من چاہا حارش کی ہیلپ کرنے کا، سو اس نے کھانا بنا دیا، اور آتے ہی چائے بنا لائی۔

”برا تو نہیں لگا لیکن پلیز..... ہمارے لیے فکر مت کیا کریں۔“ اس نے چائے کا کپ تھامتے ہوئے صرف ایک نظر اس کے

چہرے پر ڈالی تھی، پھر رخ موڑ گیا۔

”اینٹی وے، تھینک یو ویری مچ..... چائے اور کھانا دونوں کے لیے۔“ بہت تکلف تھا اس کے لہجے میں، حرمین نے اسے دیکھا، بظاہر وہ اس کے سامنے تھا مگر رخ اس نے دوسری طرف کیا ہوا تھا، شاید اس لیے کہ حرمین پر نظر نہ پڑے۔

”آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو آپ فوراً کہہ دیا کریں۔“

”بڑی مہربانی۔“ وہ چاہتا تھا کہ اب حرمین چلی جائے۔ شاید وہ بھی یہ سمجھ گئی تھی تب ہی فوراً دیوار سے پیچھے ہو گئی اور حارش نے سکھ کا سانس لیا۔ اسے اعتراض حرمین پر نہیں تھا مگر وہ نہیں چاہتا تھا محلے پڑوس کے کسی دوسرے گھر سے کوئی بھی شکایت یا بات سننے کو ملے۔

حالانکہ ایسا پہلی بار ہوا تھا، فرمان انکل کے گھر سے کوئی خاتون اس سے مخاطب ہوئی ہو، وہ بھی یہ لڑکی۔ کتنے ماہ بیت گئے تھے، اس نے آج پہلی بار اس دوشیزہ کو دیکھا تھا۔ ورنہ کوئی کام ہوتا کاشف یا فرمان انکل خود ہی آتے تھے۔

”دو دن سے انکل نظر نہیں آئے تھے، اس دن وہ پچا کا نام سن کر کچھ آپ سیٹ سے بھی ہوئے تھے، آخر کیوں.....؟“ اس کا ذہن پھر الجھنے لگا تو اس نے سر جھٹکا اور اپنی چائے انجوائے کرنے لگا جو بہت مزیدار تھی۔



”چائے اتنی زبردست ہے تو یقیناً کھانا بھی ٹیسی ہوگا۔“ اس نے دل میں سوچا اور طلحہ کا نمبر ڈائل کرنے لگا، تاکہ پتہ چلے وہ کہاں ہے۔



کتنا عجیب سا ماحول تھا اس وقت اس کے گھر کا، اتنے سارے لوگ تھے مگر سناٹا تھا، عجیب سی خاموشی تھی، ہر نظر اس پر تھی، ہر نظر میں پیار تھا، اپنا پن تھا، مگر کوئی اس سے پوچھتا اس کی کیا حالت تھی اس کے اندر کتنی توڑ پھوڑ تھی۔

”ہم نے آپ کو ایک ایک بات بتادی ہے، آپ ذی شعور ہیں، سمجھدار ہیں، خود فیصلہ کریں کہ ہمارا کیا قصور ہے.....؟ ہم قطعی لاعلم تھے اس بات سے کہ سلطان کی کوئی اولاد بھی ہے، ورنہ ہم نے جتنے دکھ جھیلے تھے بچے، ہم آپ کا بچپن کبھی ان دکھوں میں نہ گزرنے دیتے، اب ہمیں پتہ چلا ہے تو ہم آپ کو اپنانے کے لیے آئے ہیں، لینے آئے ہیں، آج سے آپ اکیلے نہیں ہیں، آپ کے پاس ہر رشتہ ہے، سچا اور خون کا، ان شاء اللہ آپ کو ہر رشتے سے پیار ہی ملے گا۔“

”لیکن اب کیا فائدہ..... اب مجھے ضرورت ہی نہیں رہی۔ میں نے تنہا جینا سیکھ لیا ہے۔ آپ خود بھی یہ بات جانتے ہوں گے کہ رشتے توجہ، محبت، احساس، ان سب کی بچپن میں زیادہ ضرورت ہوتی ہے اور جب میں نے وہ عمر گزاری تو اب تو میں اپنا خیال خود رکھ سکتا ہوں، اب مجھے کسی کی ضرورت.....“ وہ یقیناً بہت تلخ ہو رہا تھا۔ طلحہ نے اس کے ہاتھ پر دباؤ دیا تو وہ نہ چاہتے ہوئے سر جھکا گیا اور خاموش ہو گیا۔

”اب تو مجھے سزا دے گا، پانچ سال کا تھا میرا سلطان جب تیرے دادا نے میری گود سے اٹھا کر اسے سوتیلی ماں کی گود میں ڈال دیا تھا اور میں عمر بھر ترستی رہی اپنے بچے کو دیکھنے کو، اور جب وہ سامنے آیا تو کیسے کفن میں لپٹا، خاموش..... میرا کلیجہ پھٹ گیا تھا اور اب جب مجھے تیری صورت میں اپنا سلطان مل گیا ہے تو اب تو میری سزا بڑھا دے۔ میں یوں ہی ترستی تڑپتی قبر میں چلی جاؤں گی۔“ دادی بری طرح رو دیں۔ اس کے دل کو کچھ ہوا ضرور تھا، مگر جانے کیوں.....؟ اس کے اندر عجیب سی سرد مہری تھی، تمام حالات جاننے کے بعد بھی..... وہ جان گیا تھا کہ اس کے چچا، تانیا سب بے قصور ہیں، مگر شاید حالات نے اس کا اعتبار کہیں کھودیا تھا۔ وہ چاہ کر بھی کسی رشتے پر اعتبار نہیں کر پارہا تھا۔ بہت سمجھانا چاہتا تھا وہ خود کو، لیکن اس کے اندر کی توڑ پھوڑ اس وقت بہت زیادہ تھی کہ اسے اپنے اندر کے شور کے علاوہ کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی لیکن دادی کو اس طرح روتا دیکھ کر وہ کچھ نرم پڑ گیا۔

”میں نے ایسا کچھ نہیں کہا، مجھے یقین ہے کہ آپ لوگوں نے جو کہا وہ سچ ہے مگر..... میں.....“ جانے کیوں اس کی آواز اس کے اندر ہی کہیں گھٹ گئی، فرمان عالم نے اٹھ کر اسے خود سے بچھین لیا۔

”کچھ مت بتاؤ بیٹا! ہمیں اچھی طرح اندازہ ہے کہ تم پر اس وقت کیا بیت رہی ہوگی۔ بیٹا! ہماری بانہیں تمہارے لیے کھلی ہیں، تم جب چاہو آ کر سا جانا۔ پر بیٹا! تمہیں وقت چاہیے اپنے آپ کو سمجھانے کے لیے، منانے کے لیے، وہ تمہارا حق ہے، تم جتنا ٹائم لینا چاہتے ہو لے لو، بس اپنی دادی کے لیے دل میں تھوڑی گنجائش بنا لو۔“ ان کی بات پر وہ سر جھکا گیا۔ شاید ان کی بات کا مطلب سمجھ گیا تھا، تب ہی اس



نے سر ہلایا۔ پھر احسان عالم نے اسے سینے سے لگا کر بہت پیار کیا، حتیٰ کہ وہ رو پڑے۔

”ہمیں معاف کر دینا بیٹا! انجانے میں سبھی ہم بھی تمہارے قصور وار ہیں۔ کاش ہمیں علم ہو جاتا تو شاید آج ہمارے بیچ یہ فاصلہ نہ ہوتے۔“ وہ سمجھ ہی نہیں پار رہا تھا کہ کیا کہے۔ بس خاموشی ہی خاموشی تھی۔ احسان عالم سے مل کر وہ دادی کے قدموں میں آ بیٹھا۔

”آئی ایم سوری دادی! میں آپ سے آپ کا بیٹا کبھی نہیں چھینوں گا۔“ اس نے کہا تو دادی نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر چوم لیا۔

”جیتا رہ میرا بچہ۔“ کتنا سکون سا ملا تھا ان کی گود میں، دل بھر آیا تھا مگر اس نے خود کو مضبوط کیا ہوا تھا۔ کتنا وقت وہ اس کے پاس بیٹھے اسے مناتے رہے۔

”حارش! تم بے شک ہمیں اپنا نہ سمجھو مگر تم ہماری اولاد ہو، اور بڑے ہونے کے ناتے ہم تمہیں کہہ رہے ہیں، ہمارے گھر کے دروازے تمہارے لیے کھلے ہیں، تم ہمارے ساتھ رہو، ہمارے پاس۔“

”تھینک یو انکل مگر.....“

”آج کے بعد مجھے بابا کہا کرو کاشف کی طرح۔“ انہوں نے درمیان میں ٹوک دیا۔

”دراصل فاصلہ ہی کتنا ہے مجھے کسی بھی چیز کی ضرورت ہوئی تو میں ضرور آؤں گا۔ آپ لوگ پلیز مجھے وہاں جانے پر مجبور مت کریں، دادی پلیز..... صرف ایک دیوار کا تو فاصلہ ہے، جب آپ بلائیں گی میں آ جاؤں گا، لیکن.....“ وہ جانتے تھے اتنی جلدی سب کچھ ٹھیک نہیں ہوگا تو انہوں نے بھی زبردستی نہیں کی۔

”جیسے تو خوش..... بس بیٹا! تیرے دل میں اگر ہمارے لیے کوئی گلہ شکوہ ہے تو بتا دے۔“

”نہیں دادی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا، سب مطمئن تھے اور جب انہیں یقین ہو گیا کہ حارش کے دل میں کوئی شکوہ نہیں رہا تب اٹھ کر گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد اس کے اندر پھر سنائے اترنے لگے۔ طلحہ اس کی کیفیت اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

”حارش! تو خوش ہے ناں؟“ اس نے کریدا۔

”پتہ نہیں طلحہ.....“ وہ بولا اور طلحہ کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ کتنی دیر خاموشی رہی تھی دونوں کے درمیان۔ طلحہ کو محسوس ہوا کہ وہ رو رہا تھا۔

”حارش۔“ اس نے پکارا مگر جواب نہ دار د تھا۔ پھر دوبارہ اس نے بھی نہیں چھیڑا اور خاموشی سے اس کے گھنے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ حارش بہت مضبوط اعصاب رکھتا تھا۔ یہ وہ جانتا تھا۔ بہت چھوٹا تھا تب سے اس نے دیکھا تھا حارش کو روتے ہوئے، اس کے بعد حالات کیسے بھی گزرے وہ کبھی کمزور نہیں پڑا تھا، لیکن آج.....



وہ صبح اٹھا تو ناشتہ تیار ملا تھا۔ اب تو وہ حرمین کو منع بھی نہیں کر سکتا تھا، مگر اسے اب بھی یہ اچھا نہیں لگتا تھا، کیونکہ شروع سے ہی اسے اپنے کام خود کرنے کی عادت تھی۔ آفس جانے سے پہلے دادی کا پیغام آ گیا کہ ان سے مل کر جایا کرو۔ اب صبح صبح کسی کے گھر جانا، لیکن وہ کسی کا نہیں اس کے سکے تایا کا گھر تھا۔ خیر وہ تیار ہو کر طلحہ کے پاس آیا، جو سستی کا مارا اب تک نہانے بھی نہیں گیا تھا۔

”طلحہ! میں ذرا ادھر جا رہا ہوں دادی نے بلوایا ہے۔“ حیرت کی بات تھی اس نے کسی سے گلے شکوے نہیں کیے تھے، مگر اتنے سارے رشتے ملنے پر بھی اس کے اندر کی خوشی مفقود تھی۔ ہاں وہ خاموش تھا اور ہر بات مان رہا تھا، شاید یہ خون کی ہی کشش تھی۔

”طلحہ! تو نے آفس نہیں جانا، اب فنانٹ اٹھ کھڑا ہو ورنہ پھر آتے رہنا رکشے سے۔“ یہ دھمکی کافی تھی، کیونکہ طلحہ رکشے وغیرہ سے جانے سے بہت چڑتا تھا، اور اس کی موٹر سائیکل ایک بار پھر ڈاکٹر کے پاس زیر علاج تھی۔ وہ فوراً اٹھ کر واش روم میں گھس گیا اور حارش مسکراتا ہوا باہر نکل گیا..... بیل بجاکے باہر کھڑا تھا، کاشف نے دروازہ کھولا تو سامنے اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔ ٹیک پیئڈ کیا۔

”تم دروازے پر کیوں کھڑے ہو، اندر آ جاتے۔“ بہت اپنائیت سے وہ بولا تو جواباً وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا اور اس کے ساتھ اندر آ گیا، جہاں سب ناشتہ کر رہے تھے۔

”السلام علیکم!“ اس نے قدرے زور سے سلام کیا۔ دادی اسے دیکھ کر بہت خوش ہو گئی تھیں۔

”وعلیکم السلام! جیتے رہو، خوش رہو۔“ وہ ان کے قریب آ گیا۔

”ادھر میرے پاس آ جا، نرمین! بھیا کے لیے ناشتہ لے آئے۔“

”دادی میں ناشتہ کر چکا ہوں۔“ وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

”چائے لے لو۔“

”نہیں آنٹی..... پلیز..... میں ناشتہ کر چکا ہوں۔“ اس نے منع کر دیا۔ عالیہ سمجھ سکتی تھیں ابھی کچھ وقت لگے گا اس کو گھٹنے ملنے

میں، وہ مسکرا دیں۔

”جیسے تمہاری مرضی۔“ وہ کچھ دیر بیٹھا مگر بالکل خاموش۔ ان میں سے کوئی بات کرتا تو جواب دے دیتا ورنہ پھر خاموش۔

”دادی میں چلوں.....؟ آفس جانا ہے۔“

”میرے ساتھ نکل جانا۔“ کاشف نے آفر کی۔

”نہیں یار! وہ طلحہ کو بھی ڈراپ کرنا ہے، اس کی بائیک خراب ہے۔“ اس نے سہولت سے منع کر دیا اور سب کو سلام کرتا واپس گھر آ

گیا جہاں طلحہ مکمل تیار بیٹھا چائے پی رہا تھا۔

”چلیں.....؟“

”ہاں! میں تیار ہوں۔“ حارش نے خاموشی سے بائیک نکالی، طلحہ دروازہ بند کرتا آ گیا۔

”چابی.....؟“

”یار! تم لے آؤ۔“ حارش بولا۔ وہ فقط اس کی شکل دیکھ کر رہ گیا، ابھی دروازے تک پہنچا تھا تبھی تیزی سے حرمین باہر نکلی۔

”خیریت طلحہ بھیا۔“

”حرمین! یہ چابی اور ہاں شام میں زبردست سی بریانی ہو جائے تو..... مزہ آ جائے۔“

”ضرور بھیا۔“ وہ مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ چابی اس نے اپنے ہینڈ بیگ میں ڈال لی۔ حارش حیرت سے طلحہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کی فرسٹ کزن تھی لیکن حقیقت یہ تھی وہ اس کا نام تک نہیں جانتا تھا اور طلحہ اس کے ساتھ کتنی اپنائیت سے بات کر رہا تھا۔

”یہ کیا فرمائشی پروگرام چل رہا تھا.....؟“

”یار! دادی اماں نے سختی سے منع کر دیا ہے کہ تم دونوں میں سے کوئی بھی کوکنگ نہیں کرے گا۔ ظاہر ہے تم ہر گز بھی روزانہ کی طرف کھانا پسند نہیں کرو گے اس لیے اس مسئلے کا حل یہ حل نکلا کہ شام کا کھانا حرمین آ کے بنا دیا کرے گی، صبح میں ناشتہ وہ گھر سے بنا کر بھیج دے گی۔“

”لیکن طلحہ! میں اپنی ذات کی وجہ سے کسی کو تکلیف نہیں دے سکتا۔ روز وہ بیچاری ہمارے باعث پریشان ہو، جب ایک کام ہم خود کر سکتے ہیں۔“

”یہ بات مجھے مت سمجھاؤ، دادی سے کہنا۔ اب چل دیر ہو رہی ہے۔“ طلحہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”پتہ نہیں یہ کب سدھرے گا۔“



کتنا پیارا اور اپنا پن تھا اس کے چاروں طرف، لیکن وہ جیسے بالکل ہی بے نیاز بنا ہوا تھا۔ بقول طلحہ کے حارش عالم اپنے اندر کی انا اور بدگمانی نکال کر دیکھو، آنکھیں کھولو، تمہارے چاروں طرف رب نے خوشیاں بکھیر دی ہیں۔ مگر اسے تو شاید خوشیوں میں رہنے کی عادت ہی نہیں رہی تھی۔ لیکن اب اسے شام میں گھر آنا اچھا لگنے لگا تھا۔ پہلے آتا تو سناٹا استقبال کرتا تھا، مگر اب دادی کی آواز اور حرمین، نرمین کی ہنسی، شور اور ان کے ساتھ طلحہ بھی شامل ہو جاتا تو گھر میں اتنی آوازیں رونق بن جاتیں۔ اس کے اندر کا انسان یہ ہی گھر تو چاہتا تھا۔ آواز، شور، اپنا پن، خیال رکھنے والے بڑے، چھوٹی چھوٹی سی باتوں پر خوش ہونے والے بہن بھائی، یہ ہنسی مذاق ایک دوسرے کے لیے پیار، ایک دوسرے کی ضرورت کا دھیان، اور اس کے پاس اب سب کچھ تھا، تو اس کے اندر کا وہ انسان مرچکا تھا۔ وہ ان کو دیکھ کر خوشی محسوس کرتا تھا مگر ان میں گھل مل نہیں سکتا تھا۔ ایک عجیب سا تناؤ اور سرد مہری تھی اس میں، جو سب محسوس کرتے تھے مگر برا نہیں مناتے تھے۔ اب اسے اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے بھی پریشان نہیں ہونا پڑتا تھا۔ ہر کام ہر چیز تیار ملتی۔

طلحہ کتنا اچھا تھا۔ وہ ان سب لوگوں میں یوں شامل ہو گیا تھا جیسے شروع سے ان کا حصہ ہو۔ نرمین، حرمین، کاشف سب کے ساتھ گہری دوستی کر لی تھی اس نے، بس وہ ہی کٹاکٹار ہوتا تھا۔

اب بھی وہ گھر لوٹا تو سب صحن میں ہی تھے۔ دادی لیٹی ہوئی تھیں۔ حرمین، کاشف، طلحہ اور نرمین بیڈ منٹن کھیل رہے تھے۔ خوب شور کیا ہوا تھا اور دادی ہنگامے سے تنگ ہونے کے بجائے انجوائے کر رہی تھیں۔ طلحہ اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔ وہ بھی ہلکے سے مسکرا کر اندر آ گیا۔ فریش ہو کر دوبارہ آیا۔ وہ سب کھیل بند کر چکے تھے اور اب سب آرام سے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

”بس تھک گئے.....؟“ وہ طلحہ کے پاس آ کے بیٹھ گیا۔

”نہیں یار! وہ حرمین کا خیال تھا کہ تم تھکے ہوئے آئے ہو اور ہمارے شور سے ڈسٹرب ہو جاؤ گے اور ویسے بھی ہم تمہارے منتظر تھے کہ تم آؤ تو ہمیں بھی چائے نصیب ہو۔“ طلحہ ہنستے ہوئے بولا۔

”میں نے کب کہا کہ تم میرا انتظار کرو۔“

”مجھے پتا ہے تو آدم بیزار ہے مگر حرمین کا خیال تھا کہ تمہارے آنے کے بعد سب مل کر چائے انجوائے کریں گے۔“ اس نے کہا تو حارش اسے گھور کر رہ گیا۔ تبھی حرمین سب کے لیے چائے لے آئی، ساتھ اسٹیکس وغیرہ بھی تھے۔

”واہ..... اللہ تمہارے جیسی بہن ہر بھائی کو دے۔“ طلحہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی، وہ مسکرا دی۔

”تھینک یو بھیا۔“ حارش نے غیر ارادی نظر اس پر ڈالی تھی۔ وہ دادی کے برابر بیٹھی چائے پی رہی تھی ساتھ ہی طلحہ کی باتوں پر مسکرا رہی تھی۔ سرخ پرٹھلاں کے سوٹ میں چمکتی دکتی رنگت اور پُرکشش نقوش، اس لمحے جانے کیوں وہ حارش کو بے پناہ اچھی لگی تھی کہ اس کو خود علم نہ ہوا وہ کب تک اسے دیکھتا رہا۔ وہ تو حرمین نے اسے دیکھا تو وہ قدرے شرمندہ ہو کر سر جھکا گیا۔

”دادی! میں گھر جا رہی ہوں۔ کوئی کام ہو تو بلا لیجئے گا۔“ وہ کپ سمیٹ کر کچن میں رکھ آئی تھی اور اب دادی کے سامنے کھڑی تھی۔

”برتن میں آ کے دھولوں گی، کھانا تیار ہے۔“ وہ ساری تفصیل بتا رہی تھی۔ طلحہ اور کاشف کے ساتھ باتیں کرتا حارش اس کی باتوں پر زیادہ دھیان نہیں دے رہا تھا۔

”دادی! صبح میری چھٹی ہے، میں صبح کر دوں گی۔ اب میں جاؤں.....؟“ دادی نے اسے کوئی کام کہا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ بہت انجوائے کرتی یہاں کام کرتے ہوئے مگر حارش کے آنے کے بعد جانے کیوں وہ بھاگنے کی کرتی۔ اسے لگتا کہ حارش کو ان کا آنا پسند نہیں ہے، اور یہ بات وہ شدت سے محسوس کرتی تھی۔ کتنے دن گزرنے کے بعد بھی حارش کا رویہ ان کے ساتھ بہت روکھا اور سرد سا تھا۔ یہ بات حرمین عالم محسوس کرتی تھی تب ہی اس کی کوشش ہوتی کہ حارش کے آنے سے قبل وہ کام مکمل کر لے، حالانکہ طلحہ بھیا کے ساتھ ان کا وقت بہت اچھا گزرتا تھا۔ وہ بالکل اپنے سگے بھائیوں کی طرح ان میں گھل مل گئے تھے۔

”حرمین بہنا! میرا کام کر دیا ہے ناں۔“ وہ جانے لگی تو طلحہ نے پکار لیا۔

”رات میں کروں گی، آپ بے فکر رہیں۔“

”کاشف! لگتا ہے حرمین کچھ بھول رہی ہے۔“ طلحہ نے کاشف کو مخاطب کیا۔ حرمین نے بھی نہ سمجھتے ہوئے کاشف کو دیکھا جو سر



ہلا رہا تھا۔

”کیا کاشف بھائی! بتائیں ناں۔“

”رات میں طلحہ سے آکس کریم کھانی ہے۔ کیونکہ یہ کل تم سے شرط ہارا تھا، اور تم خود ہی بھول گئیں۔“ اس نے سر پر ہاتھ مارا۔

”جناب اب یاد آگیا، میں جلدی جلدی کام ختم کرتی ہوں، آپ تیار رہیں۔ جان نہیں بچے گی آپ کی۔“

”یار کاشف! وہ اچھا خاصا بھول گئی تھی، تم نے لازمی میرا خرچہ کرانا تھا۔“ طلحہ نے کاشف کو گھورا۔

”ابھی سے ڈر گئے آپ بھیا! ابھی حنا بھابی کو تو آنے دیں گھر میں، پھر دیکھیے گا۔“

”حنا بھابی.....؟“ حارش نے قدرے چونک کر طلحہ کو دیکھا، وہ یکدم گڑبڑا گیا۔

”اچھا تم ابھی کام کرو جا کے۔“ اسے پتہ تھا کہ اب اس کی خیر نہیں، کیونکہ حارش اس تمام معاملے سے قطعی انجان تھا۔ وہ طلحہ کو

گھورنے میں مصروف تھا جب حرمین اور کاشف باہر نکل گئے۔

”یہ کیا چکر ہے ڈفر، اور یہ مجھ سے کیا رازداری؟“

”نہیں یار! بس وہ حرمین اور نرمین نے میرے لیے ایک لڑکی پسند کی ہے، مجھے بھی اچھی لگی۔ میں نے سوچا، کیا دل توڑوں ان

معصوم لڑکیوں کے سو.....“ اس نے بات بعد میں مکمل کی تھی، حارش پہلے اس پر حملہ کر چکا تھا۔

”بھیا چلیں ناں پلیز آپ..... بہت مزہ آئے گا۔“ نرمین نے اس کا ہاتھ پکڑ کر لاڈ سے کہا مگر وہ اٹھا نہیں، البتہ حرمین خاموش

کھڑی تھی۔ طلحہ نے بھی زور دیا۔ اس کا ایک ہی موقف تھا کہ اس کے سر میں درد ہے۔ سب کے کہنے کے باوجود وہ نہیں مانا۔ سو وہ چپ ہو

گئے لیکن جب وہ سب باہر نکل رہے تھے تو ایک لمحے کے لیے وہ رکی تھی۔

”آپ ہمیں اچھا نہیں سمجھتے ناں اس لیے آپ کو ہمارے ساتھ رہنا بھی پسند نہیں۔ لیکن اگر آپ ہمارے ساتھ چلتے تو ہمیں

بہت اچھا لگتا۔“ وہ کہنے کے بعد اس کے تاثرات دیکھنے کو ٹھہری نہیں، فوراً باہر نکل گئی اور حارش بعد میں جانے کیوں خود سے الجھتا رہا۔ سکون

نہ آیا تو آ کے دادی کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ وہ اسے بے کل ٹھہلتا تو دیکھ رہی تھیں اور جب وہ ان کی گود میں سر رکھ کے لیٹا تو جان گئیں کہ

وہ کچھ پریشان ہے۔

”حارش بچے! کیا بات ہے.....؟“ یعنی دادی اس کی بے کلی محسوس کر گئی تھیں۔ وہ خود کو اتنا عیاں کر گیا تھا۔

”دادی! کچھ نہیں بس سر میں درد ہے۔“ اس نے پھر وہی بہانہ بنایا۔

”اچھا..... اٹھ ذرا۔“ دادی نے اسے اٹھایا پھر اٹھ کر تیل لائیں اور اس کے سر کی مالش کرنے لگیں۔ مالش سے ذہنی سکون ملا تھا

مگر دل میں جو بے کلی سی چھائی تھی، وہ کم نہ ہوئی اور وہ حد سے سوا ہوئی۔ جب طلحہ اکیلا لوٹا باقی سب باہر سے گھر چلے گئے۔ طلحہ بھی جتنا خوش

گیا تھا اتنا ہی خاموش لوٹا تھا۔ اور آتے ہی وہ اپنے بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ چونکہ گرمیاں تھیں اور وہ دونوں صحن میں ہی چار پائیاں ڈال کر سوتے

”طلحہ! تو چاہے.....؟“ ظاہر ہے وہ جانتا تھا اسے اپنی طرح۔

”تجھے کیا پرواہ..... تو سو جا آرام سے.....“ یعنی وہ شدید خفا تھا تبھی اس کی طرف سے کروٹ بدل لی۔ اس کے اندر کی ہلچل شدت اختیار کر گئی۔ ایک وہ دھان پانی لڑکی اسے الجھا گئی تھی اور اب طلحہ اتنا شدید خفا ہو گیا تھا بھلا اسے نیند کہاں آتی تھی۔ وہ اٹھ کر طلحہ کی چارپائی پر آ بیٹھا۔

”طلحہ! تو ناراض ہو تو مجھے نیند کب آتی ہے، تجھے پتہ تو ہے پھر بھی۔“

”لیکن تجھے اب میری ضرورت کب ہے، تجھے تو صرف خود سے پیار ہے، آج ٹریٹ میں نے دی تھی، میری خاطر بھی تو نہیں گیا نا۔“ وہ بھی اسی بات پر خفا تھا۔

”طلحہ! میں کیا کروں بہت سمجھتا ہوں خود کو مگر پھر دل ہے کہ مانتا نہیں۔ میں سب لوگوں میں بیٹھ کر تمہاری طرح ہنسنا بولنا چاہتا ہوں مگر جانے کیا چیز مجھے ایسا نہیں کرنے دیتی۔“

”تمہاری خود ساختہ انا، حارش! جو کچھ بھی تمہارا ماضی رہا ہے اسے اللہ کا امتحان سمجھ کر آنے والی خوشیوں کو دیکھ کہو۔ تم نے خود ہی ان خوشیوں سے خود کو دور رکھا ہوا ہے۔ تجھے پتہ ہے آج تیرے رویہ کی وجہ سے حریم بہت ہرٹ ہوئی ہے۔ وہ بہت حساس ہے اسے پہلے ہی وہم تھا کہ تیرا رویہ ان کے ساتھ اچھا نہیں اور تو نے وہاں نہ جا کر اس کا بہت دل دکھایا ہے۔“ طلحہ کی باتوں نے اس کا دل اور بے کل سا کر دیا۔ وہ چپ چاپ اٹھ کر اپنے بستر پر آ لیٹا، مگر ساری رات اسے نیند نہیں آئی، جانے کیوں.....؟ اور صبح جب ناشتہ نرمین نے بنایا تو اسے لگا کہ اس نے اچھا نہیں کیا۔ وہ بھوکا بغیر ناشتے کے آفس چلا گیا۔ یہ بات طلحہ نے نوٹ کی تھی۔ شام کو اسے یقین تھا کہ ٹیسی سی چائے اس کی ساری تھکن اُتار دے گی مگر آج چائے میں وہ مزہ نہیں تھا۔ پھر کھانا بھی اچھا نہیں لگا۔ وہ تو اسے بعد میں پتہ چلا کہ آج حریم نہیں آئی تھی۔ نرمین نے کھانا بنایا تھا۔ کئی دن گزر گئے اسے حریم نظر نہیں آئی تھی تو آج وہ سیدھا شام میں ان کی طرف آیا تھا۔ وہ بابا کے ساتھ ہی بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی۔ لیمن لان کے سوٹ میں وہ دکتی رنگت اور پُرکشش نقوش لیے، بال کاندھوں پر کھلے پڑے تھے، خوبصورت سی ہیز کٹنگ اس پر سوٹ کر رہی تھی۔ اس نے سلام کیا تو وہ چونک گئی۔ بابا اسے دیکھ کر خوش ہو گئے۔

”ارے میرا بیٹا آیا ہے، آؤ بچے بیٹھو۔“ ان کی گرمجوشی اسے شرمندہ سی کر گئی۔ کتنے دن بعد مل رہا تھا وہ ان سے۔

”کیسے ہیں آپ بابا.....؟“ اس کے منہ سے بابا سن کر انہیں بہت اچھا لگا تھا، حیرت حریم کو ہوئی تھی۔

”اچھا ہوں..... حریم! جاؤ بیٹا اچھی سی چائے لاؤ، حارش آفس سے آیا ہے، تھکن اُتر جائے گی۔“ اس کے ہاتھ کی چائے کی وجہ سے تو وہ آیا تھا۔ اس نے فوراً حریم کو دیکھا، وہ دوپٹہ ٹھیک کرتی اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔ وہ بابا کے ساتھ باتوں میں لگ گیا۔ ڈورنیل بھی تو بابا اٹھ کر باہر دیکھنے چلے گئے تبھی وہ چائے لے آئی۔ اسے چائے کا کپ تھا کہ وہ باہر کود دیکھنے لگی۔

”باہر شاید لوٹی آیا تھا ان سے ملنے۔“

”اچھا.....“ وہ بابا کی چائے رکھ کر جانے لگی تو حارش نے پکارا۔

”حرمین! تم خفا ہو.....؟“ حارش کا لہجہ اور رویہ اتنا اچھا! بہت حیرت سے مڑ کر اس نے دیکھا، وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”کیوں بھلا.....؟“ وہ مسکرائی۔

”پھر کئی دن سے گھر کیوں نہیں آئیں.....؟“

”بس ویسے ہی.....“ وہ سر جھکا گئی، گویا اس نے محسوس کیا تھا۔

”آئی نو..... تم میرے اس رات نہ جانے پر خفا ہو۔“

”حارش بھائی! میں خفا نہیں ہوں، بس مجھے لگا کہ آپ کو ہمارا آنا پسند نہیں تو میں نہیں گئی۔“

”ایسا نہیں ہے حرمین! بس مجھے شاید وقت لگے گا خود کو چھینچ کرنے میں، ساری عمر تنہا رہا ہوں ناں! اب ایک دم اتنا بڑی چھینچ

دیکھو..... آئی ایم سوری اگر تم میرے رویے سے ہرٹ ہوئی ہو، یہ رویہ میری نیچر کا حصہ ہے۔ ارادہ اتنا ایسا نہیں کرتا میں۔ ہو سکتا ہے تم لوگوں

کے ساتھ رہتے ہوئے میں خود کو بدل سکوں۔ پلیز آئندہ میری کسی بھی بات کو دل پر مت لینا، میری عادت سمجھ کر انور کر دینا پلیز.....“

”حارش بھائی پلیز..... آپ کیوں اتنی وضاحتیں دے رہے ہیں، میں خفا نہیں ہو۔“ وہ نچل سی ہو گئی۔

”سچ کہوں، تمہارے ہاتھ کی چائے اور کھانے کو مس کر رہا تھا کئی دن سے۔ آئندہ بابا مجھ سے غلطی ہو بھی جائے تو یہ سزا مت

دینا۔ صرف تمہارے ہاتھ سے بنی چائے پینے آیا تھا میں۔ تھینک یو سوچ، اور مجھے امید ہے صبح مجھے یہ ہی مزیدار چائے ملے گی۔“

”حارش بھائی! آپ بھی بس.....“ جانے کیوں اس کا چہرہ تپش سی محسوس کرنے لگا۔ حارش کے دل کا بوجھ بھی ہلکا ہو گیا۔ بابا

آئے تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں چلتا ہوں۔“ حرمین بابا کے لیے دوسری چائے لے آئی تھی کہ وہ ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

”حارش بھائی! کھانا نہیں کھائیں گے.....؟“ اس کے لبوں کی مسکراہٹ سے حارش عالم پر عجیب سی کیفیت چھائی تھی جسے وہ

کنٹرول کر گیا۔

”ضرور کھاتا، مگر آج مجھے کہیں جانا ہے، میں یہ ہی بتانے آیا تھا بابا! میں لیٹ ہو جاؤں گا۔ ہمارے پاس نے پارٹی اریج کی ہے

اور مجھے وہاں جانا ہے۔“

”کوئی بات نہیں، یہ سب زندگی کا حصہ ہے۔“ بابا نے مسکرا کر کہا۔ اس نے ایک بھر پور نگاہ حرمین پر ڈالی اور اللہ حافظ کہتا باہر نکل گیا۔



نہی ہوئی تھیں۔ وہ اب تک سسٹمندی سے لیٹا تھا جو اس بات کی تصدیق سی کہ واقعی وہ اچھا محسوس نہیں کر رہا ورنہ وہ بھی جی بے وجہ زیادہ دیر صبح میں نہیں لیٹتا تھا۔ صحن میں دھوپ چڑھی تو اٹھ کر اندر آ گیا۔ ہال روم میں صوفے پر گر گیا۔ جسم میں شدید درد محسوس کر رہا تھا۔ باہر سے آہٹ ہوئی تو وہ اٹھ کر نہیں جاسکا۔ کچھ دیر بعد قدموں کی چاپ اسے اپنے قریب سنائی دی۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ حرمین کو دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔

”کاج نہیں گئیں تم.....؟“

”نہیں، دل نہیں چاہا، مگر آپ آج گھر پر؟ خیریت ہے.....؟“

”طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ ریٹ کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔“ حرمین نے دیکھا بکھرے بال اور چہرے پر بی تازگی نہیں تھی۔ شاید وہ

مجھے اٹھا ہی نہیں تھا۔ جینز اور بنیان میں آج واقعی وہ کچھ بیمار سا لگ رہا تھا۔“

”پھر میڈیسن لی آپ نے.....؟“

”نہیں، دل نہیں چاہا کہ اٹھ کر کچھ کروں، سو بس لیٹا رہا۔“ وہ دوبارہ لیٹ چکا تھا۔ حرمین نے دیکھا، پھر واپس مڑ گئی۔ کچھ دیر بعد

وہ ٹرے میں چائے اور ساتھ ٹیبلٹس لیے حاضر تھی۔

”حارش بھائی! انھیں یہ ٹیبلٹ لے لیں۔“ اس نے بڑے سینٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے اسے آواز دی۔ حارش بشکل اٹھا تھا۔ اٹھ کر

مندھو کر آیا۔ پھر اس نے چائے پی اور گولی کھائی۔

”کچھ دیر بعد جب آپ اچھا محسوس کریں تو جا کے دوائے آئیے گا۔“ وہ اب ہال کی صفائی کر رہی تھی۔ ساتھ اسے ایڈوائز بھی کر

رہی تھی۔ ہال کی صفائی کے بعد وہ باہر چلی گئی۔ صحن کی صفائی کی، کچن دیکھا، پھر اس نے حارش کی طبیعت کے خیال سے اس کے لیے دلیہ

بنایا۔ اب صرف طلحہ اور حارش کے کمرے صاف کرنے تھے جو اس نے شام پر چھوڑ دیے۔ وہ دوبارہ ہال روم میں گئی تو حارش صوفے پر لیٹا

پھر سو گیا تھا۔ اس نے ڈسٹرب نہیں کیا اور گھر آ گئی۔ امی کو بتایا، امی چلی آئیں۔ حارش بے سدھ لیٹا تھا۔ وہ اس کے قریب آ گئیں۔ پیشانی

چھوئی تو ہلکا سا بخار تھا۔ ان کے ہاتھ کے لمس سے حارش نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور سامنے انہیں پا کر اٹھ بیٹھا۔

”تائی امی آپ؟“

”حرمین نے بتایا تمہاری طبیعت خراب ہے، دیکھنے چلی آئی۔“

”جی بس کچھ تھکاؤٹ محسوس کر رہا تھا، آپ بیٹھیں ناں۔“ وہ اس کے قریب بیٹھ گئیں۔

”بیٹا! اپنا دھیان رکھا کرو۔ تم ضرورت سے زیادہ خود کو مصروف رکھتے ہو۔ تمہاری عمر کے بچے لائف انجوائے کرتے ہیں۔ کچھ

وقت اپنے لیے نکالو، ہنسو بولو، دیکھنا تم خود فریش محسوس کرو گے۔“

”شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“



بابا سویرے جلد کی لہلہ لئے۔ میں نے سوچا کہ میں بتا دوں شام میں ہمارے ساتھ چلنا ہے۔ اب تم اٹھ کر دو الٹو۔ حرمین نے مہارے لیے دلیہ بنا دیا ہے، وہ کھاؤ اور شام تک فریش ہو جاؤ۔“ وہ صرف سر ہلا کر رہ گیا۔ اب کچھ بہتر محسوس کر رہا تھا۔ اٹھ کر نہایا تو اور زیادہ فریش محسوس کرنے لگا۔ تبھی حرمین اس کے لیے دلیہ لے آئی۔

”تم نے مجھے پکا مریض بنا دیا ہے، کچھ اور بنا دیتیں۔“ دلیہ دیکھ کر اس کی بھوک اڑ گئی۔

”آپ کو نہیں پسند؟ اچھا کیا کھانا ہے بتائیں؟“ اس نے بہت اپنائیت سے پوچھا۔ حارش اس کے چہرے پر پھیلی معصومیت اور سادگی میں کھو گیا۔

”بناؤ گی جو میں کہوں گا۔“

”آف کورس بنا دوں گی، آپ بتائیں تو۔“ اتنی تیز دھوپ، گرمی کی شدت میں اسے اچھا نہیں لگا کہ وہ مزید اسے تنگ کرتا۔

”چلو چھوڑو، میں یہ ہی کھا لیتا ہوں۔ تم نے بنایا ہے تو یہ بھی مزے کا ہوگا۔“

”آپ مجھے خواجواہ مکھن لگاتے ہیں۔ اتنا اچھا بھی نہیں بناتی میں۔“ اس کی اتنی تعریف پر وہ نجل ہوئی تھی۔

”بلیوی..... مکھن نہیں یہ سچ ہے۔“ اس نے دلیہ چکھتے ہوئے کہا۔ وہ واقعی لذیذ تھا، حرمین اٹھ کھڑی ہوئی۔

”حارش بھائی! اگر کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو کہہ دیجئے گا میں چلتی ہوں۔“

”تم بھی جاؤ گی شام میں احسان چاچو کے گھر.....؟“

”آپ چلیں گے؟“ وہ حیران کن خوشی سے بولی۔

”اگر تم جاؤ گی تو.....“ پتہ نہیں حارش کے لہجے میں کیا تھا اس کا دل زور سے دھڑکا۔

”میں تو صبح آئی ہوں، کل داوی کے ساتھ گئی تھی۔ شام میں آپ لوگ جائیے گا۔“

”تو ٹھیک ہے میں بھی پھر کبھی چلا جاؤں گا۔“ حرمین نے دیکھا اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی، مگر وہ خاموشی سے اٹھ گئی اور شام میں وہ ہی کیا اس نے جو کہا تھا۔ جب اسے پتہ چلا کہ حرمین واقعی ہی نہیں جا رہی تو منع کر دیا۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے بابا۔“ کہہ بابا کو رہا تھا دیکھ اسے رہا تھا۔ پہلی بار وہ چاچو کی طرف جا رہا تھا اور صرف حرمین کے نہ جانے سے منع کر رہا تھا۔

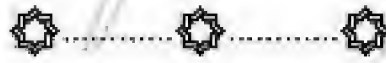
”بابا! میں بھی چلو.....؟ اکیلے کیا کروں گی یہاں؟“ اس نے ایک نظر اس ضدی انسان پر ڈالی اور بولی۔

”جیسے آپ کی خوشی، آپ نے خود منع کر دیا تھا کہ میں کل تو آئی ہوں۔“ وہ تیار ہونے چلی گئی۔

”بیٹا! احسان کو اچھا لگتا اگر آپ بھی چلتے تو..... اس کے بچے آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“



اس کے اندر کے سنائے ٹوٹنے لگے تھے۔ وہ خوش رہتا تھا، بہت خوش اور اس خوشی کی وجہ وہ تھی۔ طلحہ کو اس کا یہ چہنچ بہت اچھا لگا تھا۔ احسان چاچو کے بچوں سے مل کر اسے مزہ آیا تھا۔ وہ بہن بھائیوں کے لیے ترستا تھا۔ یہاں کتنے بھائی بہنیں تھیں۔ اسے یہ زندگی اچھی لگتی تھی۔ اب اکثر شام میں وہ بھی کاشف، طلحہ اور نرمین کے ساتھ بیڈ منٹن کھیلتا۔ کبھی لڈو وغیرہ اور خوب مزے کرتا۔ طلحہ کے ساتھ ساتھ اس کا یہ چہنچ حرمین کو بھی بہت اچھا لگتا تھا کیونکہ جب وہ دل کھول کے ہنستا تھا تو بہت خوبصورت لگتا تھا۔ ہاں وہ بالکل سلطان چاچو کی طرح تھا اور سلطان چاچو بہت خوبصورت تھے۔ سیاہ بڑی بڑی آنکھیں، کھڑی ناک اور سیاہ گھنے بال، لمبا قد اور کشادہ سینہ، چاچو تو فوجی تھے تب ہی اتنی اچھی ہائیٹ اور جسامت تھی، لیکن وہ بھی بالکل ویسا ہی تھا، بس اس کے چہرے پر مونچھیں تھیں اور اس کا خیال تھا وہ اس پر سوٹ بھی بہت کرتی تھیں۔ وہ بہت اچھا تھا مگر اس کی باتیں حرمین عالم کا دل اور دھڑکنیں دونوں ہلا دیتی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں جانے کیا تھا کہ وہ اس کی طرف دیکھ بھی نہ پاتی تھی۔ وہ بہت بدل گیا تھا۔ ہاں یہ اچھا تھا مگر وہ کہتا تھا میں صرف تمہاری وجہ سے زندگی کی طرف لوٹا ہوں۔ اس کے معاملے میں حارش کا اتنا کر بڑی ہونا اسے آپ سیٹ کر دیتا تھا۔



آج اتوار تھا، سب گھر پر تھے۔ صبح سے ہی شور ہنگامہ شروع ہو چکا تھا، اور جب فریال، عمر اور عثمان آئے تو اور زیادہ ہو گیا۔ موسم صبح سے ہی اچھا تھا۔ بادل چھائے ہوئے تھے، دھوپ کا نام و نشان نہیں تھا، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ وہ لوگ باہر ہی بیٹھے تھے۔ ”یار! اتنے اچھے موسم میں اگر پکڑے سمو سے ہوں، پودینے کی چٹنی ہو تو کیا زبردست لگے گا۔“ عثمان اور طلحہ نے رائے دی۔ ”یار! تم لوگ چنورے بہت ہو۔ مجھ سے آج کو کنگ نہیں ہوتی۔“ حرمین کو پیہ تھا شامت اس کی آنی ہے سو پہلے ہی منع کر دیا۔ ”اُف! اتم تین لڑکیاں ہو مل کے بنا لو۔“

”معاف کرو ہمیں، اتنے اچھے موسم میں کچن..... اوگاڈ۔“ نرمین اور فریال دونوں نے منع کر دیا۔ حرمین موڈ آف کرتی امی کے ساتھ کچن میں ہیلپ کرانے لگی۔ اس نے سب کی فرمائش پوری کر دی تھی مگر اب وہ ان کے ساتھ نہیں تھی اور ظاہر ہے حارش عالم کو اس کی کمی محسوس کیوں نہ ہوتی۔ وہ سب کے ساتھ بیٹھا تھا مگر اس کی بے چینی صرف طلحہ محسوس کر رہا تھا۔ اس نے بغور اس کی طرف دیکھ کر آنکھوں میں پوچھا تو وہ سر ہلا گیا اور کچھ دیر بعد اٹھ کر ٹیرس پر چلا گیا۔ ہلکی ہلکی بوندیں اب تیز ہو گئی تھیں اور نیچے سے آتی آوازیں اسے بتا رہی تھیں کہ وہ بارش انجوائے کر رہے ہیں۔ وہ یوں ہی ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ دوسری طرف صحن میں اکیلی بارش میں بھیکتی حرمین عالم اس کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ وہ آسمان کی طرف دیکھتی خود بخود مسکراتی، کبھی چہرہ صاف کرتی کبھی بالوں کو جھاڑتی اسے بہت اچھی لگی تھی۔ اسے تو حرمین

کام صرف حرمین کے ہاتھ سے ہونا پسند تھا۔ لھانے سے لے کر پڑے استری تک وہ صرف حرمین سے کام لیتا تھا۔ اگر کسی زمین کوئی کام کر دیتی تو اسے اسی وقت پتہ چل جاتا تھا کہ آج حرمین نے یہ کام نہیں کیا۔ ابھی جب وہ غصے میں گئی تو اسے بہت محسوس ہوا تھا، لیکن اب اسے اس طرح مسکراتا بوندوں سے کھیلتا دیکھ کر من شانت ہو گیا تھا۔ وہ بے خود سادیکھے گیا حرمین کو۔ خود پر کسی کی نظروں کی تپش محسوس ہوئی تھی نظریں اٹھائیں تو میسر پر کھڑا وہ نظر آیا۔ وہ جلدی جلدی دوپٹہ درست کرنے لگی۔ حارش محسوس کر گیا کہ وہ اس کی موجودگی میں ایزی فیل نہیں کر رہی۔ اپنے وجود کو چھپاتی اسے وہ بہت معصوم اور پاکیزہ لگی تھی۔ وہ فوراً ہٹ گیا۔ رات میں جب سب چلے گئے تو طلحہ اس کے پاس آلیٹا۔

”آج سب انجوائے کر رہے تھے لیکن تو اتنا آپ سیٹ سا کیوں تھا؟“ یعنی اس کی بے چینی طلحہ نے محسوس کی تھی۔

”طلحہ! مجھے خود علم نہیں ہے یہ کیا ہے؟ یہ بے چینی، یہ بے کلی کیوں ہے؟ مجھے خود پر اختیار نہیں ہے، ایسا کیوں ہے؟“ کتنا کھویا کھویا بول رہا تھا وہ، اتنا خوش تھا پھر یہ بے کلی طلحہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

”طلحہ! میں نے عہد کیا تھا خود سے کہ کبھی شادی نہیں کروں گا۔ کبھی محبت بھی نہیں کروں گا لیکن طلحہ اب مجھے لگتا ہے میں اپنے عہد سے مکر گیا ہوں اس کی معصومیت، سادگی، اس کی ہنسی، اس کی تمام اداؤں نے مجھ سے میرا سکون چھین لیا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اگر ایک پل کو بھی وہ میری نظروں سے اوجھل ہوئی تو میرا دم گھٹنے لگتا تھا۔ مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ میری ہر خوشی اس کے وجود سے وابستہ ہے۔ میرے ہر جذبے میں وہ ہے لیکن میں اس سے صاف لفظوں میں کہہ نہیں پاتا۔“ یہ تبدیلی تو حارش عالم میں سب سے خوبصورت تھی۔ طلحہ کے لبوں پر مسکراہٹ اتری، حارش عالم کی آنکھوں میں اترے کسی کے نام کے رنگ اور دیئے وہ محسوس کر رہا تھا اور شاید وہ جانتا بھی تھا کہ وہ کون ہے مگر اس کے لبوں سے سننا تھا۔

”کون ہے وہ.....؟“ طلحہ نے سرگوشی کی تو وہ چونکا اپنی بے خودی میں وہ طلحہ کو راز دے گیا تھا۔ اب چھپاتا بھی تو کیسے۔

”حرمین عالم۔“ اس کے لبوں سے نام ابھرا۔

”تیری چوائس اتنی اچھی ہو سکتی ہے، تیرے جیسے باجی سے امید نہیں تھی۔“ اس نے شرارت سے چھیڑا۔

”طلحہ! میرے دل نے غلط فیصلہ تو نہیں کیا ناں؟“ اس کو کھودینے کا ڈر اس خوش ہونے نہیں دیتا تھا۔

”دل کے فیصلے غلط نہیں ہوتے، تمہیں ڈر کیسا ہے، وہ کوئی دور ہے تم سے۔“

”لیکن مجھے اپنی قسمت سے ڈر لگتا ہے۔ آج تک مجھے کوئی خوشی ملی جو نہیں۔“ کتنا وہی ہو رہا تھا وہ، لیکن شاید اپنے ماضی کو لے کر وہ ٹھیک ہی تو وہم کر رہا تھا، بھلا اس نے خوشیاں دیکھی ہی کب تھیں۔ طلحہ نے زندگی میں اسے کھل کر ہنستا بھی اب دیکھا تھا، جب اس کی جگہ گاتی آنکھوں سے اسے کسی کے نام کے جذبے ابھرتے نظر آئے، حرمین کے لیے وہ کریزی تھا اپنا ہر کام صرف اسے حرمین کے ہاتھ سے انجام پانا پسند تھا، لیکن اس کے دل میں حرمین کے لیے اتنی طوفانی محبت ہوگی، اس کا اندازہ نہیں تھا طلحہ کو۔

”طلحہ! وہ میرا پاگل پن بن گئی ہے۔ اگر اس نے میری چاہت کے اقرار میں ناں کر دی تو؟“

”کم آن حارش! اچھا سوچا کرو، اچھا سوچو گے تو ہر کام خود بخود اچھا ہوگا۔ اب سو جاؤ اور اچھے خواب دیکھو۔“ اس کے بال شرارت سے بکھیرتا مسکراتا وہ اٹھ گیا۔ حارش بھی سونے کے لیے لیٹ گیا۔



”بس مجھے اسی لیے بارش پسند نہیں ہے۔“ وہ خاصے خراب موڈ میں تھا سویرے سویرے۔ حرمین نے بڑے حیران انداز میں دیکھا تھا اسے۔

”بارش پسند نہیں ہے آپ کو؟ بھلا اتنا خوبصورت موسم کیسے ناپسند ہو سکتا ہے کسی کو۔“

”میڈم! تمہارے اس خوبصورت موسم کے باعث میں آفس سے لیٹ ہو رہا ہوں۔“ اس کی بے زاریت چہرے سے عیاں تھی۔  
”اب انسان کو اتنا پریکٹیکل بھی نہیں ہونا چاہیے کہ اچھے خاصے موسم سے بیزاریت ہو۔ آپ اسے انجوائے بھی تو کر سکتے ہیں۔  
کیا ہوا جو ایک دن آفس لیٹ ہو جائیں گے۔“ وہ اسے گھور غصے سے رہا تھا مگر اس کے چہرے کی معصومیت نے سارا غصہ ہوا کر دیا۔ وہ بے خود ہو گیا۔ کاش وہ اپنے جذبوں کو الفاظ دے پاتا۔ جانے کون سی چیز تھی جو ہر بار اس کے لبوں پر آتے اقرار کے لفظ روک دیتی تھی۔

”حرمین“ اس نے بہت بے خودی میں نام پکارا تھا۔ وہ خود ہی گڑ بڑا گئی۔ کاش اس لمحے وہ یہاں سے بھاگ سکتی۔ اسے حارش عالم کی یہ دیوانگی ڈراتی تھی۔ اس نے لفظوں میں کبھی اقرار نہیں کیا تھا، لیکن اس کی آنکھیں ہر راز خود عیاں کر دیتی تھیں۔ وہ جان گئی تھی کہ اس کے دل میں کیا ہے.....؟ سارے جذبات اسکے دل کی ہر کہانی اس کی آنکھیں بیان کر دیتی تھیں۔ لیکن کیا اسے یہ اختیار ہے کہ وہ اس کے جذبوں کی ہمسفر بن سکے.....؟ دل کی سختی اس کی دیوانگی نے اس کے اندر اپنی جگہ بنا لی تھی اور اگر آنکھیں کھول کر دماغ کی سنتی تو شاید اپنی زندگی کے فیصلے کا اختیار اس کے پاس نہ تھا۔ شاید حارش عالم کی خاموشی میں بہتری تھی۔ اس کے جذبے اگر لفظوں میں ڈھل گئے تو بھلا وہ کیسے اور کیا جواب دیتی.....؟

”حارش بھائی! میں چلوں مجھے بابا کو بھی ناشتہ دینا ہے۔ وہ انتظار کر رہے ہوں گے۔“ اس نے فرار کا راستہ اختیار کیا لیکن جب باہر نکلنے سے پہلے ہی اس نے اس کی کلائی تھامی تو دل حلق میں آ گیا۔

”مجھے لگتا ہے تم ڈرتی ہو مجھ سے۔“ اس کے انداز میں بے خودی کے ساتھ شرارت بھی نمایاں تھی۔ اس نے گہری سانس خارج کر کے ایک نظر حارش عالم کو دیکھا جو بغور اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”ڈرتو آپ کے اندر بھی ہے۔“ اس کی بات پر حارش کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی اس کی کلائی پر۔



”حارش بھی.....“ کہنے سے بل ہی اس نے حرمین کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا، یہی وہ نہیں چاہتا تھا کہ بھائی کا صیغہ اس کے نام کے ساتھ لگائے۔

”پلیز.....“ میرا بازو درد کرنے لگا ہے۔“ اس نے التجا سیہ انداز میں کہا تو مسکراتے ہوئے اس نے بازو چھوڑ دیا۔  
”مجھے کل آفس کی طرف سے اسلام آباد جانا ہے کچھ دن کے لیے اور جانے سے پہلے میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“ وہ اب بہت سنجیدی تھا۔

”آپ لیٹ ہو رہے ہیں، بارش بھی رک چکی ہے۔“ اس نے حارش کی بات کے جواب میں غیر سنجیدہ انداز اختیار کیا۔  
”حرمین پلیز۔“ اس نے سنجیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی نگاہوں میں کچھ تھا کہ وہ خاموش ہو گئی۔  
”حرمین..... آئی.....“

”حارش..... آ جا، بارش رک گئی ہے۔“ طلحہ کی آواز اور آمد پر اس کا موڈ بری طرح بگڑا تھا اور وہ پیر پختا اک نگاہ اس پر ڈالتا باہر نکل گیا۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ خفا ہو گیا ہے۔ طلحہ نے اس کا اتنا خطرناک موڈ دیکھا تو پوچھے بنانا رہ سکا۔  
”یہ تیرے تھوڑے پر بارہ کیوں بچے ہیں صبح صبح۔“

”تجھے بھی اسی وقت مرنا تھا، اگر پانچ منٹ لیٹ ہو جاتا تو قیامت آ جاتی ناں۔“ وہ اس پر برس پڑا۔ طلحہ نے بڑی حیرت سے اسے دیکھا۔

”کیوں، کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں۔ اور اب بالکل خاموش ہو جاؤ، میرا موڈ بہت خراب ہے۔“ اس نے غصے سے کہا اور بائیک اسٹار کر دی۔



صبح جب وہ اسلام آباد گیا تو امی، بابا سے مل کر گیا تھا مگر اس سے شدید خفا تھا، تبھی تو وہ سامنے بھی آئی تو نظر تک نہیں ڈالی۔ جانے کیوں حرمین کے دل میں اداسی نے ڈیرہ ڈال لیا۔ وہ اس سے بنا بات کیے ہی جا رہا تھا۔ اس نے ہمت کر کے خود بلا لیا۔  
”حارش بھائی! چائے لاؤں آپ کے لیے؟“ اس کے مخاطب کرنے پر اسے خفگی بھری نظر ڈالی۔  
”نہیں..... تھینکس.....“ ناشتہ کر کے آیا ہوں۔“ بہت روکھے لہجے میں جواب دے کر امی، بابا سے اللہ حافظ کہتا باہر نکل گیا۔  
وہ بہت بے چین دل لیے سارا دن گھومتی رہی، مگر رات کو جب بستر پر لیٹی تو شدت سے رونا آیا۔

”خفا ہو کر تو نہ جاتے کم از کم۔“ وہ ساری رات نہ سو سکی۔ اگلی صبح بھی بے کل سی تھی۔ طلحہ اس کا کھویا کھویا انداز دیکھ رہا تھا۔  
”خیریت ہے بہنا! بہت افسردہ ہو، کوئی یاد تو نہیں آ رہا؟“ اس کی شرارت پر مسکرانے کے بجائے اس کی آنکھیں نمکین پانیوں

سے بھر گئیں۔

”حرین! تم رو رہی ہو۔“

”طلحہ بھائی! آپ مجھے حارش بھائی کا نمبر دے سکتے ہیں۔“ اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”مجھے نہیں بتاؤ گی، کیا بات ہے.....؟“

”وہ مجھ سے خفا ہیں، جاتے وقت بھی شدید خفا تھے۔“

”اوہو..... تو وہ تم سے ناراض تھا اور غصہ مجھ غریب پر نکلا، مگر کیوں.....؟“ طلحہ نے پوچھا، لیکن وہ کیا بتاتی اسے۔

”پتہ نہیں.....“ وہ نظریں چرا گئی۔ طلحہ نے مزید بحث بھی نہیں کی اور اسے نمبر دے دیا۔

”حرین ڈیر! ایک بات کہوں؟“ حرین نے طلحہ کا چہرہ دیکھا جہاں اس لمحے بہت سنجیدگی تھی۔

”وہ بہت حساس دل رکھتا ہے اور اس نے اپنی زندگی میں صرف دکھ دیکھے ہیں۔ پلیز خیال رکھنا۔“ شاید وہ مختصر سی بات میں سب

کچھ سمجھا گیا تھا۔ اس نے فقط سر ہلایا تھا۔

شام میں اس نے فرصت ملنے ہی اس کے نمبر پر مس نیل دی تھی لیکن اس نے پلٹ کر کوئی رسپانس نہیں دیا تھا۔

منزلیں بلند ہوں تو مشکلیں بھی آتی ہیں

مشکلوں سے لڑنے کا حوصلہ تو رکھتے ہیں

جو تمہارے اپنے ہوں تم سے پیار کرتے ہوں

ان کا حال کیسا ہے.....؟ کچھ پتا تو رکھتے ہیں

حارش نے شام میں فرصت ملنے ہی موبائل چیک کیا تھا اور اس کے دل کو سکون مل گیا تھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ ریگ گئی۔

ساتھ لفظ سوری اسے صاف بتا گیا تھا کہ یہ کس نے سینڈ کیا ہے۔ جواباً اس نے کال کی تھی اور وہ جیسے منتظر بیٹھی تھی، فوراً ہی انینڈ کر لی۔

”اب تک خفا ہیں.....؟“ سلام کے بعد پہلا سوال کیا تھا اس نے۔

”خفا تھا، مگر اب نہیں ہوں۔“ وہ مسکرائی تھی۔

”کب آئیں گے؟ داوی یاد کر رہی تھیں آپ کو۔“

”اور تم.....؟“

”مجھے کیا ضرورت پڑی۔“ اس کے لہجے میں شوخی تھی۔ حارش عالم ہنس دیا۔

”حرین! تھینکس.....“

”کس بات کا.....؟“ اس نے انجان بن کر پوچھا۔

”یہ آ کر بتاؤں گا اور اس بار تمہیں سننا ہوگا ورنہ.....“

”اوکے..... آ تو جائیں۔“

”مس کر رہی ہو مجھے.....؟“ کتنی آس تھی ناں اس کے لہجے میں بھلا وہ کیسے جھوٹ بول سکتی تھی مگر اقرار۔

”بہت زیادہ.....“ کئی لمحوں بعد اس کی سرگوشی ابھری تھی۔ پھر ٹوں ٹوں کی آواز، مگر اس کے لیے حرمین کا جواب ہی بہت تھا۔

رات میں طلحہ نے دیکھا اس کا موڈ بہت اچھا تھا۔

”لگتا ہے روٹھے پیامان گئے ہیں۔“ وہ کھل کر مسکرائی تھی۔

”تھینکس بھیا! نمبر دینے کا۔“ وہ اس لہجے بھی موبائل سے کھیل رہی تھی۔

”تنا کیسی ہے؟ اور کب بات کریں گے آپ دادی سے، کتنے دن تو ہو گئے ہیں۔“ اس نے نیاٹا پک چھیڑ دیا۔

”تم کہتی ہو تو آج ہی کر لیتے ہیں بلکہ..... ابھی۔“ وہ جیسے تیار ہی بیٹھا تھا۔

”چلیں میں بھی فیور کروں گی۔“ اس نے خلوص سے کہا۔ دادی تبھی عشاء کی نماز پڑھ کر آئی تھیں اور اپنی چار پائی پر بیٹھی تسبیح پڑھ

رہی تھیں۔ وہ دونوں ان کے پاس آ گئے۔

”دادی! طلحہ بھیا آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔“ وہ آتے ہی ان سے لپٹ کر بیٹھی تھی۔ دادی نے انہیں دیکھا۔

”ہاں..... تو بولو بچے۔“ طلحہ نے حرمین کو گھورا، پھر ہمت باندھی۔ بات تو کرنی تھی ناں۔

”دادی! آپ جانتی ہیں کہ میرا اب کوئی بزرگ نہیں ہے۔ ان فیکٹ حارش کے بعد اب آپ لوگ ہی ہمارے سب کچھ ہیں۔“

”بیٹا! یہ تو آج کس طرح کی باتیں کر رہا ہے۔ بھلا تجھے کبھی لگا کہ ہم نے تجھ میں اور حارش میں فرق رکھا ہے۔“

”نہیں دادی! میرا مقصد یہ نہیں تھا، دراصل دادی وہ۔“ وہ بڑی تھیں وہ شوخ و شرارتی ضرور تھا، مگر ان کے سامنے اپنے لیے لڑکی

منتخب کرنا اور پر پوزل کا ذکر اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ حرمین شاید سمجھ گئی تھی۔

”دادی! بات یہ ہے کہ میں نے بلکہ ہم دونوں بہن بھائیوں نے ایک لڑکی پسند کی ہے اور اب یہ آپ لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ

کب آپ لوگ جا کر اسے طلحہ بھیا کے لیے مانگیں۔ دادی بہت پیاری لڑکی ہے۔ طلحہ بھیا کے ساتھ ہی جاب کرتی ہے، پلیز دادی۔“

”اچھا یہ بات ہے، تبھی تو اتنا جھجک رہا تھا۔ بچے میری تو اپنی خواہش ہے جلد سے جلد سارے بچوں کی خوشیاں دیکھ لوں۔ بھلا

زندگی کا کیا بھروسہ ہے۔ سب سے زیادہ فکر تو حارش کی ہے مجھے۔ بچے نے بہت دکھ دیکھے ہیں۔ فرمان سے بات کروں گی تیری بھی اور

حارش کی بھی۔“

”حارش کے لیے کوئی لڑکی دیکھ لی آپ نے؟“ اس نے غیر سنجیدگی سے پوچھا۔

”نہیں..... ہو سکتا ہے اس کی کوئی اپنی پسند ہو اور تجھے تو وہ ہر بات کہتا ہے، تجھے تو پتہ ہوگا؟“

”ہاں..... میں نے اپنے سلطان کے بہت دکھ دیکھے ہیں اور میں حارش کی دفعہ میں چپ نہیں رہوں گی۔ اس کی خوشیوں کے لیے تو ہر پل میرے دل سے دعا نکلتی ہے کہ اللہ پاک میرے بچے کو سدا خوشیاں دینا۔ اس کی حفاظت کرنا۔“ وہ حارش کے لیے اتنی ہی جذباتی تھیں، طلحہ کو اس بات کا یقین سا ہو گیا کہ حارش کی خواہش ضرور پوری ہوگی۔

”دادی! میں آتی ہوں۔“ حرمین اٹھ کر چلی آئی۔

سب کچھ بھول کر اسے صرف یہ یاد تھا کہ حارش عالم کی محبت کے آگے وہ ہار بیٹھی ہے اپنا دل..... اس وقت اسے حقیقت کی بالکل بھی فکر نہ رہی تھی۔ یاد تھا تو صرف اتنا کہ حارش عالم اسے دیوانگی سے بڑھ کر چاہتا ہے اور اس کی یہ دیوانگی جانے کب حرمین عالم پر اثر کر گئی۔ یہ سچ تھا کہ اس نے بہت کوشش کی خود کو اس محبت کی آگ میں جلنے سے روکنے کی۔ وہ حارش عالم سے اسی لیے ڈرنے لگی تھی، بھاگنے لگی تھی، لیکن شاید..... اس کی محبت کی گہرائی میں اثر تھا یا اس کی آنکھوں کی سچائی میں.....؟ جو بھی تھا حارش عالم اپنی تمام تر وجاہت سمیت اس کے دل میں آ بسا تھا۔ وہ شدتوں سے چاہنے لگی تھی اسے۔ اب اسے صرف اس کی آمد کا انتظار تھا کہ وہ کب آئے گا اور اپنے جذباتوں کو لفظوں کا روپ دے گا۔



یہ حقیقت ہی تو تھی کہ اس کا من نہیں لگتا تھا یہاں۔ بس چلتا تو کب کا واپس چلا جاتا مگر مجبوری تھی کل کانفرنس تھی اور اس کے بعد ہی وہ واپس جاسکتا تھا۔ صبح طلحہ نے بھی فون کیا تھا اور پہلا سوال یہی کیا تھا۔

”کب آئے گا.....؟“ تجھے پتا ہے ناں تیرے بنا رہنے کی عادت نہیں ہے مجھے، میرا دل نہیں لگ رہا۔ گھر آنے کو دل نہیں چاہتا۔“

”مجھے کب عادت ہے، تو اتنا یاد آ رہا ہے.....؟ بھلا ہم کبھی اتنے دن کے لیے دور ہوئے بھی نہیں۔“ اس نے سچائی سے اعتراف کیا۔

”سچ بتا میں ہی یاد آ رہا ہوں یا کوئی اور.....؟“ اس نے چھیڑتے ہوئے کہا تو حارش زور سے ہنس پڑا۔

”بڑا کمینہ ہے تو..... اب یوں مجھے طعنے دے دے کر مارے گا، حالانکہ میں نے کبھی تجھ سے گلہ کیا حتا کے حوالے سے۔“

”کر لینا..... مجھے کیا فرق پڑتا تھا، تجھے پتہ ہے کہ میری زندگی میں پہلے تو ہے پھر کوئی اور.....“ طلحہ کی بات پر وہ سو فیصد یقین کرتا تھا۔

”پھر تو نے کیسے سوچ لیا کہ تجھ سے زیادہ میں کسی اور کو یاد کروں گا۔“

”اس لیے مائی ڈیر حارش عالم! کہ میرے ساتھ اتنے عرصے رہنے کے باوجود بھی کبھی تجھے اتنا خوش نہیں دیکھا نہ ہنستے پایا جتنا کہ جناب اب دانتوں کی نمائش کرتے ہیں۔“

”طلحہ! تم جل رہے ہو ناں۔“



لر دیا اور میں یس س سے ہوں گا وہ میری بہن ہے۔

”اچھا بابا سوری..... کان پکڑوں۔“

”چل دفع کر، اسلام آباد کے لوگ کیا سوچیں گے اتنا ڈیسنٹ بندہ کان پکڑے کھڑا ہے۔ تجھے ایک بات بتانی تھی صبر نہیں ہو

رہا، بس تو جلدی سے آ جا۔“

”تو بتانا یاں.....“

”اول ہوں..... یہاں آ کے بتانے پر جو مزہ ہے ناں وہ فون پر نہیں۔“

”اچھا..... پھر دو دن اور صبر کر لے۔“

”کیا یاں.....؟ حارش تین دن تو ہو گئے ہیں اور ابھی مزید دو دن اور..... یاں مجھے نیند نہیں آتی اکیلے۔“

”میں یہاں خوشی سے نہیں رہ رہا ہوں، مجبوری ہے۔“

”او کے! اپنا خیال رکھنا، مجھے آفس جانا ہے۔ اللہ حافظ۔“

”اللہ حافظ!“



دادی نے فرمان انکل سے بات کی ہوگی تبھی صبح اسے میسج ملا تھا کہ آفس سے واپسی پر سیدھے گھر آنا اور اس نے عمل بھی کیا تھا۔ وہ ہی بات تھی۔ وہ خوش تھا، بالکل اپنے ماں باپ کی طرح وہ فکر مند تھے ان کے لیے۔ ”یہ احساس تک نہ تھا کہ وہ دنیا میں تنہا ہے۔“

”حارش آ جائے گا تو ہم باقاعدہ لڑکی والوں کے گھر رشتہ لے کر جائیں گے۔ لیکن بیٹا تم اچھی طرح جانتے ہو ناں لڑکی کو۔ دراصل آج کل جو حالات ہیں، فکر تو رہتی ہے ناں، تم ہمارے بچے ہو، تمہیں فیصلے کا حق ہے لیکن اچھا برا جاننا ہمارا فرض ہے۔“

”بابا! لوگ بھی اچھے ہیں اور لڑکی بھی، ہم مل چکے ہیں۔ دراصل جاب کرنا اس کی ضرورت ہے۔ ان کے والد حیات نہیں ہیں، اکیلی ماں ہے اور ایک چھوٹا بھائی۔“ کاشف نے اس کی یہ مشکل بھی آسان کر دی۔ اس نے مشکور نظروں سے اسے دیکھا۔

”مجھے خوشی ہے طلحہ! تم بہت اچھی سوچ رکھتے ہو۔“

”اماں! میں چاہتا ہوں کہ احسان کو بھی جواب دے دو۔ وہ اتنے دن سے کہہ رہا ہے، موقع تو ہے طلحہ کی منگنی کے ساتھ حرمین کی رسم بھی ادا ہو جائے گی۔“ ان کی بات پر جہاں طلحہ کی سوچوں کا رخ مڑا، حرمین بھی فق چہرہ لیے اٹھ گئی۔ اس کے دل میں عجیب سی لہر اٹھی تھی۔

”حرمین کی رسم.....؟“

”جی بیٹا! احسان نے حرمین کے لیے کئی سال پہلے سے کہا تھا اور اب تو وہ مسلسل بھند ہے، عثمان ماشاء اللہ اب سیٹل ہو گیا ہے۔“

بھائی لوکلہ نہ رہے۔“ لےنے خیرت لی بات کسی ناں.....؟ وہ اخلاقاً بھی سکرانہ سکا بلکہ ”بکی بہتر“ لہتا وہاں سے اٹھ گیا۔ اور جب رات میں حرمین داوی کے لیے چائے دینے آئی تو وہ خود پر قابو نہ پاسکا۔

”حرمین! تم سب جانتی تھیں، پھر تم نے ایسا کیوں کیا.....؟“ اور وہ جو پہلے ہی رورو کے بے حال تھی پھر سے رو پڑی۔

”ہاں میں جانتی تھی اور میں نے کوشش بھی کی تھی کہ حارش عالم کو سوچ بتا دوں لیکن بھیا! میں ایسا نہ کر سکی۔ وہ جب کھل کر ہنسا تھا اتنا خوش رہنے لگا تو میرا دل نہ مانا کہ میں اس سے یہ خوشی چھینوں۔ مجھ میں ہمت نہ ہوئی اور اسے حقیقت بتانے کا سوچ کر میں خود بھی اس کی راہوں کی ہمسفر ہو گئی۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی میں اس کی آنکھوں کی سچائی سے ہار بیٹھی تھی۔ میں کیا کرتی بھیا.....؟ بھلا محبت پر کبھی کسی کا اختیار رہا ہے۔“ اس نے طلحہ کی طرف چہرہ کیا تو وہ بھی نظریں چرا گیا۔ حرمین کے چہرے کے آنسو گواہ تھے کہ وہ کیا چاہتی ہے۔

”مجھے فیصلہ کا تو اختیار نہیں طلحہ بھیا! پر میں حارش عالم کو بھی نہیں بھول سکتی۔ جتنا محبت کے سفر میں وہ آگے بڑھ گیا ہے اتنا ہی سفر میں بھی طے کر چکی ہوں۔ کیا آپ میری اور اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے.....؟“ کتنی امیدیں تھیں، آس تھی اسے۔

”ابھی تو وقت ہے ناں پلیز طلحہ بھیا!“ اس نے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑے تو وہ خود کو بہت بے بس محسوس کرنے لگا۔

”حرمین! میں نے زندگی میں حارش کو کبھی اس طرح کھل کر ہنسنے نہیں دیکھا۔ اتنا خوش بھی وہ کبھی نہیں رہا اور اب مجھے ڈر ہے کہ اگر کچھ غلط ہو گیا تو عمر بھر کے لیے وہ بکھر جائے گا حرمین! تمہاری محبت میں اس نے سارے جہاں کی خوشیاں دیکھی ہیں۔ اسے تو کوئی اور خوشی نظر ہی نہیں آتی سوائے تمہارے، میں اسے ٹوٹا بکھرتا نہیں دیکھ سکتا۔“

”آپ دادی سے بات کریں ناں بھیا! دادی حارش عالم کی خوشی کے لیے ہر قدم اٹھا سکتی ہیں، حارش کی خواہش پوری کر سکتی ہیں، صرف وہ ہی بابا اور چاچو سے کہہ سکتی ہیں۔“ ایک آخری امید بس دادی ہی تو تھیں اس کی۔ طلحہ نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑے۔

”جتنا میرے بس میں ہونا ناں بہنا! میں کوشش کروں گا کیونکہ حارش کی خوشی مجھے اپنی خوشیوں سے بڑھ کر عزیز ہے۔ تم پلیز رومت۔ ان شاء اللہ اچھا ہوگا۔“ اس نے بکھرتی ہوئی حرمین کو تسلی دی۔ حالانکہ خود اس کے اپنے دل کو ایک لمحے کا سکون نہ تھا۔



وہ ابھی آفس سے آیا تھا صحن میں حارش کو لینا دیکھ کر اس کے پاس آ گیا۔

”کب آیا تو.....؟“ حارش اس کے بولنے پر اٹھ بیٹھا۔ طلحہ اس سے یوں لپٹ گیا جیسے صدیوں سے چھڑا ہو۔

”تجھے پتہ ہے میں کتنا ادا اس ہو گیا تھا۔“

”مجھے علم نہیں ہوگا تو کسے ہوگا.....؟ چل اب آ گیا ہوں ناں۔“ حارش نے اسے خود سے الگ کیا۔ طلحہ کی آنکھوں کی سطح نم تھی۔

”طلحہ کم آن یار! تو تو یوں بی ہو کر رہا ہے جیسے میں دنیا سے چلا گیا۔“

”اچھا جائے فریسن ہو جا پھر با میں لریں گے۔“ طلحہ سر ہلا کے اندر چلا گیا جب فریسن ہو کے لوٹا تو چائے اس کے سامنے حاصر کی۔  
”تو نے بتائی ہے.....؟“

”ہاں..... کیوں.....؟“ حارش نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں ویسے ہی پوچھا تھا، حرمین بتاتی ہے ناں۔“

”دراصل میں نے سوچا کہ عادت ڈال لوں۔ پہلے ہی میں اپنی عادتیں بہت بگاڑ چکا ہوں۔ مجھے خود کو دوسروں کا عادی نہیں بنانا

چاہیے تھا۔“ وہ خود کو بہت مضبوطی سے سنبھال کے بولا تھا۔ البتہ وہ طلحہ سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ ہاتھ میں تھامے کپ کو گھور رہا تھا۔

”حارش! تو ایسے کیوں کہہ رہا ہے۔“ اس کی آواز میں لرزش واضح تھی۔

”کیونکہ طلحہ! میں حقیقت پسند انسان ہوں۔ یہ بات تو اچھی طرح جانتا تھا کہ میں نے کبھی کسی کے آسرے پر زندگی نہیں

گزاری۔ میرا ایمان ہے انسان اتنا ہی زندگی میں پاتا ہے جتنا اس کے رب نے اس کی زندگی میں لکھا ہوتا ہے۔ زیادہ کی طلب نہیں ہے

مجھے۔ غلطی میری تھی میں نصیب سے بڑھ کر اللہ سے مانگ رہا تھا۔ حالانکہ اس رب نے میرا نصیب لکھ دیا ہے، سو میری قسمت میں جو ہے

وہی مجھے ملے گا۔“

”تجھے کس نے بتایا؟“

”کل شام بابا نے فون کیا تھا جلد لوٹ آؤں۔ تیرا رشتہ بھی تو لے کر جانا ہے حنا کے گھر۔“ اس کی بات پر وہ مسکرایا بھی نہیں تھا۔

”حارش!! دادی سے.....“

”طلحہ! تو میرا دوست ہے ناں..... مجھ سے وعدہ کر کہ آج کے بعد ہم اب اس ٹاپک پر بات نہیں کریں گے۔ بھول جائیں گے

کہ کبھی یہ دن ہماری زندگی میں آئے تھے۔ وعدہ کر کہ بھول کر بھی مجھ سے یہ ذکر دوبارہ نہیں کرے گا۔“ اس کا مضبوط لہجہ طلحہ کو توڑ رہا تھا۔ وہ

خود کو کتنا بھی کمپوز کرے وہ جانتا تھا کہ اس کے اندر کتنی توڑ پھوڑ ہے۔ جس کی ہستی بکھر جائے بھلا وہ کیسے.....

”وعدہ کر.....“ اس نے ہاتھ طلحہ کے سامنے پھیلاتے ہوئے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں ضبط کی شدت سے سرخ ہو رہی تھیں۔

طلحہ نے دوپل صرف دوپل اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا، تبھی وہ ضبط کے سارے قفل توڑ بیٹھا اور طلحہ سے لپٹ گیا۔



وہ اور طلحہ باہر چلے گئے۔ رات گئے لوٹے تھے۔ اب تک وہ کسی سے بھی نہیں ملا تھا تبھی صبح ہوتے ہی دادی آ گئیں۔ اسے خوب

پیار کیا، پھر بابا آئے تھے ملنے۔ انہیں آفس جانا تھا سو جلد چلے گئے۔ کاشف بھی ہیلو ہائے کر گیا تھا۔

”ناشتہ ادھر بن گیا تمہارا، نہادھو لو میں انتظار کر رہی ہوں۔“ دادی نے حکم دیا۔

”تیری طبیعت تو اپنی ہے ناں.....؟“ دلیہ ذرا آہٹیں لیے سرخ ہو رہی ہیں۔ ”ابھی فکر ہوئی۔“ طلحہ ابھی نہا کر آیا تھا، دادی کی بات سن کر اسے دیکھنے لگا۔

”میں ٹھیک ہوں دادی! یہ طلحہ ہے ناں رات بھر باتیں کرتا رہا، جیسے میں برسوں سے بچھڑا ہوا تھا۔ نیند پوری نہیں ہوئی ناں اس لیے سستی ہو رہی ہے۔“ کتنا پرفیکٹ عذر تراشا تھا۔ طلحہ کی سانسیں بھی بحال ہو گئیں۔

”دادی! آج میں نے خود ناشتہ بنایا ہے، آپ بھی ہمارے ساتھ ناشتہ کریں ناں۔“

”آئے ہائے، تجھے کیا پڑی تھی کچن میں گھسنے کی۔ حرمین ابھی لے آتی ہوگی ناشتہ۔ میں نے بچی کو صبح سے لگایا ہوا ہے کہ حارش کے لیے اچھا سا کچھ بنا دے۔ کئی دن کے بعد گھر آیا ہے۔“ انہوں نے طلحہ کو ڈانٹا۔ حارش اٹھ کر واش روم جا چکا تھا۔ نہا کر آیا تو ناشتہ ٹیبل پر لگاتی حرمین پر نظر کی تھی۔ کھلایا چہرہ، سو جھی آنکھیں، اس کا چہرہ کھلتا ہوا ہرگز نہیں تھا۔ حارش کے اندر پھر توڑ پھوڑ ہونے لگی تھی، لیکن اس نے کمزور نہیں پڑنا تھا۔ اسے حرمین سے کوئی شکوہ نہیں تھا سوائے اس کے کہ اگر وہ جانتی تھی پہلے سے تو اس سے کہہ دیتی۔ کم از کم وہ خود کو کنٹرول کر لیتا، لیکن اس نے تو اپنی ہر خوشی اس سے وابستہ کر لی تھی۔ اس سے محبت کے بعد تو ہنسنا بولنا سیکھا تھا اس نے اور اب پھر..... وہ خاموشی سے ٹیبل تک آیا تھا۔ حرمین نے ایک نظر اس پر ڈالی اور کسی کام کے بہانے باہر چلی گئی۔ اس میں حارش عالم کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

”کل تمہاری چھٹی ہے، کل حنا کے گھر جانا ہے، تیرے بابا نے کہا ہے۔“

”جی دادی! بابا نے مجھے بتا دیا تھا۔“ وہ ناشتہ کرتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

”احسان چاچو بھی جائیں گے.....؟“

”مشکل ہے وہ تو لاہور گیا ہوا ہے، عثمان بھی شہر سے باہر ہے۔ شاید ہی کوئی آئے۔ خیر ابھی رشتہ تو ڈال آئیں۔ اللہ نے چاہا تو

منگنی کرنے سب جائیں گے۔“

”ان شاء اللہ۔ اس نے تہہ دل سے کہا۔ طلحہ ہولے سے مسکرا دیا۔

”بابا نے تو کچھ اور بھی کہا تھا دادی۔“ وہ کہہ نہیں پارہا تھا۔

”کیا..... وہ حرمین والی بات۔“

”جی ہاں۔“

”ہاں، وہ فرمان کی خواہش تھی کہ طلحہ کے ساتھ ہی حرمین کا نکاح کر دیتے، مگر اب احسان اور عثمان کے آنے کے بعد ہی بات

کروں گی ان سے۔“

”اچھا دادی! میں چلتا ہوں۔ دیر ہو رہی ہے۔ شام میں آپ کے پاس بیٹھ کر باتیں کروں گا۔“



”حارس! دادی سے بات کروں.....؟“ اس کی بات کے جواب میں حارس نے عرصے سے ہورا تھا اسے۔

”طلحہ! ہم یہ ٹاپک کلوز کر چکے ہیں ناں!“

”تو جی لے گا اس کی محبت کے بغیر.....؟“

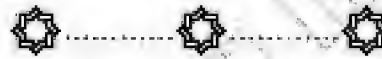
”ساری عمر میں نے محبتوں کے بناء ہی گزاری ہے۔ ایک یہ ہی رشتہ باقی رہ گیا تھا ناں، یہ محبت بھی کر کے دیکھ لی ہے۔ طلحہ تجھے اب بھی اندازہ نہیں ہوا کہ میری قسمت میں محبت ہے ہی نہیں۔ میرا وجود صرف ٹھکرانے اور ٹھیس دینے کے لیے ہے۔ تو کیوں چاہتا ہے کہ میں اپنی عزت نفس بھی مجروح کروں۔ مجھے کسی سے کوئی امید نہیں ہے۔ پلیز اور میں نہیں چاہتا اب کسی اور رشتے کو امتحان میں ڈالوں اور جو بچے کچے رشتے ہیں انہیں بھی کھودوں۔“ طلحہ اس کے جواب میں کچھ نہ بول سکا، مگر سچ تو یہ تھا کہ اس سے حرمین کا اتر اچہرہ اور بکھرا وجود بھی نہیں دیکھا جاتا تھا۔

”مجھ سے حرمین کا چہرہ اور ادا سی نہیں دیکھی جاتی حارش.....؟“

”قصور بھی تو اسی کا ہے طلحہ۔ اس نے تو میرے وجود کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ کاش مجھے پہلے سے سب پتا ہوتا، پروہ تو جانتی تھی، جانتے بوجھتے بھی اس نے نہ صرف یہ نہیں کہ مجھے منع کرتی خود بھی۔“

”محبت پر بھلا کبھی کسی کا اختیار ہوتا ہے حارش۔“

”اب کسی بھی بات کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔“ پتہ نہیں وہ خود کو کیسے اتنا سخت بنا لیتا تھا۔ طلحہ اسے دیکھتا رہ جاتا تھا۔



بابا اور دادی کو حنا اور اس کی فیملی اچھی لگی تھی۔ شریف اور سلجھے ہوئے بچے بھی دونوں پڑھے لکھے، تہذیب یافتہ اور باادب تھے۔ انہیں طلحہ کی پسند پر بہت خوشی ہوئی تھی اور انہیں بات کرنا بھی مشکل نہ ہوا تھا۔ حنا کی ماں اور بھائی ہی اس کی کل کائنات تھے اور طلحہ کو وہ لوگ جانتے تھے کیونکہ طلحہ کئی بار ان سے ملنے آچکا تھا۔ یوں جلد ہی طلحہ کی منگنی طے پا گئی تھی۔ اب بابا چاہتے تھے کہ طلحہ کی منگنی کے ساتھ ہی حرمین کا نکاح بھی ہو جاتا۔ رخصتی حرمین کے پیپرز کے بعد ہو جاتی۔

”اماں! آپ احسان سے پوچھ لیتیں نا کہ پھر ہم تیاری کر لیتے۔“

”میں تو کہتی ہوں کچھ دیر ٹھہر جاتا۔ طلحہ کی اگلے ماہ تاریخ خلیس کے تب ہی حرمین کا نکاح ہو جائے گا۔“ دو تین ماہ میں کیا ہو جائے گا۔“ کہہ تو اماں بھی ٹھیک ہی رہی تھیں، اس لیے وہ بھی چپ کر گئے۔

”ایک بات کہوں فرمان.....“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔

”جی اماں! حکم کریں۔“



”چاچو! آپ سب لے آنا ہے فلاں۔“

”کل پھر مجھ سے تو ابھی معذرت لے لو یار۔“ عثمان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”میں پرسوں ہی آؤں گا، سوری ان فیکٹ آج کل میں بہت مصروف ہوں۔“

”عثمان پولیس آفیسر کتنے مصروف ہوتے ہیں میں جانتا ہوں۔“

”اچھا یعنی تو اپنے بھائی..... کو ایسا پولیس آفیسر سمجھتا ہے۔“ اس نے مصنوعی خفگی سے کہا، وہ مسکرا دیا۔ اسے عثمان سے بالکل بھی

جیسی نہیں تھی، وہ تو صرف اپنے مقدر سے شکوہ کرتا تھا۔

”مذاق کر رہا تھا بھائی جان! سوری.....“ اس نے بھی اسی کے انداز میں کہا۔

”اچھا..... باقی سب تو آئیں گے ناں.....؟“

”ڈونٹ وری، سب آئیں گے ان شاء اللہ۔“ عثمان نے اسے یقین دلایا، وہ مسکرا دیا۔ اگلے دن صبح ہی فریال اور عمیر پہنچ گئے

تھے چچی جان کے ساتھ۔ ان کے آنے سے گھر کی رونق بہت بڑھ گئی تھی۔ کل کی تیاری کے ساتھ ساتھ مذاق ہنگامہ بھی ہو رہا تھا۔ طلحہ نے

آج آفس سے چھٹی کی تھی مگر وہ گیا تھا۔ طلحہ جانتا تھا سارا دن گھر میں رہنا وہ بھی حرمین کے سامنے اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ شام میں

البتہ وہ آیا تو سب کو ادھر جمع دیکھ کر دل شانت ہو گیا۔

”دیکھ لیا تم نے، ہم وعدہ کر کے نبھاتے ہیں، صبح ہی آ گئے تھے۔“ فریال کی آنکھوں کی چمک اسے دیکھ کر بڑھی تھی یا شاید حرمین کو

محسوس ہوئی تھی۔

”تھینکس سسر.....“ اس نے مسکرا کر کہا اور فریش ہونے چلا گیا۔

”حارش بالکل سلطان چاچو کی طرح ہے ناں نرمین ویری پنڈ سم اینڈ چارمنگ۔“ وہ مزاح کی ایسی تھی ہر چیز کی کھل کر تعریف

کرنے والی۔

”سو تو ہے، ہمارے بھیا بہت پیارے ہیں۔ فریال! حارش بھیا تم سے بڑے ہیں ناں، تو تم انہیں بھائی کیوں نہیں کہتیں۔“

نرمین نے کہا تو وہ منہ کے زاویے بگاڑنے لگی۔

”ضروری ہے کیا.....؟ تم دونوں ہونا بھائی کہنے کے لیے، میرا نہیں دل چاہتا میں نہیں کہتی۔“

”فریال.....“

”بس ابھی نرمین! تم بحث کیوں کر رہی ہو فریال کو جو پسند ہے وہ کہہ دیتی ہے۔“ حرمین نے سہولت سے کہا تو نرمین بھی خاموش ہو

گئی۔ دادی ان سے دور بیٹھی تھیں، مگر وہ ان کی آوازیں سن رہی تھیں۔ ان کی خواہش بھی تھی کہ حارش کے لیے گھر میں سے ہی کوئی لڑکی مل

”آج بھل گیا ہوں دادی! سر بھی دکھ رہا ہے بہت۔“

”چائے بنواتی ہوں تیرے لیے، سر درد ٹھیک ہو جائے گا۔“ انہوں نے پیار سے اس کے سر میں ہاتھ پھیرا اور حرمین کو چائے کے لیے کہنے لگیں، وہ بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں جس سے بہت سکون مل رہا تھا۔

”حارش! تو کب کرے گا شادی.....؟ میری بھی خواہش ہے کہ تجھے ہنستا بستا دیکھوں۔“

”دادی! ہنسنے کے لیے شادی ضروری ہے کیا.....؟“ اس نے شرارت سے مسکراتے ہوئے دادی کو دیکھا۔

”حارش! مذاق مت کر۔ دیکھ طلحہ کی شادی کی تاریخ جب ملیں گے تب تک تیرے پاس ٹائم ہے بس، دونوں کی ساتھ ہی کر دیں گے۔“

”کیوں آپ کو میری سکھی زندگی پسند نہیں ہے دادی۔ دراصل ابھی میں اس جھنجھٹ میں پڑنا نہیں چاہتا اور ویسے بھی طلحہ نے تو

لڑکی پسند کر رکھی تھی، میں.....“

”حارش! ایک بات کہو.....؟ مانے گانا.....“

”کیا دادی.....؟“

”اگر میں خاندان میں سے تیرے لیے کوئی دیکھ لوں، کیا تو میری پسند سے شادی کرے گا۔“

”خیریت ہے نا.....؟ آپ نے کوئی لڑکی پسند کر لی ہے کیا.....؟“ وہ دادی کی باتوں کو محض مذاق سمجھ رہا تھا۔

”یہی سمجھ لے، فریال مجھے تیرے لیے بہت.....“

”دادی.....“ وہ اٹھ بیٹھا، وہ صرف مذاق سمجھ کر ایزی لے رہا تھا، لیکن دادی تو کچھ اور ہی سوچے بیٹھی تھیں۔

”سوری دادی! وہ میری بہن ہے، پلیز دوبارہ ایسا مت کہیے گا۔“

”خاندان میں.....“

”خاندان صرف فریال پر ختم ہو جاتا ہے، جب میں خاندان سے پسند.....“ یکدم ہی جیسے اسے بریک لگ گئی، وہ کیا کہنے جا رہا تھا۔

”اوگاڈ.....“ اس نے سر تھام لیا، تبھی حرمین اس کے لیے چائے لے آئی۔

”سوری دادی! لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا۔“ وہ چائے پیے بغیر ہی باہر نکل گیا۔ دادی چپ ہو گئیں لیکن وہ کیا بات کہہ رہا تھا، جوا

س نے ادھوری چھوڑ، وہ الجھ گئی تھیں۔ اندازہ تو حارش کو بھی تھا کہ اس نے غلط بات کہہ دی ہے اور رات کو وہ طلحہ سے یہی کہہ رہا تھا۔

”پھر دادی نے تفصیل نہیں پوچھی.....؟“

”نہیں..... بٹ یار! مجھے کم از کم خود پر اتنا کنٹرول ہونا چاہیے تھا نا..... طلحہ! میری زندگی کے وہ چند دن شاید میرے لیے عمر بھر

کاروگ بن گئے ہیں لیکن یار! میں ساری زندگی میں شاید کبھی اتنا خوش نہ رہ سکوں جتنا ان چند دنوں میں، میں نے خوشی دیکھی طلحہ! کیا میری



”حارش! تو اس طرح مت سوچا کر۔“ اس کے پاس حارش کو تسلی دینے کے لیے بھی لفظ نہیں تھے۔

”طلحہ! آئی ریلی کو ہر..... آئی ڈونٹ نو کہ اس کے دل میں بھی میرے اتنے ہی شدید جذبات ہیں یا نہیں.....؟ مجھے شدید خواہش تھی کہ میں اپنی محبت کے اعتراف میں اس کے لبوں سے صرف ہاں سنو، مگر اب جبکہ یہ خواہش بھی میرے اختیار میں نہیں ہے لیکن وہ میرے سامنے آئی تھی طلحہ! تو مجھے خود پر اپنے جذبات پر کنٹرول کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ طلحہ! ہم اپنے پرانے گھر میں واپس چلیں، وہاں کم از کم یوں مجھے دن رات یہ اذیت تو نہیں سننی پڑے گی۔ ہو سکتا ہے وہ سامنے نہ ہو تو اسے بھولنا آسان ہو جائے۔ طلحہ میں بہت کوشش کرتا ہوں کہ وہ تمام لمحے میرے ذہن سے محو ہو جائیں مگر میں ناکام ہو گیا ہوں۔“ اس لمحے کوئی حارش عالم کو دیکھتا جو سب کے سامنے خود کو فو لاد ظاہر کرتا ہے، کس قدر بکھرا ہوا تھا، کہ اس کے عزیز دوست کو بھی وہ لفظ نہیں مل رہے تھے کہ جن سے وہ اسے تسلی ہی دے دیتا۔



طلحہ کی معافی بہت دھوم سے ہوئی تھی اور سب نے انجوائے کیا تھا۔ حارش کو دیکھ کر طلحہ کو اپنی خوشی بھی اچھی نہیں لگتی تھی، مگر حارش ان دو دنوں میں بہت مصروف رہا اور بظاہر وہ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ آخر آل طلحہ کی خوشی اس کے لیے بہت اہم تھی۔ احسان چاچو اور عثمان بھی ان کے گھر دو دن رہے تھے۔ اسے یہ سب بہت اچھا لگا تھا۔

دو دن بہت مزے میں گزرے تھے لیکن اگلے دن سب چلے گئے اور گھر میں پھر وہی خاموشی چھا گئی۔ احسان چاچو دادی کو بھی لے گئے تھے۔ اب اسے دادی کی عادت سی ہو گئی تھی۔ شام میں گھر لوٹا تو دادی بیٹھی ہوتی تھیں، آج نہیں تھیں۔ دل نہ لگا تو بابا کی طرف آ گیا۔ وہاں سب اکٹھے بیٹھے تھے۔ وہ بھی کاشف کے پاس بیٹھ گیا۔

”کیا ہوا.....؟ بڑا اُداس لگ رہا ہے.....؟“

”دادی! نہ ہوں تو گھر میں دل نہیں لگتا۔“

”اچھا ہوا تم آگئے، ہم ڈسکس کر رہے تھے کہ طلحہ کی تاریخ کب تک لیں۔ ظاہر ہے انہیں تو ہم نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ دو تین ماہ میں شادی کر دیں گے۔“

”یہ تو بابا آپ کا کام ہے، آپ کی جب مرضی ہو۔“

”بیٹا! میں نے سنا ہے کہ آپ دوبارہ اسی گھر میں شفٹ ہونے کا سوچ رہے ہو۔“ ان کی بات پر وہ خاموشی سے سر جھکا گیا۔

”حارش! کوئی پریشانی ہے یا کوئی اور مسئلہ ہے، تم ہم سے شیئر کرو بیٹا! حل نکالیں گے، یہ تو کوئی حل نہیں ہے کہ آپ ہمیں چھوڑ کر اتنی دور جائیں، ہم سے کوئی غلطی ہو گئی کیا.....؟“

”ارے نہیں بابا! وہ تو بس..... دراصل وہاں مجھے آفس قریب پڑتا ہے، آپ پلیز ایسی باتیں مت سوچیں۔“ ان کی بات پر وہ



دن کس طرح گزرے علم نہ ہوا کہ طلحہ کی شادی بالکل قریب آ گئی۔ اب جبکہ فرمان چاہتے تھے حرمین کا نکاح بھی ساتھ ہو جائے انہوں نے اپنی ماں سے بات کی تھی اور وہ خود احسان سے بات کرنے کی غرض سے ہی آئی تھیں۔ ان کی بات سن کر کئی لمحے کے لیے تو سب بالکل خاموش سے ہو گئے تھے پھر احسان عالم نے ہی ہمت کی۔

”اماں! مجھے یاد ہے فرمان بھائی سے جو میں نے کہا تھا، ہمیشہ سے میری خواہش رہی ہے کہ حرمین میرے گھر میں آئے اور میں اب بھی یہی کہتا ہوں مگر اماں! عثمان ابھی شادی کے لیے راضی نہیں ہے، کم از کم دو سال تک، بس اسی لیے ہم خاموش ہیں۔“

”نکاح تو ہو سکتا ہے ناں.....؟“

”دادی! نکاح ہو سکتا ہے مگر، صرف سال دو سال کی بات ہے، مجھے اپنا کیریئر بنانا ہے، آپ لوگ جانتے ہیں میری جاب ابھی نئی ہے اور مجھے محنت کرنی ہے، صرف اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ میری توجہ میری جاب پر ہو۔“

”احسان! فرمان سے کیا کہوں پھر.....؟“ دادی کو عثمان کا ریزن پسند نہیں آیا تھا۔ سچ یہ تھا کہ وہ دل میں برا مان گئی تھیں۔ ادھر فرمان عالم پوری تیاری سے بیٹھے تھے اور یہاں عثمان نے ایک طرح سے منع ہی کر دیا تھا۔

”اماں! میں فرمان بھائی سے بات کروں گا اور آپ بھی سمجھا دیجئے گا، اب بھلا آج کل کی اولاد کہاں سمجھتی ہے ہماری باتیں۔“

”احسان! فرمان کے بچے ہیں، جیسا ان کے والدین نے کہہ دیا بچے ذرا بھی نہیں بولتے۔“

”دادی! آپ خفا کیوں ہو رہی ہیں، میں نے منع تو نہیں کیا ناں۔“ عثمان نے منہ بسورا۔

”جیسے تم لوگوں کی مرضی، مجھے فرمان کی طرف چھوڑ آؤ، حارش تو بولا یا بولا یا گھوم رہا ہوگا، وہ مجھے خود سے دور نہیں جانے دیتا۔“

”صبح چلی جائے گا ناں اماں!“ احسان کو اپنی ماں کا علم تھا کہ وہ خفا ہو گئی ہیں۔ وہ کیا کرتے جب بیٹے نے منع کر دیا تھا۔

”بچے صبح بھی جانا اب بھی، پھر بھی چھوڑ آؤ۔“ انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

”عمیر! بچے ذرا مجھے گھر تو چھوڑ دے۔“ اندر آتے عمیر کو دیکھتے ہی وہ جیسے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”کیوں دادی.....؟ آج ہمارے پاس رکیں ناں۔“

”اوہو..... میرا بچہ مجھے یاد کر رہا ہوگا تو مجھے لے چل بس۔“ عمیر نے حیرت سے پہلے دادی کو پھر پپا، ماما، عثمان کو دیکھا جن کے چہروں پر چھائی خاموشی اسے عجیب سی لگی تھی۔ وہ دادی کے حکم پر موٹر سائیکل باہر نکالنے لگا۔



”سوچ لو طلحہ! اگر اور کسی کو بلانا ہو تو.....“ آج شام جب اکٹھے بیٹھے سب تو کا شف نے کہا۔

”ورنہ پھر اپنے دوستوں کی طرف گیا تو کارڈز نہیں بچیں گے۔“

”حارش! تم نے کسی کو بلانا ہے.....؟“ طلحہ نے اسے دیکھا جو بہت خاموشی سے بیٹھا تھا۔

”نہیں..... یونو..... تمہارے علاوہ میں کسی کو نہیں جانتا اور ویسے بھی بہت زیادہ دوست بنانا میری ہوبی نہیں ہے۔“

”سوچ لے..... ایک بار پھر۔“ گہری پُرسوچ نظریں جب طلحہ کی بات پر انھیں تو طلحہ نے اُبرو اچکا دیں۔ وہ سر جھٹک گیا۔

”بابا! میں کسی کو بلانا چاہتا ہوں، اگر آپ لوگوں کو اعتراض نہ ہو تو۔“ طلحہ کی بات پر تقریباً سب ہی حیران ہوئے تھے۔

”بیٹا! ہمیں کیوں اعتراض ہوگا، آپ کے مہمان ہمارے مہمان، ہمیں تو خوشی ہوگی۔“

”حارش! تجھے تو اعتراض نہیں ہوگا.....؟“

”آئی تھنک طلحہ! تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ اس کے چہرے کا زاویہ قدرے بگڑا تھا۔

”بابا! میں شگفتہ آنٹی کو بلانا چاہتا ہوں، بلکہ میں انہیں یہاں لانا چاہتا ہوں، اپنے گھر میں، تاکہ وہ جہا.....“

”ہرگز نہیں.....“ وہ یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔ چہرے پر آنے والی سختی پر سب حیران تھے۔

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے حارش!“ کتنے حیرت کی بات تھی کہ آج ان دونوں کے درمیان اختلاف تھا، صرف ایک بات کو لے کر

جنہوں نے آج تک ہمیشہ ایک دوسرے کی ہر خوشی کا خیال رکھا تھا۔

”پھر ٹھیک ہے..... میں ہی چلا جاتا ہوں، لیکن اس گھر میں ان کے ساتھ رہنا مجھے منظور نہیں ہے۔“ اللہ جانے اس کا دل کیوں

اتنا سخت ہو گیا تھا کہ وہ اپنی ماں کے سامنے تک آنے کو تیار نہ تھا۔

”صرف تیری بے کاری ضد کی وجہ سے میں انہیں اب مزید وہاں نہیں چھوڑ سکتا۔“ طلحہ بھی اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے مقابل آ گیا،

اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔

”تم جانتے ہو حارش عالم! تمہاری ماں کیسی زندگی گزار رہی ہے۔ اعظم انکل کے انتقال کے بعد ان کے بچوں اور بہوؤں نے

ان کا جینا دو بھر کر دیا تھا، تنگ آ کر وہ اپنے بھائی کے گھر آ گئیں لیکن اپنے ماموں اور ممانیوں کے خوش اخلاق رویے تو تم بھی دیکھ چکے ہو،

اپنے بیٹے کے ہوتے ہوئے وہ دوسروں کے در پر رہ رہی ہیں، وہ بھی اتنی بری حالت میں، کل میں نے انہیں دیکھا تو..... میں برداشت نہ

کر سکا۔ کم از کم مجھ سے ان کی اس قدر بری حالت نہیں دیکھی جاتی۔ سو فیصلہ ہو چکا کہ اب وہ یہاں رہیں گی، میں کل انہیں لے آؤں گا۔“

طلحہ اپنی بات ختم کر کے رک نہیں تھا۔ وہ بھی خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔



نہیں۔ بھائی بھابھیاں ان کی شکل دیکھ کر حوش نہ گئیں۔ دوسرا نکاح اسی لیے کیا تھا، وہ نہیں چاہتی تھیں کہ خدا کو استہان کا دوسری دفعہ پھر.....  
گھرا جڑے وہ اسی لیے اعظم علی اور ان کے گھر والوں کی ہر بات سہہ لیتی تھیں۔ حارش کے ساتھ بھی وہ اکثر زیادتی کر جاتی تھیں۔ مگر ان کا مقصد صرف گھر بسانا تھا۔ وہ چاہتی تھیں حارش کے لیے بھی گھر میں اور ان کے دلوں میں جگہ بنالیں مگر وہ ناکام رہیں اور اپنے ذرا سے سخت رویے کی وجہ سے اپنا بیٹا کھو دیا۔ وہ ان سے بد دل ہو گیا اور گھر تک چھوڑ گیا، لیکن اب جب ان کا شوہر ہی نہیں رہا تھا تو..... اور بیٹے اور بہوؤں نے ان کا جینا دشوار کر دیا۔ ان بچوں کے لیے انہوں نے ہر تکلیف برداشت کی اور اب انہوں نے ہی گھر سے نکال دیا۔

طلحہ کو جب ساری صورتحال کا علم ہوا تھا اس نے فوراً فیصلہ کر لیا تھا۔ صرف ایک بار وہ حارش کو سمجھانا چاہتا تھا، اس کے دل میں جو بھی تھا وہ ختم کرنا چاہتا تھا۔ اسی لیے وہ غصہ ختم کر کے رات کو جب گھر آیا تھا تو اس کا پکا ارادہ تھا کہ وہ حارش کے ساتھ پیار سے بات کرے گا۔ اسے یقین تھا کہ حارش ضرور مان جائے گا۔ لیکن جیسے ہی وہ گھر آیا اور کمن روم میں داخل ہوا تو حیرت سے گنگ رہ گیا، شگفتہ آنٹی بیٹھی تھیں اور حارش عالم ان کی گود میں سر رکھے لیٹا ہوا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ خواب تھا یا فلم مگر..... جب آنٹی نے اسے پکارا تو وہ.....

”طلحہ! آ جاؤ بیٹا..... وہاں کیوں کھڑے ہو۔“ حارش نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا پھر اسی طرح لیٹ گیا۔ وہ ان کے قریب آ گیا۔  
”آنٹی! آپ یہاں.....“  
”حارش لینے گیا تھا مجھے۔“ ایک اور حیرت کا جھٹکا تھا جو طلحہ کو لگا تھا۔  
”حارش! تو.....“

”ہاں..... اس لیے کہ تو نے مجھے کبھی بتایا ہی نہیں تھا کہ مماتنی تنگ زندگی گزار رہی ہیں، میں لا تعلق تھا کہ مماتنی گھر میں خوش ہوں گی۔ مجھے نہیں علم تھا کہ اعظم علی کے بعد ان کے بچے، اتنے بد لحاظ ہو جائیں گے کہ اپنی ماں کا وجود بھی نہیں برداشت کریں گے۔ وہ ماں جنہوں نے ان بچوں کی خاطر اپنی ذات بھی بھلا دی تھی۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔  
”حارش! میں جانتی ہوں بچے کہ میں نے تمہارا ساتھ نہیں دیا۔“

”نومما پلیز..... اب پرانی کوئی بات نہیں ہوگی۔ آپ اب اپنے گھر میں ہیں، یہاں صرف آپ کا حکم چلے گا اور طلحہ کی شادی کی خوشیاں ہوں گی بس.....“ وہ پرانی کسی یاد کا ذکر بھی نہیں سننا چاہتا تھا کیونکہ اس کے پرانے زخموں میں تکلیف شروع ہو جاتی تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ خوشی کے اس موقع پر ایسا کچھ بھی ہو۔



شگفتہ بیگم کے آنے سے ان کی خوشیاں دو گنی ہو گئی تھیں۔ حارش کے اس قدم پر سب بہت خوش تھے، خاص کر دادی، جنہوں نے بہت چومنا تھا اسے۔



ماں کو خود سے دور نہ کرنا چاہیے۔“ جواباً اس نے صرف سر ہلایا تھا۔ طلحہ کو جو ایک ہی سی محسوس ہو رہی تھی، اپنی ماں کی، خلفتہ آئی لے وہ بہت حد تک کم کر دی تھی، لیکن پھر جب ابٹن مہندی کی رسم شروع ہوئی اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ ظاہر ہے اس وقت میں وہ اپنے ماں باپ دونوں کی کمی شدت سے محسوس کر رہا تھا، حارش اس کا اترا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

”طلحہ! اس وقت سارے مہمانوں کی نظریں تجھ پر ہیں اور تو نے شکل پر بارہ بجائے ہوئے ہیں۔“

”حارش! میں نے خود کو بہت سنبھالا ہے، مگر ماں باپ تو، ماں باپ ہوتے ہیں۔ میں لاکھ دھیان بٹالوں مگر آج ان دنوں جو میری زندگی کے اہم ترین دن ہیں، میں انہیں بہت مس کر رہا ہوں۔“

”میں تیری فیملنگز سمجھتا ہوں طلحہ۔“ اس نے کاندھے پر بازو پھیلایا اسے قریب کیا۔

”مگر ہم انسان بے بس ہیں، جو اس کی رضا، جو ہم سب کا مالک ہے۔ تو ہی تو کہتا ہے، وہ ہمارے لیے ہمیشہ ہم سے بہتر سوچتا ہے، پھر کیوں دکھی ہو رہا ہے۔ سچ پوچھو تو پھو تو مجھے بھی بہت یاد آ رہی ہیں۔ انہوں نے ہمیں پال کر اتنا بڑا کیا، کتنا ارمان تھا انہیں یہ دن دیکھنے کا اور آج جب وہ دن آیا تو پھو تو ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔“ حارش نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے افسردہ لہجے میں کہا۔

”پلیز..... آپ طلحہ بھیا کو مزید اداس کر رہے ہیں۔“ اس کی اچانک آواز پر وہ دونوں چوک گئے تھے کہ اس قدر ہنگامہ میں بھی ان پر کسی کی توجہ ہے اور ظاہر ہے وہ صرف حرمین عالم ہی ہو سکتی تھی کہ یہ ہمدردی کا جذبہ محترمہ میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ حارش نے ایک نظر اس پر ڈالی پھر نگاہیں پلٹ گئیں۔

”بھیا پلیز..... آپ اداس بالکل بھی اچھے نہیں لگتے اور کیا آپ کو ہماری چاہتوں میں کبھی کوئی کمی محسوس ہوئی ہے جو آپ اداس ہو رہے ہیں، اس کا مطلب تو یہ ہونا کہ آپ ہمیں اپنا نہیں سمجھتے۔“ وہ محض طلحہ کو اس احساس سے باہر لانا چاہتی تھی جس کے زیر اثر وہ تھا۔ ”حرمین!“ طلحہ نے اسے دیکھا جو مصنوعی خفگی چہرے پر سجائے کھڑی تھی۔

”ارے نہیں بہنا! ایسا کیوں سوچا تم نے، میں تو بہت خوش نصیب ہوں اس معاملہ میں کہ مجھے اتنے اچھے اور چاہنے والے رشتے ملے، تم جیسی بہن ملی جو دوسروں کی خوشی کا کتنا خیال رکھتی ہے۔“

”اور دوسروں کو دکھ بھی گہرے دیتی ہیں۔“ اس نے یکدم کہا تو وہ دونوں چپ ہو گئے۔ حارش وہاں سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔ حرمین کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی تھی، لیکن صرف طلحہ کے خیال سے اس نے خود کو کمپوز کیا اور مسکرا دی۔

”میں تو آپ کو صرف تنگ کر رہی تھی بھیا! تاکہ آپ کا موڈ اچھا ہو جائے۔ اب پلیز آپ اداس مت ہونا۔“ اس نے بالکل نارمل لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا تھا، طلحہ بھی مسکرا دیا تھا۔



نہیں لھر لی سجاوٹ کی ذمہ داری بھی اس نے، بخوبی ادا کی تھی کہ دونوں لھر پوری طرح جلوکار رہے تھے۔ حارث کی غائب دماغی تو ویسے تو سب ہی نوٹ کر رہے تھے کہ آج کل گھر میں جس قدر کام بڑھ گئے تھے ان کی غائب دماغی بھی عروج پر تھی۔ وہ یوں تمام کام انجام دے رہا تھا جیسے زبردستی باندھ کے کرائے جارہے ہوں۔ گھر سے باہر رہنے کو زیادہ فوقیت دیتا۔ پہلے تو سب اس کی وجہ شگفتہ بیگم کی آمد سے منسلک کرتے رہے، مگر جب حارث اور ان کا پیار دیکھا جس میں کسی رنجش کی شبیہ تک نہیں ملتی تھی تو پھر الجھ گئے۔ پوری مہندی کے فنکشن میں وہ طلحہ کے ساتھ جڑا بیٹھا رہا۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ یہاں ہو کر بھی نہیں تھا یہاں۔ کسی کے بلانے پر یوں چونک جاتا تھا جیسے میند سے جاگا ہو۔

”حارث.....!“ فریال کی آواز پر وہ یوں ہی چونکا تھا۔ حرمین اور نرمین بھی اس کے ہمراہ تھیں۔

”تم ٹھیک ہو.....؟ مجھے نہیں لگتا کہ تم نے آج انجوائے کیا ہے۔“

”میں ٹھیک ہوں، انجوائے کر رہا ہوں۔“ زبردستی لبوں پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کی تھی۔ مگر حرمین عالم پر نظر جیسے ٹھہری وہ بھی غائب ہو گئی۔

”کیا انجوائے کر رہے ہو، رسم ختم ہو گئی، آدھے سے زیادہ مہمان چلے گئے، اب بچا کیا ہے.....؟“

”سوری فریال! میرے سر میں درد تھا ناں۔“ اس کے لب سکڑ گئے۔ اٹھ کر جانے لگا تو طلحہ نے بازو تھام لیا۔

”ڈیئر سسٹرز! تم کیوں پاجی کے ساتھ اپنا مزہ بھی کر کر رہی ہو، جا کے انجوائے کرو۔“ طلحہ نے انہیں ٹالا۔

مگر وہ جانتا تھا حرمین کی آنکھوں میں ٹھہرا پانی کیا چاہتا تھا، طلحہ نے آنکھوں کے اشارے سے اسے حوصلہ دیا تھا۔ وہ لب کھلتی وہاں سے ہٹ گئی۔ نرمین اور فریال بھی مہندی لگانے کے لیے چلی گئیں۔

”تجھے نہیں لگتا حارث عالم! تم خود کو عیاں کر رہے ہو سب پر، اس طرح بی بیو کر کے۔“ طلحہ کی بات بہت گہری تھی مگر وہ جانتا تھا

سمجھتا تھا، لیکن ان دنوں جتنا وہ اس سے دور جانا چاہتا تھا وہ اس قدر ہی سامنے آ جاتی۔ حارث عالم کی زندگی میں کسی محبت کا وجود پہلی بار آیا

تھا۔ صحیح معنوں میں حرمین عالم وہ ہستی تھی جس نے اس کے اندر بالکل مچائی تھی۔ جذبات و احساسات جگائے تھے۔ بھلا اس سے الگ ہونا،

اسے بھولنا اتنا آسان تھا۔ اس کی حیات میں نرم جذبے جگانے والی وہ واحد لڑکی تھی، اس نے تو حارث عالم کو سرتاپہ بدل ڈالا تھا۔ اس کے

لبوں کو ہنسنا سکھایا تھا۔ اپنی ذات کا احساس دلایا تھا اور پھر خود ہی سارے خواب چکنا چور کر ڈالے اس کی آنکھوں سے نوج کر۔ اسے حرمین

سے یہ ہی گلہ تو تھا کہ وہ سب جانتے ہوئے بھی اس کے ساتھ اس کے جذبات کے ساتھ کھیلتی رہی، کاش وہ پہلے جان لیتا تو.....

”آج کل میرا خود پر سے اختیار ختم ہو گیا ہے طلحہ! نہیں رہے میرے احساسات میرے بس میں۔“ اس وقت شاید وہ خود سے بھی

خفا تھا، تبھی تو بے بس لہجے میں غصہ بھی موجود تھا۔

”پھر مان لے ہارا شاید اسی میں تیری جیت ہو۔“ طلحہ کی ذمہ داری بات اس کے قطعی پلے نہیں پڑی تھی۔ وہ اسے گھورنے لگا۔

سکرایا تھا حالانکہ حارش کی یہ حالت بذات خود اس کے لیے تکلیف کا باعث تھی۔

”ابھی بھی وقت ہے حارش! حرمین کا نکاح پھر سے کینسل ہو چکا ہے، جانے میرا دل کیوں کہتا ہے کہ وہ رب یہ ہی چاہتا ہے کہ تو ذرا سا اپنی ناک کو نیچے لا کر دادی سے بات تو کر، وسیلہ تو اللہ بناتا ہے ناں یار۔“

”تو پاگل ہو گیا ہے طلحہ! اور بس۔“ حارش نے افسوس بھرے انداز میں کہا۔

”نکاح اس لیے تھوڑا سالیٹ ہو گیا کیونکہ عثمان ابھی ذہنی طور پر تیار نہیں ہے۔ اس میں یہ بات کہاں واضح ہے کہ وہ اس رشتے سے انکاری ہے یا خوش نہیں ہے۔ یار! وہ میرے لیے بھائیوں کی طرح ہے، میں اتنا گرا ہوا قدم کیوں اٹھاؤں گا، اتنے عرصے سے حرمین اس سے منسوب ہے، سوچ طلحہ! اس نے کتنے خواب سجائے ہوں گے، کتنے جذبات و احساسات اس بندھن سے جڑے ہوں گے۔“

”تو پھر اپنے دل کو سمجھالے، مجھ سے تیری یہ حالت نہیں دیکھی جاتی، میری اتنی بڑی خوشی ہے مگر حارش! تجھے دیکھتا ہوں تو مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔“ اس نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اپنے سامنے کرتے ہوئے کہا تھا۔ حارش نے اس کی آنکھوں میں دیکھا جہاں دکھ اور تکلیف نمایاں تھے۔ وہ اپنی نئی زندگی شروع کرنے جا رہا تھا مگر صرف اس کی وجہ سے وہ اپنی ہر خوشی پر دل سے انجوائے نہیں کر پارہا تھا۔

”آئی پرامس..... اس کے بعد سے کبھی تو میری آنکھوں اور لبوں پر یہ اداسی نہیں دیکھے گا۔“

”حارش عالم! شاید تجھے خود اندازہ نہیں ہے کہ تیری آنکھوں میں تو عکس ہی اس کا چھلکتا ہے، ان آنکھوں کا کیا کرے گا.....؟“

”کاش میں انہیں نوچ کر پھینک سکتا۔“ اس نے لب کچلے۔

”نکال سکتا ہے تو اسے دل سے نکال دے، اپنی روح سے نکال دے، کیونکہ وہ تو حارش عالم کی روح میں سما گئی ہے۔“

”پلیز طلحہ! ٹیل می..... کیا کروں میں.....؟ مجھے خود سمجھ نہیں آتا کہ اس نے مجھے اس قدر کمزور کر دیا ہے، میرا خود پر اختیار ختم ہو

گیا ہے۔“ وہ ہار گیا تبھی طلحہ کے ہاتھ جھٹکتا اندر کی طرف تیز قدموں سے چل دیا۔ مگر ہال روم میں ہی وہ ٹکرا گئی جس سے وہ بچ کر جانا چاہتا

تھا۔ رائل بلیو اور وائٹ کنٹراسٹ کے سوٹ میں بالکل اس کے سامنے ہی تو کھڑی تھی وہ، چمکتا چہرہ اور اس آنکھوں میں پانی لیے۔ وہ

یوں رکا گویا وقت رک گیا۔ کتنے لمحے گزر گئے مگر حارش عالم اس کے چہرے سے نظر نہ ہٹا سکا۔ پھر جیسے یکدم وہ ہوش میں آیا تھا۔ نگاہوں کا

زاویہ بدلا اور کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

”حارش.....“ حرمین عالم نے اپنی ساری ہمت مجتمع کر کے اسے پکارا تھا۔ حارش عالم کے بڑھتے قدم رک گئے، مگر وہ پلٹا نہیں تھا۔

”میں گناہ گار ہوں آپ کی کہ میں نے سچائی جانتے ہوئے بھی آپ سے چھپائی لیکن..... مجھے خود علم نہ ہوا کہ میں نے یہ کب اور

کیوں کیا.....؟ شاید اس لیے حارش کہ محبت واقعی ارادے، نیت اور وقت مقرر کر کے نہیں کی جاتی، ورنہ میں کبھی یہ غلطی نہ کرتی آپ سے

محبت کرنے کی۔ میری زندگی کی ڈور کسی اور کے ہاتھ میں تھی مگر مجھے کبھی اس چیز کا احساس نہیں رہا، کیونکہ تب تک آپ میری زندگی میں نہیں



رہی، خود کو بچانی رہی، پر جانے لب میں اس آک میں بس پڑی۔ آپ کی ناراضی سہنا میرے بس سے باہر تھا۔ آپ روٹھ جاتے بات نہ کرتے مجھ کچھ اچھا نہ لگتا۔ اور میں خود سے ہار جاتی صرف آپ کی خوشی کے لیے۔ آپ کی ہر ضد مان لیتی تھی۔ میں جانتی تھی کہ آپ کے لبوں نے ہنسنا کیوں سیکھا ہے۔ آپ کی آنکھوں میں جو عکس ہے وہ کس کا ہے۔ پھر بھلا کب تک، کب تک میں خود پر جھوٹے پہرے ڈالتی کہ میرا دل تو آپ کا اسیر ہو چکا تھا۔ بس یہی میری خطا ہے کہ صرف میں آپ کی محبت میں کھو کر اس کڑوے سچ کو فراموش کر گئی، اس امید پر کہ شاید رب میری تقدیر بدل دے، اور اس میں حارش عالم کے نام کی خوشیاں ڈال دے، مگر امید امید ہی رہی۔ لیکن حارش! میں آپ کا سامنا کرنے کی ہمت خود میں نہیں کر پاتی۔ آئی نو آپ بھی یہی چاہتے ہیں کہ میں آپ کے سامنے نہ آؤں مگر شاید ہم دونوں اپنی اپنی جگہ مجبور ہیں۔ حارش! میں اتنا اندازہ تو کر سکتی ہوں کہ آپ کب کیا چاہتے ہیں۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ آپ کے سامنے نہ آؤں، لیکن آج کل شاید ایسا ممکن نہیں ہے۔ سو پلیز مجھے معاف کر دیجئے گا۔ میں جانتی ہوں کہ میں نے آپ کا دل توڑا ہے مگر پھر بھی شاید جب یہ سچ آپ کے منہ سے سنتی ہوں تو دل بہت دکھتا ہے، سہہ نہیں پاتی پلیز.....“ حرمین نے اس کے سامنے آ کر ہلتی نظروں سے اسے دیکھا۔ حارش کی نظریں اٹھیں اور اس کی آنکھوں میں کھو گئیں۔ حرمین کے اتنے واضح اعتراف نے ایک بار پھر اس کے اندر ہلچل مچائی تھی۔ جانے اسے کیا سوچھی کہ اس نے حرمین کو کاندھوں سے تھام کر جھنجھوڑ ڈالا۔

”جب سب کچھ جانتی ہو مانتی ہو کہ حارش عالم تمہارے وجود کے بغیر ادھورا ہے، پھر انکار کیوں نہیں کر دیتیں۔ تم بھی تو محبت کرتی ہونا مجھ سے، رہ لوگی عثمان کے ساتھ.....؟ بھول پاؤ گی مجھے.....؟“ حرمین کی آنکھوں سے سیال مادہ بہہ نکلا، کتنی بے بس تھی وہ۔ کاش..... اس سے کچھ کہہ پاتی، وہ تمام باتیں جو اس کے دل میں چیختی تھیں، ہنگامہ برپا کرتی تھیں۔

”پلیز حرمین! میں جی نہیں سکتا تمہارے پنا پلیز.....“ اس نے حارش عالم کی بے بسی آنکھیں بند کر کے سنی تھی، آنکھیں کھولتی تو شاید۔

”تم منع کیوں نہیں کر دیتیں۔“ اس نے ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ یہ روبرو ان کا ایک دوسرے سے پہلا اعتراف تھا، ورنہ تو دل کی حکایتیں وہ صرف نگاہوں سے بیان کرتے تھے۔

”بس ایسا نہیں کر سکتی حارش۔“ بے بسی سے لب کچلے۔

”کیوں..... حرمین.....؟“ یکدم جیسے حرمین عالم کے دل نے بغاوت کی تھی اس نے حارش عالم کے ہاتھ جھٹکے۔

”آپ خود کیوں نہیں کہہ سکتے یہ سب کے سامنے.....؟ کہہ دیں ناں..... آپ تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ صرف ایک بار دادی کے سامنے ذکر بھی کریں گے تو وہ ہر ممکن کوشش کریں گی آپ کے لیے۔ حالانکہ دادی جانتی ہیں کہ میں بھی اس رشتے سے خوش نہیں مگر وہ خاموش ہیں۔ پر حارش عالم! ایک بار صرف ایک بار تم ان سے کہتے تو وہ ضرور مان جاتیں، مگر تم نے خود کوشش ہی نہیں کی۔ کبھی کہا ہی نہیں، بلکہ تم تو اس کوشش میں ہو کہ کسی کو کچھ علم ہو بھی نہیں۔“ وہ جیسے دلی آواز میں چیخ پڑی تھی۔



”پھر حارش عالم! میں ایک لڑکی ہو کر کیسے یہ قدم اٹھا لوں، میری زبان پر بھی انہی کی محبتوں کے قفل پڑے ہیں۔ میرے ماں باپ کی عزت میرے لیے سب سے زیادہ اہم ہے، میں کیسے انکار کر دوں.....؟ تم ایک مضبوط مرد ہو کر یہ اقرار خود سے چھپائے پھرتے ہو، میں ایک کمزور لڑکی ہو کر کیسے سب کی محبتوں کو ذلیل کر دوں۔ آئی ایم سوری حارش عالم! میں بھی یہ نہیں کر سکتی۔“ اس نے حارش کی آنکھوں میں دیکھا، وہ جیسے یکدم پھر مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں جا گرا تھا، نظریں جھکا گیا۔

”پھر دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں سے ایک دوسرے کی محبت مٹا دے۔“ بے رنجی سے کہتا وہ آگے بڑھ گیا۔ حرمین نے بہنے والے آنسو صاف نہیں کیے تھے اور وہیں صوفے پر ڈھلے گئی۔



طلحہ کی شادی بخیر و خوبی انجام پا گئی۔ حنا ان کے گھر آ گئی۔ دو تین دن تو مہمانوں کی رونق رہی، مگر پھر سب رخصت ہو گئے اور گھر میں صرف گھر کے افراد ہی رہ گئے۔ شادی ختم ہوئی تو جیسے حرمین عالم کا ان کی طرف آنا بالکل ہی ختم ہو گیا، ظاہر ہے پہلے تو گھر کے مختلف کام کے لیے اسے آنا پڑتا تھا۔ مگر اب حنا تھی، پھر شگفتہ آنٹی تھیں، لیکن کا زیادہ تر کام تو وہ کرتی تھیں اور حارش کے تمام کام بھی آنٹی اکثر خود کرتی تھیں۔ کپڑے وغیرہ وہ خود پر لیس کر لیتا تھا۔ حنا بہت اچھی نیچر کی تھی، مگر پھر بھی وہ اسے بہت کم ہی کوئی کام کہتا تھا۔ یہ بات حنا نے شدت سے نوٹ کی تھی کہ وہ اور طلحہ اتنے اچھے دوست تھے۔ طلحہ تو اتنی خوبیاں بیان کرتا ہے حارش کی، پر حارش تو صرف اپنی ذات میں لگن رہتا تھا۔ خود اپنی ماں سے وہ صرف ضرورت کے وقت مخاطب ہوتا تھا۔

”طلحہ! حارش بھائی ضرورت سے زیادہ ریزرور نہیں ہیں۔“ اس دن شام کی چائے پر وہ چپ نہ رہ سکی۔ جب سب حارش کے انتظار میں تھے کہ وہ آئے تو چائے پیئیں گے مگر حارش صاحب آئے اور منع کر کے چلے گئے۔ پہلی بار حنا کو برا سا لگا تھا۔ حنا کے سوال پر طلحہ اور حرمین دونوں کی نظریں اس پر اٹھی تھیں۔ ان کی شادی کے بعد وہ پہلی بار آنٹی تھی اور حارش صرف اس کی وجہ سے یہاں نہیں رکا تھا۔

”نہیں حنا! ہو سکتا ہے اس کی طبیعت اچھی نہ ہو اس لیے، ورنہ وہ ایسا نہیں ہے۔“

”ہو سکتا ہے، مگر میں تو جس دن سے آئی ہوں وہ ایسے ہی ہیں۔ اب اتنے دن سے تو طبیعت خراب نہیں تھی ناں! مجھے لگتا ہے انہیں میری آپ سے شادی اچھی نہیں لگی۔“ حنا کا لہجہ ناگوار ہو گیا۔ طلحہ کے پیشانی کے بل نمایاں ہو گئے۔

”حنا.....“ وہ اتنا ہی بولا تھا کہ حرمین کھڑی ہو گئی۔

”بھیا پلیز..... آئی تھنک مجھے چلنا چاہیے۔ ایم سوری، شادی میری وجہ سے۔“ وہ بات ادھوری چھوڑ کر چلی گئی۔

”حرمین گڑیا! میری بات سنو!“ طلحہ نے اسے آواز دی، مگر وہ رکی نہیں تھی۔ حنا مزید الجھ گئی۔ طلحہ نے خفگی بھری نظروں سے حنا کو

دیکھا تھا۔

”ایم سوری طلحہ! مگر حرمین کو تو میں نے کچھ نہیں کہا۔“

”بعض دفعہ ہم انجانے میں دوسروں کو بہت کچھ کہہ دیتے ہیں، لیکن تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گی۔ شاید اس میں تمہاری بھی خطا نہیں۔“ وہ سوچتے ہوئے بولا تھا، اور چائے کا کپ رکھ کر اٹھ گیا۔ حنا نے پیچھے تک اسے دیکھا تھا۔ اس کا رخ حارش عالم کے کمرے کی طرف تھا۔



وہ آفس سے لوٹا تو گھر میں بے حرروقت تھی۔ صحن میں اسے حنا ہی نظر آئی تھی۔

”بھابی خیریت ہے.....؟ کون آیا ہے.....؟“ وہ اندر جانے سے پہلے جان لینا چاہتا تھا۔ حنا نے اس کے فکر مند چہرے کو دیکھا پھر مسکرا دیا۔

”حارش بھائی! آپ اتنے کیوں بھاگتے ہیں لوگوں سے، ارے احسان چاچو اور ان کی فیملی ہے۔“

”او..... تھینکس.....“ اس نے شکر کا سانس لیا اور اندر بڑھ گیا۔

”السلام وعلیکم!“ اس نے با آواز بلند سلام کیا تو سب ہی متوجہ ہو گئے۔

”وعلیکم السلام.....! جیتے رہو۔“ احسان چاچو ہمیشہ کی طرح ملے تھے اس سے اور گلے لگایا۔

”کیسے ہو بنگ مین.....؟“

”فائن چاچو..... آپ سنائیں۔“

”اللہ کا شکر ہے بیٹا.....“ وہ مسکرائے۔

وہ آنتی، عثمان، عمیر اور فریال سے جیلو ہائے کرنے لگا۔

”آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے حارش! تم تو بہت ویک ہوتے جا رہے ہو۔“ فریال کی بات پر وہ محض مسکرا دیا تھا۔ عثمان نے بغور اس کا چہرہ دیکھا، پھر مسکرا دیا۔

”بعد میں بتاتا ہوں میں ذرا فریش ہو جاؤں۔“ اس نے کہا اور ایکسکیوز کرتا کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ فریش ہو کر لوٹا تو بابا بھی

فیملی سمیت براجمان تھے سوائے اس کے۔

”السلام وعلیکم بابا! کیسے ہیں.....؟“ کتنی حیرت کی بات تھی کہ ایک ساتھ رہتے ہوئے وہ ان سے آج کئی دن بعد مل رہا تھا۔

”وعلیکم السلام! جیتے رہو۔“ انہوں نے اسے اپنے پاس ہی بٹھالیا۔

”طبیعت ٹھیک ہے تمہاری.....؟“

”خیریت ہے بھی! تم کہاں رہتے ہو..... بھیا بتا رہے تھے کہ کئی دن سے تم سے ملاقات نہیں ہوئی ان کی۔“ آخر چاچو نے پوچھ لیا۔ وہ مزید شرمندہ ہو گیا۔

”بس چاچو! وہ لیٹ آ رہا تھا ناں آفس سے، پھر تھکن کی وجہ سے جلد سو جاتا تھا، اس لیے۔“  
 ”اچھا ادھر میرے پاس آؤ۔“ انہوں نے بلایا تو وہ اٹھ کر ان کے پاس صوفے پر جا بیٹھا۔ چاچو نے اسے لاڈ سے اپنی گود میں لٹالیا۔  
 ”طلحہ بھی تمہاری کمپلیٹ کر رہا تھا کہ تم اسے بھی وقت نہیں دے رہے ہو، کیا بات ہے بچے..... کوئی پریشانی ہے کیا.....؟“ کتنی محبت سے پوچھ رہے تھے وہ۔ حارش نے پہلے سامنے بیٹھے طلحہ کو گھورا، پھر انہیں جواب دیا۔

”چاچو! کمپلیٹ تو مجھے کرنی چاہیے تھی، میری ہمت دیکھیں میں خاموشی سے سہہ رہا ہوں، وقت تو شادی کے بعد اس کے پاس نہیں ہوتا میرے لیے۔“ کم از کم طلحہ یہ توقع نہیں کر رہا تھا کہ وہ یہ بات کہے گا۔  
 ”میں زندگی میں سب سے زیادہ اس کے قریب ہی تو رہا ہوں۔ اب یہ بات یہ بھول گیا ہے، میں نہیں۔“ وہ مزید طلحہ کو جلائے کو بولا تھا، حنا دروازے میں ہی رک گئی تھی۔

”حارش، میرے بچے! ایسا کبھی مت سوچنا، طلحہ کبھی نہیں بدل سکتا۔“  
 ”دیکھو بیٹا! حنا اس ماحول میں نئی ہے اسے ایڈجسٹ کرنے میں وقت لگے گا اور ظاہر ہے وہ طلحہ کے علاوہ یہاں کسی کو اتنا نہیں جانتی تو اسے ہر کام ہر بات ہر قدم پر طلحہ کی ضرورت ہے، جب اس کی ہم آہنگی سب سے ہو جائے تو خود بخود وہ سب میں گھل مل جائے گی، تو اسے طلحہ کا ہاتھ پکڑ کر چلنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ یار! تمہیں تو یہ بات سب سے زیادہ سمجھنی چاہیے تھی، اور تم ہی نا سمجھی کی بات کر رہے ہو۔“  
 ”پتہ نہیں چاچو! خالص محبت میرے نصیب کا حصہ ہے ہی نہیں۔ ہمیشہ ہی بچی کبھی چاہت ملی ہے مجھے۔“ اس کی بات سے جہاں شکافہ بیگم کا دل ہلاتھا، طلحہ تو جیسے تڑپ ہی گیا۔

”حارش! اب تو زیادتی کر رہا ہے میرے ساتھ۔“ وہ جیسے رونے کو تیار تھا۔ حارش نے اس کی شکل دیکھ کر بمشکل مسکراہٹ روکی تھی۔  
 ”کیوں.....؟ اب تجھے کیوں تکلیف ہو رہی ہے میری شکایتیں تو بڑے مزے سے لگا دیں، اپنی باری آئی تو رونے لگ پڑا۔“  
 وہ چاچو کی گود سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”چل اب آئندہ میرے منہ نہ لگنا۔“ طلحہ نے روٹتے ہوئے کہا۔  
 ”وعدہ نہیں کروں گا، گلے تو لگ سکتا ہوں ناں۔“ وہ عین اس کے سامنے آ گیا۔ طلحہ نے کچھ غصے سے اسے دیکھا تو کان پکڑ کر آنکھ ماردی۔



”پکا کمینہ ہے تو حارش۔“ کہتے ہوئے اسے خود سے بھینچ لیا۔

”اچھا اب ہمیں پارٹی دیں طلحہ بھیا! ہم نے آپ دونوں میں صلح کرائی۔“ عمیر نے کہا۔ حنا کو تب پتہ چلا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے خفا ہیں، واقعی حارش بھائی اور طلحہ کی دوستی کو سمجھنا اس کے بس کی تھی ہی نہیں۔

”جناب! جو حکم کریں۔“ دل و جان سے راضی تھا وہ۔ حارش اس سے الگ ہو کر پھر چاچو کے کندھے سے آگیا تھا۔ عثمان دور بیٹھا جانے کیوں آج حارش عالم کو اتنے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اپنا یہ وجیہہ اور تھوڑا انخرے والا کزن اچھا تو لگتا تھا مگر اس نے شاید غور نہیں کیا تھا کہ وہ واقعی اتنا خوبصورت ہے۔ لائٹ بلیوٹی شرٹ اور بلیو جینز میں اس کی وجاہت بہت نمایاں تھی۔ آج وہ بھی اپنے دل میں یہ اعتراف کر رہا تھا کہ حارش بالکل اپنے پپا کی طرح ہے اور ان کے چاچو بہت خوبصورت تھے، مگر جہاں اس کی گہری آنکھیں اسے قدرے الگ کرتی تھیں وہیں اس کے چہرے پر گھنی مونچھیں اس کی وجاہت کو چار چاند لگاتی تھیں۔ وہ مسکراتا بہت اچھا لگتا تھا۔ عثمان شاید مسلسل اسے دیکھ رہا تھا تبھی تو وہ محسوس کر گیا۔

”عثمان! تم ٹھیک ہو؟“ وہ جیسے چونک گیا۔

”ہاں..... بس تم آج بہت اچھے لگ رہے ہو، اس لیے من چاہا دیکھتا ہوں۔“

”تھینک یو.....“ وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

کچھ دیر بعد بنگ پارٹی نے صحن میں ڈیرہ لگا لیا تھا۔ حنا بے چاری اکیلے ہی سب کے لیے کچن میں مصروف تھی۔ یہ بات بھی حارش نے ہی سب سے پہلے نوٹ کی تھی۔ وہ کافی دیر دیکھتا رہا، پھر اٹھ کر کچن میں آ گیا۔

”اتنا کام اکیلے کیسے کرو گی بھابی! تھک جاؤ گی۔“

”نہیں..... کر لوں گی۔“

”میں ہیلپ کر اوں.....؟“

”ارے نہیں..... جنہیں کرانی چاہیے انہیں تو ذرا بھی فکر نہیں۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لبوں پر شکوہ اتر آ، حارش مسکرا دیا۔

”بھابی! شوہر وہ آپ کا ہے لیکن میں آپ کو نالچ دیتا ہوں اس کے بارے میں، وہ شروع سے کچن کے کاموں سے بھاگتا ہے۔

پہلے یہ ڈیوٹی میں انجام دیتا تھا۔“ وہ اس کے ساتھ ہیلپ کرانے لگا۔ ساتھ طلحہ کی ساری حرکات سنانے لگا جو شادی سے پہلے وہ کرتا تھا۔

”اوگاڈ! کوکنگ آپ کرتے تھے؟“

”پچھو کے جانے کے بعد ظاہر ہے ہم دونوں ہی بچے تھے اور طلحہ کوکنگ سے الرجک ہے، پھر مجھے ہی یہ کچن سنبھالنا پڑا، مگر پھر

اس کے ہاتھ کے.....“ وہ بے دھیانی میں شاید زیادہ ہی بول رہا تھا کہ یکدم بریک لگ گئے۔

”اس کے..... کیا مطلب حارش بھائی.....؟“



”بس یوں ہی منہ سے نکل گیا، میں زمین سے کہتا ہوں وہ آپ کی ہیلپ کرادے گی۔“ وہ اپنی بات مکمل کر کے مڑا تو دروازے کے بیچ میں حرمین عالم کو کھڑا پایا۔

”بھیا نے فون کیا تھا بھابی! کہ آپ سخت مصیبت میں ہیں۔“ وہ قطعاً اسے انور کرتی حنا کے پاس آگئی۔ کتنے لمحے گزر گئے اسے یہیں کھڑے۔

”تھینک یو حارش بھائی! آپ پلیز سب کے ساتھ مزے کریں حرمین میری ہیلپ کرادے گی۔“

”جی.....“ وہ سر ہلاتا باہر آ گیا، پتہ نہیں سب نے غور کیا تھا یا نہیں، مگر عثمان نے کیا تھا کہ یکدم اس کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی ہے۔



”میں آج آپ سے کچھ مانگنے آیا ہوں بھیا.....؟“ احسان عالم، فرمان عالم کے سامنے بیٹھے تھے کمرے میں، ان کے علاوہ عالیہ بیگم، اماں اور عثمان عالم موجود تھے۔

”کیا بات ہے احسان کھل کر کہو.....؟“

”میں حرمین کو مانگنے آیا ہوں اپنے بیٹے کے لیے۔“

”تم کیسی باتیں کر رہے ہو احسان! حرمین اس گھر میں تم لوگوں کی امانت ہے، میں تو طلحہ کی شادی پر ہی نکاح کرنا چاہتا تھا، مگر تم نے خود ہی تو منع کر دیا تھا کہ کم از کم دو سال تک تم لوگ، پھر اب یہ بات.....؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی۔“

”آئی ایم سوری..... ہم مانتے ہیں کہ ہم نے ہی کہا تھا، کیونکہ عثمان دو تین سال تک شادی نہیں کرنا چاہتا، مگر میں یہاں عثمان کے لیے نہیں آیا ہوں، میں آپ سے اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں بھیا!“

”احسان! آخر بات کیا ہے.....؟“ فرمان عالم اب فکر مند سے ہو گئے۔

”دراصل بھیا! حرمین آپ کو معلوم ہے کہ مجھے بچپن سے پسند ہے اور میں نے آپ سے کہا بھی تھا، اور میں جانتا ہوں کہ یہ دو سال کے نام پر آپ کو برا بھی لگا ہوگا، بھیا! عثمان میرا بیٹا ہے، مگر میں آج حرمین کا ہاتھ عثمان کے لیے نہیں حارش کے لیے مانگنے آیا ہوں۔

وہ بھی تو میرا بچہ ہے، کیا ہوا اگر عثمان نہیں مانتا، میں اپنے حارش کے لیے آپ سے حرمین کا ہاتھ مانگتا ہوں۔“

”احسان! یہ کیا بکواس ہے؟“ فرمان عالم کوچ میں غصہ آ گیا، اماں الگ حیران تھیں۔

”بڑے ابو پلیز..... پتا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

”تم پاگل تو نہیں ہو، کتنے سال سے حرمین تمہارے نام سے منسوب ہے اور اب.....“

”منسوب ہے..... خوش نہیں ہے..... بڑے ابو!“ عثمان کی بات پر سب کے چہروں پر حیرانی تھی، سوائے احسان عالم کے۔

انہوں نے خود بڑے بھائی کو سمجھایا تھا۔

”حارش نے زندگی میں صرف محرومیاں دیکھی ہیں۔ وہ تو تقدیر سے اس قدر نالاں ہے بھیا کہ اس نے اپنی ذات کے لیے کچھ مانگنا ہی چھوڑ دیا رب سے۔ اس کی آنکھوں کا پہلا خواب ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اس کا ہماری محبتوں پر سے بھی اعتماد جاتا رہے۔ اس نے خوشی اور محبت نہیں دیکھی آج اگر اس کے دل میں یہ خواہش ابھری ہے اور کسی وجہ سے پوری نہ ہو سکی تو اس کا تو اعتبار ہی ختم ہو جائے گا محبت سے، پلیز بھیا!“

”اور پھر بڑے ابو! اگر میں حرمین سے شادی کر بھی لوں تو نہ وہ خوش رہ پاوے گی نہ میں، کیونکہ میں سب جانتا ہوں، میرا دل یہ بات کبھی قبول نہیں کرے گا کہ.....“ عثمان نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

”اور حارش بالکل مجھے بھائی کی طرح عزیز ہے۔ میں اپنے بھائی کی خوشی برباد کر کے اپنا گھر نہیں بسا سکتا۔ آئی ایم سوری بڑے ابو!“

”میں ناں کہتی تھی فرمان کہ کوئی بات ہے ضرور جو حارش کو اندر ہی اندر کھا رہی ہے، کتنا خوش رہنے لگا تھا وہ..... اور اب..... اور حرمین کے چہرے کی بھی تو مسکان وہ نہیں رہی تھی، ہمارے بچے کھلتے رہے اور ہم انجان رہے، بس فرمان! میرے بچوں کی خوشی سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ہے، احسان جو کہہ رہا ہے ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ اماں جی نے گفتگو میں حصہ لیا۔

”بھیا! میں آپ کے پاس یہ ہی سوچ کر آیا ہوں کہ میرے لیے عثمان اور حارش میں کوئی فرق نہیں ہے۔ پلیز بھیا!! انہوں نے مان سے بڑے بھائی کو دیکھا جو سر جھکائے بیٹھے تھے۔ عالیہ بیگم بھی خاموش تھیں مگر یہ تو طے تھا ناں کہ ان کے نزدیک اپنے بچوں کی خوشی سب سے اہم تھی اور وہ اور اماں تو کافی پہلے یہ اندازہ لگا چکی تھیں کہ حرمین اپنی منگنی سے ناخوش ہے، اب بھی وہ صرف اپنے مجازی خدا کے فیصلے کی منتظر تھیں۔

”اگر آپ سب لوگ اسی بات پر خوش ہیں، میری بیٹی اس رشتے پر خوش ہے تو ٹھیک ہے، اماں! مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”شکریہ بھیا!“ احسان عالم تشکر آمیز لہجے میں بولے۔

”میری آپ سب لوگوں سے ایک گزارش اور ہے کہ حارش کو ابھی کچھ نہ بتائیں اس کے لیے یہ سر پرانز ہوگا پلیز.....“ عثمان بہت خوش تھا اور وہ چاہتا تھا کہ حارش عالم اس خوشی کو شدتوں سے محسوس کرے۔ سب نے حامی بھری اور باقی کے معاملات طے کرنے لگے۔



یکدم گھر میں اتنی رونق سی رہتی تھی جیسے کوئی تقریب ہو۔ ظاہر ہے وہ رہتا ہی اس قدر بے خبر تھا، سب سے بھی اور خود سے بھی۔

”آج کل گھر میں اور بابا کی طرف بہت ہلچل سی ہے، خیریت ہے بھابی.....؟“ وہ اب کوشش کرتا تھا کہ حنا کو گلہ شکوہ نہ ہو اس لیے آتے جاتے مخاطب کر لیتا تھا۔

”حارش بھائی! آپ اتنے بے خبر کیوں رہتے ہیں ہر چیز سے، ارے بھئی حرمین کا نکاح ہے مفتے کے بعد۔“

”جی.....“ پتہ نہیں حنا کو لگا تھا کہ یکدم حارش کے چہرے پر ایک گہرا طوفان سا گزرا تھا، یکدم اس نے سختی سے آنکھیں بند کر کے جیسے خود کو مضبوط کیا ہو۔

”حارش بھائی کیا ہوا.....؟“

”تھنگ۔“ ہزاروں کوششوں کے بعد بھی وہ مسکرا نہ سکا تھا، اور فوراً وہ وہاں سے ہٹ گیا مگر رات میں عثمان آ گیا۔

”ابھی میرے ساتھ چلو مجھے ڈریس لینا ہے نکاح کے لیے اور مجھے تمہاری ہیلپ چاہیے۔“

”یہ کس نے تمہیں غلط خبر دی ہے کہ کپڑے خریدنے کے معاملے میں میری چوائس اچھی ہے، ارے یار مجھے قطعی آئیڈیا نہیں ہے

اس طرح دو لمبے کے ڈریس خریدنے کا۔“

”مجھے کسی کی خبر کی قطعی کوئی ضرورت نہیں ہے، بس مجھے تیرے ساتھ جانا ہے، تیری پسند سے ڈریس لینا ہے۔ تو فوراً اٹھ جا۔“

”عثمان پلیز یار! میری چوائس بہت بُری ہے۔“

”کوئی پرواہ نہیں، مجھے منظور ہے۔ بس اب مزید ایک لفظ نہیں سننا۔“ اس نے زبردستی اسے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تھا۔ ناچار اسے جانا

پڑا۔ خاندان میں اتنی بڑی تقریب تھی۔ ظاہر ہے سب ہی خوش تھے اور وہ کسی کی خوشی کو اپنی وجہ سے خراب نہیں کرنا چاہتا تھا، سو جس طرح

عثمان چاہتا تھا، وہ اسی طرح کرتا تھا اور جانے عثمان کو کیا ہو گیا تھا کہ ہر کام میں اسے شامل کر رہا تھا۔ ادھر طلحہ کی خوشی بھی سمجھ سے بالاتر تھی۔

”تجھے کچھ زیادہ ہی خوشی ہے ناں اس نکاح کی۔“ وہ آخر برداشت نہ کر پایا۔ اس وقت حنا بھی ان کے ساتھ ہی موجود تھی۔

”آف کورس..... خوشی کا موقع ہے ناں تو خوش ہی ہونا چاہیے اور میرا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ میں کس طرح سے یہ سب

سیلبرٹ کروں۔“ ساری حقیقت جاننے کے بعد طلحہ کی خوشی ناقابل بیان تھی لیکن چونکہ ابھی حارش عالم کو علم نہیں تھا تو وہ کھل کے اظہار نہیں

کر سکتا تھا۔ حارش نے خاموش نظروں سے اسے دیکھا اور پھر اپنے کمرے کی جانب مڑ گیا۔

”حارش! تو آنکھیں بند کر کے کب تک زندگی گزارے گا یار۔ پلیز آنکھیں کھول کے حقیقت کا سامنا کر۔“

”تھینکس فار ایڈوائس۔“ اس نے روکھے لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گیا، طلحہ آواز لگا تارہ گیا۔

”آئی ڈونٹ نو..... شاید مجھے ہی لگتا ہے کہ حارش کے ساتھ کوئی نہ کوئی پرابلم ضرور ہے۔“

”ہاں حنا! تم کچھ بھی نہیں جانتیں اس کے بارے میں اس لیے لیکن پلیز دعا کرنا، یہ جو زندگی کی سب سے بڑی خوشی اس کی

زندگی میں آرہی ہے ناں، اس کے بعد اسے کوئی دکھ نہ ملے کبھی۔“

”آمین.....! مگر مجھے تو لگتا ہے کہ وہ اس پر بھی خوش نہیں ہیں۔“

”اسے اس بات کا علم ہو جائے تو شاید وہ پاگل ہو جائے خوشی سے۔“

”کیا مطلب.....؟“ طلحہ نے زبان دانتوں تلے دبائی۔

”اوں ہوں..... کچھ نہیں، بس تم نے یہ بات حارش کے سامنے نہیں کرنی، اوکے.....!“



”اللہ جانے تم لوگ کیا کر رہے ہو۔“ حنا نے سر تھام کر کہا اور بچن کی طرف چل دی۔



آج حرمین کا نکاح تھا۔ سب بابا کی طرف تھے۔ بس وہ کمرے میں بند تھا۔ طلحہ، کاشف کئی دفعہ اسے بلانے آئے تھے اور وہ ہر بار ٹال دیتا تھا، لیکن اس بار عثمان عالم اسے بلانے آیا تھا۔

”شرم کر حارش! وہاں سب تیرے منتظر ہیں اور تو یہاں بیٹھا جانے کس چیز کا سوگ منارہا ہے۔ اٹھ فنانٹ یہ لے کپڑا اور صرف دس منٹ میں تیار ہو جا۔“ عثمان نے اس دن لائے گئے کپڑے اس کے ہاتھ میں تھمائے تھے۔ وہ حیران نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

”عثمان! یہ ڈریس تو تم نے اپنے لیے خریدا تھا ناں.....!“

”جی نہیں، یہ ڈریس میں نے دولہے کے لیے خریدا تھا۔“

”ہاں..... وہ ہی تو..... پھر تم مجھے کیوں دے رہے ہو.....؟ خود پہناؤ اسے۔“ اس نے بہت حیرت سے اسے دیکھا۔ حارش کی آنکھوں میں اسے صاف الجھن نظر آ رہی تھی۔

”دولہا تم ہو تو میں کیسے پہن سکتا ہوں یہ ڈریس۔ اب فوراً تیار ہو جاؤ، وہاں نکاح کے لیے قاضی تک پہنچ گیا ہے، بس دولہا غائب ہے۔“

”عثمان! یہ کیا مذاق ہے.....؟“ اب ناگواری اتر آئی تھی لہجے میں۔ عثمان نے مسکراتے ہوئے اس کے دونوں کندھوں کو تھام کر اپنے سامنے کیا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

”مذاق تو تم نے کیا تھا اپنے ساتھ۔ لیکن اب سب کچھ صاف ہے۔ حرمین کا نکاح تم سے ہو رہا ہے۔ حارش! یہ حقیقت ہے۔ ہم سب تمہیں سر پر اتر دینا چاہتے تھے اس لیے تمہیں بتایا نہیں، اس کے لیے سوری..... بٹ ڈیئر برادر! آئندہ کبھی خود کو اس طرح تہمت سمجھنا، ہم سب تیرے ہیں، تیری خوشی ہمیں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ پھر تو نے کیسے سوچ لیا تھا ایڈیٹ ایک بار کہہ تو دیتا۔ تو جانتا ہے ناں پپا تم پر جان دیتے ہیں۔ جب سے تم ہمیں ملے ہو انہوں نے کبھی تم میں اور ہم میں فرق نہیں رکھا۔ حرمین نے ہمارے گھر کی بہو بننا تھا، شرط یہ تو نہیں تھی کہ صرف میرے حوالے سے۔“

”لیکن وہ تم سے منسوب تھی، تمہارے دل کو کیسے ٹھیس پہنچاتا میں۔“

”ہاں! وہ مجھ سے منسوب ضرور تھی حارش! مگر یہ صرف میرے بڑوں کی خواہش اور میری فرمانبرداری تھی۔ کوئی جذبات یا میرے من کے احساسات نہیں تھے اس رشتے سے۔ وہ تو شکر ہے میں نے بروقت تمام حقیقت جان لی ورنہ تمام عمر خود کو تمہارا مجرم تصور کرتا میں۔ حرمین صرف تمہاری ہے اور تم میرے بھائی ہو۔ اپنے بھائی کی خوشی مجھے ہر خوشی سے بڑھ کر عزیز ہے، سمجھے۔“ عثمان نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر پیار سے سمجھایا۔

”تھینک یو عثمان۔“ حارش اس کے گلے لگ گیا۔ سچ ہی تو کہتا تھا طلحہ آنکھیں کھول کے دیکھ تیرے چاروں طرف محبت ہی محبت ہے۔ بس تو خود نظریں چرا رہا تھا۔ ”ہاں! ہر سو چاہت ہی تو تھی، محبت ہی تو تھی، اس رب نے اسے نوازا تھا، جتنے دکھ اس نے بچپن میں جھیلے



تھے، اب سکھ ہی سکھ تھے۔ اس کے پاس ہر رشتہ تھا، ہر رشتے میں چاہت تھی اور ہر رشتہ اس کا اپنا تھا، سوتا نہیں تھا۔ خوشی سے اس کی آنکھوں کی نچی سطح بھیگی تھی۔

”آج نہیں..... آج صرف خوشی کا دن ہے حارش! اور مجھے اب کے بعد تیرے چہرے پر صرف مسکراہٹ چاہیے کیونکہ تو مسکراتا ہوا بہت خوبصورت لگتا ہے۔“ عثمان نے اس کی آنکھیں صاف کیں۔

”اچھا سن، اب تو فوراً تیار ہو جا کیونکہ بابا اور پپا دونوں تیرے منتظر ہیں۔“ اس نے جواباً صرف سر ہلایا تھا۔ اور اگلے پندرہ منٹ بعد وہ اس کے ساتھ جا رہا تھا۔ وہاں واقعی سب اس کے منتظر تھے۔ بابا نے اسے دیکھا تو فوراً بولے پڑے۔

”حارش! بچے کہاں تھے آپ.....؟“

”بابا..... وہ.....“

”بڑے ابو..... یہ میرے ساتھ تھا، سوری!“

”اوکے..... اب چلو.....“ انہوں نے خفگی سے دیکھا۔ احسان چاچو نے اسے دیکھتے ہی سینے سے بھینچ لیا تھا۔

”تو نے مجھے اپنا باپ نہیں ناں سمجھا، لیکن دیکھ لے میں نے تجھے ہمیشہ بیٹا ہی مانا ہے۔“ ان کے گلے پر وہ شرمندہ ہو گیا۔

”سوری چاچو! معاف کر دیں۔“

”اچھا بس۔“ انہوں نے اس کا سر تھپتھپایا۔ اس کے چہرے پر چھائی خوشی انہیں سرور کر رہی تھی۔ دادی نے بھی اسے خوب پیار کیا تھا اور چوما تھا۔

”حارش! تجھ سے بڑھ کر تو نہیں تھی ہمارے لیے تیری خواہش بچے۔ اتنے دن اندر ہی اندر گھلتا رہا۔ مجھ سے بھی نہیں کہا۔“ وہ

بس ہولے سے مسکرا دیا تھا۔ عثمان اسے اسٹیج پر لے آیا۔ اس نے تواب غور کیا تھا کہ بابا کا گھر کتنا خوبصورت لگ رہا تھا اور یہ اسٹیج جہاں وہ بیٹھا تھا کتنی محنت اور لگن سے سجایا تھا۔

”واؤ.....“ واقعی اندر سے انسان خوش ہو تو ہر چیز ہی خوبصورت ہو جاتی ہے۔ نکاح کی رسم شروع ہو گئی وہ بہت خوش تھا لیکن وہ

بار بار طلحہ کو خفگی بھری نظروں سے گھور رہا تھا جس کا مطلب صاف تھا کہ تو نے مجھے نہیں بتایا اب تیری خیر نہیں۔ طلحہ اسے اگنور کر رہا تھا۔ اپنی شامت جو صاف نظر آ رہی تھی۔ نکاح بخیر و خوبی ہو چکا تھا۔ سب نے اس کو گلے لگا کر مبارکباد دی تھی۔ طلحہ اسے مبارکباد دینے آیا۔

”ایسے ہوتے ہیں دوست.....؟ تو نے بھی مجھے نہیں بتایا۔ الٹا میری حالت سے مزے لیتا رہا۔“

”عثمان نے سب کو منع کیا تھا ورنہ تو تو جانتا ہے ناں تجھے کوئی بات بتائے بغیر میں رہ نہیں سکتا۔“

”میں تجھ سے شدید خفا ہوں، بس۔“

”اچھا چل مبارکباد تو لے لے۔ بعد میں خفا ہو جانا۔“ طلحہ نے ہانپیں پھیلائیں تو وہ ان میں سما گیا۔

”تجھے کیا پتہ حارش! اتنا تو میں اپنی شادی پر بھی خوش نہیں تھا جتنا آج خوش ہوں۔“

”کانگریجو لیشن حارش بھائی!“ حنا نے اسے وش کیا۔

”اینڈ آئی ایم سوری.....! کیونکہ میں جانتی تھی مگر پھر بھی آپ کو بتانہ سکی۔“ حنا نے معذرت کی۔ وہ محض مسکرا دیا۔ کچھ دیر بعد حرمین کو اس کے ساتھ بٹھا کر فوٹو سیشن ہوا۔ پھر وہ سارے کزنز مل کر حارش کے پیچھے لگ گئے۔

”ہم نے اتنی بڑی خوشی آپ کو دی، آپ ہمیں کیا دے رہے ہیں بگ بی.....؟“ حرمین نے کہا۔

”لیس..... حارش! آج تم پرنٹسٹ بنتی ہے۔“ عمیر نے کہا۔

”ویسے مجھے یقین نہیں آتا تم اتنا افلاطونی عشق کر سکتے ہو۔ تم تو بڑے گھنے نکلے۔“ اس کی بات پر سب ہنس دیئے تھے۔ حرمین کی ہنسی کی آواز پر اس نے پہلو میں بیٹھی سنی سنوری حرمین پر ایک نظر ڈالی۔

”تم بھی ہنس رہی ہو مجھ پر.....“

”سوری.....“ اس نے زبان دانتوں تلے دبائی۔

”اچھا، اچھا، ہمیں کیا کھلا رہے ہیں.....؟“ ایک بار پھر شور مچا۔

”جو تم کہو گے۔“ حارش نے کھلے دل سے آفر کی۔

”ڈنر..... کل کے لیے رکھ لیں، لیکن ابھی ہمیں آئس کریم کھلائیں۔“

”ابھی..... بارہ بج چکے ہیں، کل۔“

”نہیں..... آج اور ابھی۔“

”چل ناں یار! مزہ آئے گا۔“ عثمان نے کہا تو وہ منع نہ کر سکا۔

”اوکے..... چلو.....“

”او..... یا ہو۔“ عمیر اچھلا۔

”میں بابا اور دادی کو بتا دوں۔“ طلحہ نے کہا۔ حرمین اٹھ کر اندر جانے لگی۔

”تم نہیں چلو گی.....؟“

”اس حلیے میں.....؟ سوری۔“ اس نے بمشکل اتنے بھاری لینگے میں اپنا وجود سنبھال رکھا تھا۔

”چینیج کر لو۔“

”نہیں یار! تم لوگ جاؤ۔“ حرمین اسے اندر چھوڑ آئی اور وہ لوگ اجازت ملتے ہی گاڑیوں میں گھس گئے۔

”حارش! تمہاری زوجہ محترمہ بہت بد مزاج ہیں، اتنا کہا کہ چلو مگر آئی ہی نہیں۔“

”بابا، دادی کو برا لگتا ناں۔“ اس نے سائیڈ لی۔

”اوہو..... اتنی فیور، طلحہ بھیا پرمیشن لے آئے تھے۔“

”اچھا..... پھر ہم واپس جا کر میڈم کی خبر لے لیں گے بس..... خوش۔“ اس نے فریال کو دلا سہ دیا تو وہ ہنس دی۔

وہ لوگ خوب انجوائے کر کے گھر پہنچے تو دو بج چکے تھے مگر ان میں سے کسی کا بھی سونے کا ارادہ نہیں لگ رہا تھا۔ ساتھ بیٹھے تو گپ شپ میں چار بج گئے انہیں پتہ ہی نہ چلا۔

”ارے یار چار بج گئے ہیں، سونا نہیں ہے کیا.....؟“ کاشف نے گھڑی دیکھی۔

”کاشف! بورمت کرو، اتنا انجوائے کر رہے ہیں اور تم سونے کی بات کر رہے ہو۔“

”بابا سخت ناراض ہوں گے۔“

”نہیں ہوتے..... یار آج کا دن ہم سب کے لیے بہت خوشی کا دن ہے اور بابا کبھی بھی آج غصہ نہیں کریں گے۔ یوں بھی میں

دیکھ کر آئی ہوں، بابا سوچکے ہیں۔“

”تھینکس بٹ یار..... مجھے تو بھوک لگنا شروع ہو گئی ہے۔“ فریال نے پیٹ پکڑا۔

”اویار..... تم کتنا کھاتی ہو، مہمانوں کے ساتھ بھی یہ یوں کھانے میں لگی تھی جیسے آخری دفعہ کھا رہی ہے۔ یار کبڑا کرے گی اس

بندے کا جس کے گھر جائے گی۔“ کاشف نے اسے چڑایا اور وہ واقعی چڑ گئی۔

”جسٹ شٹ آپ۔“

”اللہ کرے یہ تمہارے گھر ہی آئے۔“ طلحہ نے بددعا دی۔

”طلحہ! تجھ سے ایسی امید نہیں تھی مجھے کہ اتنی خراب دعا دے گا تو۔“

”کیا.....؟“ اس سے پہلے کہ فریال ہنگامہ کھڑا کرتی، مابین بول پڑی۔

”فری! وہ تمہیں ستا رہے ہیں، میں تمہارے لیے کچھ لاتی ہوں۔“

”حرین ڈیز! اگر سب کے لیے اچھی سی چائے ہو جائے تو۔“ عثمان نے مسکرا کر کہا۔

”او کے..... ابھی لائی۔“ وہ اٹھ کر چکن میں چل دی۔

”حنایا! جاؤ حرین کی ہیلپ کرادو، وہ بے چاری رات کے اس پہر بھی اکیلے کام کر رہی ہے۔“ حنا سر ہلاتی اٹھ گئی۔ شاید یہ ہی

موقع اچھا تھا حرین سے بات کرنے کا۔ وہ اٹھ کے حنا کے پیچھے آ گیا۔ سب عمیر کے افیئر کے قصبے میں مگن تھے اس لیے کسی نے نوٹس نہیں

لیا۔ حرین اور حنا باتیں کر رہی تھیں جب وہ بھی آ گیا۔

”خیریت تھی ناں حارش بھائی۔“ وہ مسکرائی۔ کتنے ماہ بیت گئے تھے حنا کی شادی کو مگر اس نے آج پہلی بار حارش عالم کے لبوں پر

کھلتی مسکراہٹ اور آنکھوں میں خوشی کی چمک دیکھی تھی۔

”بھابی! آپ سے ایک فیور چاہیے۔“

”کیا.....؟“



”کیا میں حرمین سے کچھ دیر بات کر سکتا ہوں.....؟“

”اوہ ہو..... اوکے..... بس چائے بن گئی ہے، میں لے جاتی ہوں۔“ حرمین چائے سب کے لیے ڈال رہی تھی، حناڑے میں کپ وغیرہ رکھ کر باہر چلی گئی۔

”جلدی آ جائیے گا۔“

”اوکے۔“ حارش مسکرا دیا۔ پھر حرمین کی طرف متوجہ ہوا۔

”کیا کچن میں کھڑے ہو کر ہم پیار بھری باتیں کریں گے۔“ وہ حرمین کے قریب آ گیا۔

”حارش پلینز.....“ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”تم خوش ہونا.....؟“ اس کے سرخ ہوتے چہرے پر نظریں جمائے بولا تھا وہ۔ حرمین نے شکوہ بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

”اب بھی اعتبار نہیں ہے آپ کو.....؟“ وہ مسکرا دیا تھا۔

”شاید ہم انسان ہی ناشکرے ہیں۔ اس رب کی محبت سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ جتنا وہ اپنے بندوں

سے محبت کرتا ہے اور دیکھو! ہم دونوں ہی مایوس ہو چکے تھے تب اس نے ہمیں نوازا اور احساس دلایا کہ ہم غلط تھے جو اس کی رحمت سے مایوس ہو رہے تھے۔“

”ہاں.....! لیکن آپ تو خود ہی قدم موڑ گئے تھے۔ اگر کوشش کرتے تو بہت پہلے۔“ وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

”ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے حرمین! اور ہمارے لیے رب العزت نے یہ ہی وقت مقرر کیا تھا۔ آئی ایم پپی کہ آج میرے

چاروں طرف محبت ہے۔ ہر رشتہ ہے، میرے اندر کی تمام کثافت دھل گئی ہے۔ حرمین! اب ہر طرف صرف روشنی ہے، محبت کی روشنی، اور

مجھے محبت کرنا تم نے سکھائی ہے۔ تمہارے وجود نے پہلی بار مجھے پیار کے معنی بتائے ورنہ میں تو نفرتوں کے بے اعتباری کے اندھیروں میں

گم تھا۔ تم وہ روشنی کی پہلی کرن ہو جو میرے اندر میری روح میں پیار بن کر اتری۔ تھینک یو، تھینک یو سوچ۔“ اس نے حرمین کو نرمی سے

شانوں سے تمام کرا عتراف کیا تھا۔

”اور آپ کے اس جنون، اس دیوانگی نے کب مجھے اپنا اسیر کر لیا، مجھے خود علم نہ ہوا، بس اتنا پتہ تھا حارش کہ آپ کے چہرے پر

ہنسی دیکھنا میرے لیے دنیا کی ہر خوشی سے بڑھ کر تھا، اور صرف آپ کی مسکراہٹ کو تا عمر قائم رکھنے کی خواہش کی تھی میرے دل نے۔“

حرمین نے دھیرے سے کہا تھا۔ وہ جذباتی سا ہو گیا اور اسے خود سے بچھینچ لیا اور اس کے کشادہ سینے سے لگی حرمین عالم کے دل میں ایک سکون

ساترنا چلا گیا۔

..... ختم شد ..... ❁